مکاتیبِ خضر
محمد خالد اختر

مکاتیبِ خضر
عقابی
محمّد خالد اختر
سنگِ میل پبلی کیشنز ۰ لاہور

۱۹۸۹ء

نیاز احمد
سنگ میل پبلی کیشنز
کی طرف سے پہلی اشاعت

آر آر پرنٹرز نے چھاپا

قیمت -/۷۵ روپے
تعداد ایک ہزار

تعارف

یہ وہ مکاتیب ہیں جو محمد خالد اختر نے میرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے طرزِ خاص میں لکھے اور جو پہلے کچھ عرصہ کراچی کے ماہنامہ افکار میں "مکاتیبِ خضر" کے عنوان سے اور بعدازاں لاہور کے مجلّہ فنون میں "عودِ پاک" کے نام سے شائع ہوئے۔ خطوط کی صورت میں طنز و مزاح کا یہ نیا اور اچھوتا انداز اُردو ادب کے قارئین کو بہت اچھا لگا، اور مکاتیب کا یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا۔ اس مقبولیت کے پیشِ نظر محمد خالد اختر نے چند ایک مکاتیب اسی انداز کے ملک کے دوسرے ادبی رسالوں؛ سویرا، پاکستانی ادب اور معاصر کے لیے بھی لکھے، جو ان میں شائع ہو کر قارئین کی تفریحِ طبع کا باعث ہوئے۔ اب ان سب خطوط کو یکجا کر کے انہیں "مکاتیبِ خضر" کے عنوان سے — کہ اس سلسلے کا ابتدائی عنوان تھا — کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ مکاتیب تعداد میں اکاون ہیں، اور ان کا زمانہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک تقریباً ایک دہائی پر محیط ہے۔ جن اصحاب کے نام یہ مکاتیب لکھے گئے ان کا تعلق ادب، صحافت، سیاست، ثقافت، دین و مذہب اور تاریخ سے ہے۔ کچھ خطوط بعض گمنام اشخاص اور گھر کے ملازمین کے نام بھی لکھے گئے۔ انہی میں سے ایک خط مکتوب نگار کا اپنی بیٹی کے لیے بھی ہے۔ ان خطوط میں مکتوب الیہ کی شخصیت اور کردار کی مناسبت سے ایک خوش طبع چھیڑ چھاڑ بھی ہے، گلہ و شکوہ بھی ہے، طنز بھی ہے، استہزائے خفی بھی ہے اور عہد کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات پر رائے زنی بھی! اور ان ساری باتوں کی تہہ میں وہ "سچ" ہے جو محمد خالد اختر ہمیشہ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے شاید مناسب موقع یا

مناسب پیرایۂ اظہار نہیں پا رہا تھا۔ یہ پیرایۂ اظہار اُسے غالبؔ کے اس طرزِ مکتوب نگاری نے مہیا کیا جو اپنے بے ساختہ پن، شوخی اور ظرافت، اور مکتوب الیہ کے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو کے انداز کی وجہ سے اُردو ادب میں ایک کلاسیک کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ محمد خالد اختر نے غالبؔ کے اس اسلوب نامہ نگاری کا جس کامیابی سے تتبع کیا ہے وہ پیروڈی کے فن میں اس کی دستگاہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ امر نگاہ میں رکھیں کہ خالد کا اوڑھنا بچھونا ہمیشہ سے انگریزی ادب ہی رہا ہے۔

محمد خالد اختر کو جھوٹ، تصنّع، خود فریبی، نمود و نمائش اور بے رحمی اور سنگدلی سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔ اس معاملے میں اس کی قوت شامّہ اتنی تیز ہے کہ یہ اوصاف انسانوں میں جہاں کہیں بھی ہوں اور کتنے ہی پردوں میں لپٹے ہوئے ہوں وہ ان کا سراغ پا لیتا ہے اور انہیں اپنی طنز و مزاح کا نشانہ بناتا ہے۔ ان مکاتیب میں بھی اسے جہاں فریب اور ریاکاری سے واسطہ پڑا ہے اس کی طنز کی دھار زیادہ تیز ہو گئی ہے، اور اس طنز کا ہدف بننے والے غالباً کچھ تلملائے بھی ہیں۔ لیکن یہ بات ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیئے کہ ان مکاتیب میں محمد خالد اختر نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا اور (مثلاً چھوٹے لڑکے یعقوب اور بابے غلام محمد کے نام خطوط میں) اپنی گھریلو زندگی اور اپنے ذاتی کردار کے بارے میں ایسا کھرا، سچ، بولا ہے کہ جس کے اظہار کا یارا، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، ہم میں سے کسی کو بھی نہیں ہوگا۔ خالد جب اپنے بارے میں 'سارا سچ' بول سکتا ہے تو اسے یہ حق بھی ملنا چاہیئے کہ دوسروں کے بارے میں وہ جس بات کو 'سچ' سمجھتا ہے اس کا اظہار کر سکے۔

ان مکاتیب میں سے چند ایک مکتوب اس پائے کے ہیں کہ میں انہیں آج کے اُردو ادب میں شاہکار کا درجہ دوں گا، اور یہ ہر لحاظ سے ادبِ عالیہ میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔ ان میں سے بعض کا اگر خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جائے تو وہ ہیں: اپنی بیٹی سارہ بی بی

کے نام، نپولین بونا پارٹ کے نام، ایک چھوٹے لڑکے یعقوب کے نام اور بابے غلام محمد کے نام !

اس مجموعے میں شامل مکاتیب کا لکھنے والا ایک کردار محمد خالد خاں خضر ہے۔ ایک خبطی اور بھکڑ بڈھا، جو بقول خود چار پہر خفقان میں مبتلا رہتا ہے اور بن بلائے کہیں آتا جاتا نہیں۔ لیکن زندگی سے بظاہر بیزار ہونے کے باوجود موقع بموقع اپنے احباب اور کرم فرماؤں سے ہنڈوی بھجوانے کی فرمائش کرتا رہتا ہے۔ یہ زیادہ تر محمد خالد اختر خود ہی ہے، اپنی تمام شرارت اور سنکی پن (eccentricism) کے ساتھ! آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ ان مکاتیب میں اپنے دوستوں، آشناؤں اور حال و ماضی کی معروف شخصیتوں کے ساتھ کیا باتیں کرتا ہے اور انہیں کس طرح آئینہ دکھاتا ہے !

محمّد کاظم
۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

ترتیب

منشی ابنِ انشا لودھی کے نام ——

اے میاں صاحب، پرسوں ڈاک کے ہرکارے نے آکر تمہاری کتابوں کا رجسٹری پارسل دیا۔ اُسی وقت رسید اُس کو لکھ کر دے دی۔ کھول کر دیکھا تو دو کتابیں تمہاری اپنی تصنیف کی مرصّع، مصوّر اور ان کے ساتھ میں ایک مکتوب دستخطی تمہارے اپنے ہاتھ کا لکھا، عاجز خضر کے نام!
منشی صاحب، ایک مدت کے بعد تم نے مجھے یاد کیا۔ کیسے اور کیونکر؟ یہ میں نہیں جانتا بہرحال میری خبر لی اور اپنی شوخ نگاری اور سخن سرائی سے شادماں کیا —— جیتے رہو۔!

میں دروغ گو نہیں، مصلحتاً کبھی کبھار جھوٹ بول لیتا ہوں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ آوارہ گرد کی ڈائری تمہاری اسم بامسمیٰ ہے۔ اس طرزِ نگارش کو تم نے اپنے لئے وقف کر لیا ہے۔ لفظ لفظ میں چلبلاہٹ، شگفتگی۔ صاحب، اس خاص طرز میں اردو میں تمہارا ثانی نہیں سیاحت کے میدان میں تمہارا ہمسر اس ملک میں نہیں۔ بلادِ غربیہ و شرقیہ کا کونسا پایۂ تخت ہے جس کی خاک تم نے نہیں چھانی —— صاحب تم تو سچ مچ ابنِ بطوطہ ثانی ہو۔ مارکو پولو بھی تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئے تو اسے اپنے لئے علین سعادت متصوّر کرے۔ دوسری کتاب بھی خوب ہے۔ آرائش خوب تر۔ ماشاءاللہ چشمِ بددور اچھے خاصے کارٹون بنا لیتے ہو، غالباً وہ کسی اور نے بنائے ہیں۔ میرے حافظے کا یہ حال ہے کہ ایک ساعت پہلے کا وقوعہ یاد نہیں رہتا۔

یں نے جوابی خط بیرنگ تمہارے نام بھیج دیا ہے۔ بیرنگ بھیجنے سے خط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جاتا ہے۔ میرے بیس پیسے بچے۔ تم خط کو وصول کرو تو ہر کارہ چالیس پیسے تم سے لے گا۔ اس خاطر ڈاک والے بیرنگ خطوط تلف نہیں کرتے۔

میاں یہ، ہم نے کیا سُنا تم نے شادی کر لی۔ گویا مناکحت کا طوق گلے میں اور بیڑیاں پاؤں میں پہن لیں۔ کیوں جی، یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سُوجھی۔ مجھے تو کیا پتہ چلتا۔ سرِ راہے ایک دیرینہ عنایت فرما صاحبا لکھنوی سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بہ سبیلِ تذکرہ قصّہ تمہاری قید کا چھیڑا۔ قلق دلی ہوا۔ تم اب ہم سے گئے۔ احباب سے بچھڑے۔ صاحب اپنی جہاں گردی پر اب فاتحہ پڑھ لو۔ بلادِ جنوب و شمال اب تم جانے سے رہے۔

ہاں بھائی رہتے تو تم شہر آشوب کراچی میں ہو اور ایک مدت سے وہیں بستے ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہ آبا و اجداد تمہارے لدھیانے میں متوطن تھے جس کی رعایت سے تم لودھی کہلاتے ہو۔ مجھ سے شکایت بے جا کہ کراچی گیا اور تم سے ملے بغیر چلا آیا۔ گیا ضرور تھا۔ بندر روڈ پر تمہارے دفتر کی عمارت کے آگے سے چار پانچ بار گزرا۔ تمہاری ملاقات کا قصد کیا، پھر خود کو کہا: حضرا اپنی راہ پکڑو۔ توجیہ اس کی یہ ہے ایک مدت سے مردم بیزاری اور تنگ مزاجی کی کیفیت مجھ پر طاری ہے۔ دن میں چار پہر خفقان میں مبتلا رہتا ہوں۔ عوام الناس اور وہ اصحاب کہ مجھ سے ان کی روشناسی ہے اُن کا تو نام نہ لو، اپنے دیرینہ دوستوں اور کرم فرماؤں کی ملاقات سے کتراتا ہوں۔ صاحب، اس خفقانی گوشہ نشین کو معاف کر دیجئے گا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے ملنے کو کراچی ضرور آؤں گا۔ وہ بھی بُلا وا بمعہ ایک صدروپیہ کی ہنڈی کے آنے پر۔ میرا قاعدہ ہے کہ بن بلائے کہیں نہیں آتا جاتا۔

یہ تم نے نہیں لکھا کہ تمہارا علاقہ کس دربار سے ہے اور تنخواہ کس خزانے سے پلتے ہو۔ اس حویلی کے باہر کہ اس میں تمہارا کتب خانہ و دفتر ہے ایک موٹر گاڑی کھڑی دیکھی۔ اس پر یونیسکو کے الفاظ مرقوم تھے۔ یہ سرکار کون سے بلاد سے متعلق ہے؟ اور اس کا فرمانروا

کس شہر میں مقیم ہے۔ مناسب سمجھو تو لکھ بھیجو۔ بیرنگ خط نہ لکھئے گا۔ یہاں کے ہر کارے پہنچانے میں تساہل کرتے ہیں۔ فرمانروا کی خدمت میں عرضی بھیج کر طالع آزمائی کروں گا۔ دیکھو شاید کوئی صورت مقدمہ ظفر و کامرانی کی نکل آئے——!

چو این لائی کو کبھی خط لکھو تو اس میں میری طرف سے اُن کو دعا کہئے گا،

والسّلام!

فیض احمد فیضؔ کے نام——

اجی فیض احمد فیضؔ صاحب، قبولِ سلام و ارادت سے شرف بخشو۔ صاحب اردو نظم لکھنے کا کیا ڈھنگ تمہارے ہاتھ آیا ہے کہ ایک عالم اس کا مدحت سرا ہے۔ اس فن میں تم یکتا ہو۔ دست صبا، تمہاری کتاب سرمایۂ اردو زبان ہے۔ نظم میں انوکھی بندشیں اور طرزِ جدید غزل؛ سبحان اللہ۔ اس میں اور ہی زمزمہ!

نثر بھی تمہاری عرصہ ہوا نظر سے گزری۔ دل خوش ہوا۔ پڑی نہیں لکھتے!

یاد یوں پڑتا ہے کہ ایک بار کراچی میں تم سے باریاب ہوا۔ ایک عزیز میرے ہمراہ تھے کچھ باتیں اِدھر اُدھر کی ہوئیں، بے لطف، بے مزہ۔ ہم رخصت ہوئے تو تم نے دل ہی دل میں شکر کیا۔ بلائے بے درماں ٹلی۔

مدت ہوئی اخبار میں خبر تمہارے قلمروئے روس کو مراجعت کی دیکھی۔ اطلاع مزید یہ تھی کہ وہاں کے حاکمِ اکبر نے اعزازِ عظیم تمہیں بخشا اور بھرے دربار میں خلعتِ کامدانی، کلاہِ مطلّا و تمغۂ شہری سے سرفراز فرمایا۔ ایک لاکھ اشرفی اُس ملک کے دارالضرب میں ڈھلی، بالصد تلطّف ایک ہتھیلی میں کارپردازِ خاص کے ہاتھ مرحمت کی۔ حسد میری عادت نہیں۔ چھ برس کی عمر تھی کہ ایک اشرفی مَیں نے بھی بطور یادگار اپنے جدّ امجد کے پاس دیکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد خدا

جانے وہ اشرفی کہاں گئی۔ خوش ہوا کہ تم ارجمند اور کامران ہوئے۔ نان و نفقہ عمر بھر کا مقرر ہو گیا۔ خیال آیا تو یہ کہ آخر کو ایک لاکھ اشرفی ہے۔ خرچ کرو گے تو کیونکر۔ مدت مدید اس زرِ دولت کو کھانے میں لگے گی۔

یہاں تم نے اس اعزاز و اکرام کے ملنے کے بعد کچھ چپ سی سادھ لی۔ غمِ روزگار نے تمہیں عدیم الفرصت بنا ڈالا ہے یا کوئی اور بات ہے۔ جب لکھتے تھے خوب لکھتے تھے۔ اندازِ بیان کی خوبی میں بے نظیر تھے۔ میں کہتا ہوں ہائے وہ پہلا سا فیض!

میرا حال سنو ــــ عالمِ طفولیت اور دورِ شباب میں نظم اردو سے شوق کیا۔ بازار بھابھڑان دیارِ بہاولپور میں ایک منڈے سر کے لحیم شحیم بزرگ عباس علی آزردہ لکھنو کے رہنے والے کتابوں کی جلد بندی کرتے تھے۔ ساتھ ہی ذوقِ سخن رکھنے والوں کو علومِ بحور اور شاعری کی تدریس دیتے تھے۔ ایک گھنٹہ روز ہم لونڈوں کو پڑھاتے اور مہینہ کا نذرانہ فقط ایک روپیہ ہر شاگرد سے لیتے۔ نظم و غزل کی اصلاح مفت کر دیتے تھے۔ کیا ذہن رسا تھا اور کیا لوگ تھے۔ اللہ اللہ۔ فقیر حضرؔ اُن کے ہونہار شاگردوں میں سے تھا۔ ان کی شفقت و توجہ سے سال میں میرے دو دیوان مرتب ہو گئے۔ ابھی صورت انطباع کی نہ ہوئی تھی کہ والد کو ان اشغال کا علم ہوا۔ خشمگی میں مجھ پر برس پڑے اور سارا کلام میرے روبرو آگ میں جل کر تلف ہوا۔ میں نے توبہ کی۔ وہ دن اور آج کا دن، نظم تو کیسی، نظم معرا لکھنے سے دور بھاگا۔

سو کچھ حال تمہارا ہوا۔ اس واسطے کہ گو تمہاری زبان کی لطافت و شیرینی، نزاکتِ خیال و معنی اب بھی زنہار بہار دکھاتی ہے۔ حادثاتِ زمانہ نے فکر تمہاری کو دیگر نہج پر ڈال دیا۔ یا یوں کہو کہ تم گھائل ہوئے تساہل و بے فکری و فارغ البالی کے۔

کل ایک عزیز ملنے آئے۔ تمہارے بارے میں بتایا کہ ایک مہاجن نے فنونِ عالیہ کا ایک مکتب کراچی میں قائم کیا۔ تم اس مکتب میں معلمِ اعلی ہو۔ تنخواہ، بھتہ وغیرہ کیا دیتے ہیں، اور ماہانہ ہے یا یومیہ؟ ــــ خیر یہ منصب معلمی کا تو مناسبت رکھتا ہے حسنِ طبع سے۔ پر اُس عزیز

نے کہا تم متحرک تصویریں بھی بنانے لگے ہو۔ یہ تم کو کیا سوجھی! ایک مشورہ میرا گرہ باندھو۔ متحرک تصویریں بنائیں ناکندہ تراش، جاہل بے کار۔ تم ماشاء اللہ شریف زادے ہو پھر کچھ سر وقے اقلیمِ سخن ہو۔ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ عقل کے ناخن لو۔

گھر سے لڑکا بلانے آیا ہے۔ اب کھانا کھانے جاؤں گا۔ پیڈ کا ورق بھی دمِ آخریں پہ ہے۔ کل صبح اس خط کو ملفوف کر کے بیرنگ تمہارے پتہ پر ڈاک میں بھیجوں گا۔

ایک ہمدم میرے، نام محمد یونس الماس، کرنال کے رہنے والے جو خود کو پانوں کا شاہنشاہ کہتے ہیں میرے پاس بیٹھے ہیں۔ ان کا سلام مجرا قبول کیجئے گا۔

محمد طفیل مدیر نقوش کے نام

جناب میاں صاحب کو سلام پہنچے۔ کبھی تم کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ تمہارا ایک ہی خواہ اور طالبِ کرم یہ بندہ فقیر خضر بھی ہے۔ عرصہ دس سال کا ہوا مسودہ دستخطی ایک داستانِ پر ظرافت کا راقم نے لکھا، تمہیں ڈاک میں رجسٹری کرا کے بھیجا۔ اس امید سے کہ مرعوب خاطر ہوگا اور مجلہ نقوش میں مقام پا کر چرچا خاص و عام کا بنے گا۔ اس کی دستخطی رسید آئی۔ مسودے کو تو تم نے اپنے پاس رکھ چھوڑا۔ البتہ اپنے ایک معتمد بد طینت کے واسطے سے کہلا بھیجا کہ مسودے کی املا زبان کی اغلاط سے مملو ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے زیادہ نہیں تو آدھ درجن مراسلے وہ بھی ٹکٹ لگا کر تمہیں بھیجے اس مضمون کے کہ نہیں چھاپ سکتے تو ڈاک سے واپس بھیجو۔ غالباً ڈاک رجسٹری کے ٹکٹ بھی بھیجے تھے۔ تمہاری طرف سے ایک ہی چپ میں برہم ہوا۔ آخر کو ایک عزیز مشفق جلیل القدر سے عرضداری کی۔ اس نے ہمت کی مسودے کو تمہارے مطبع کے ردی کے ڈھیر میں بہزار وقت ڈھونڈ نکالا، اور اپنے رسالے میں اس کا انطباع کیا۔ کیوں میاں، یہ سلوک اہلِ سخن سے نہیں کیونکہ روا ہے۔ کس جرم کی پاداش میں یہ فقیر عتاب میں آیا۔

پھر حسب فرمائش تمہاری ایک مضمون داستان گوئے بے مثل حضرت پیر و مرشد سعادت حسن المتخلص منٹو کی مدحت میں نہایت عرق ریزی و ارادت مندی سے حیطۂ تحریر میں لایا۔ پارسل رجسٹری اس کا تمہارے نام بھیجا۔ تم نے بجائے خاطر داری اس ہیچمدان کے کرنے کے اُلٹا حکم لگایا۔ وہ یہ کہ تمہارے مجلّے کے معیارِ اعلیٰ سے فروتر ہے۔ یہاں تم کو کیا یاد ہوگا، اپنے رقعے میں یہ بھی تحریر کیا کہ "سچ بات اس مضمون کے بارے میں لکھوں تو تم ناراض ہو جاؤ گے۔" کیوں صاحب وہ سچ بات کیا تھی؟ اب تو کہو جناب تم کو اس فقیر سے کیا بیر ہے۔ وجہ عداوت کہو۔ میں تو تمہیں ادیبِ شہیر، مدیرِ دل پذیر کا رتبہ دیتا ہوں۔ طبع چشم بددور، موزوں، نادرست زبان نہیں لکھتے۔ فقرہ تراشی اور پھبتی کی صنعت گری میں رعایت اس بات کی پیش نظر رکھتے ہو کہ سخن ورانِ ولایت اس اظہارِ مدعا کے لئے کس انداز کو بروئے کار لائیں گے، ہر چند کہ ان کی کتب تم نہیں پڑھ سکتے۔ ڈھنگ اور تیور بات کہنے کا وہی ڈھونڈا ہے میری خو میں خوشامد نہیں، اردو زبان کے والٹیر اور سوفٹ تم ٹھہرے۔ ان مصنفینِ افرنگ سے نہیں کم تر جانوں تو دیدے پھوٹیں۔ خاکہ نگاری میں تمہارے کمال پر رشک آتا ہے۔ اپنے حسنِ طبع سے اپنے ہمدو جلیں کی سرشتِ بشری کا اس پیرائے میں انعکاس کرنا کہ وہ مجموعۂ خباثت بن جائیں کوئی تم سے سیکھے۔ تمہارے کاٹے کا منتر نہیں۔

تمہاری تصنیفات اس فقیر کے اکثر مطالعے میں رہتی ہیں۔ تم نے پارسل کبھی نہ بھیجا، بیشتر پیسے سے خرید کرنا پڑیں۔ عنوانات "سبحان اللہ"، "آپ"، "صاحب"، "جناب"، "حضرت" وغیرہم۔ گستاخی پر محمول نہ کرو تو آئندہ تصنیفات کے کچھ عنوان معروض کرتا ہوں۔ چاہے شرفِ قبولیت بخشو، چاہے رد کرو۔ "مولانا"، "قبلہ"، "فدوی"، "مابدولت"۔

ایک بار یہ گوشہ نشین آپ کے آستاں پہ حاضر ہو کر قدم بوس ہوا، اور آپ کے مجلّے کے ضخیم شماروں اور ان کے مندرجات کے محاسن پہ تہنیت پیش کی۔ میاں، اردو ادب تمہارے احسانات کا زیر بار ہے۔ تمہارے مجلّے کی چھپائی صاف ستھری اور دل نشیں اور اس کی جو بلی

کے سلسلے دل پذیر۔ ہر جا ان کا شہرہ ہے۔ سنتا ہوں پچھلی بار احاطہ پنجاب کی گورنری کے ایک سکتر اس جلسے کے صدر الصدور بنے اور سابق فرمانروائے مملکت پاکستان عالی جناب کمیدانِ اعظم محمد ایوب خان بہادر کے دستِ راست اور سکتر عالی مقدار قدرت اللہ صاحب المتخلص بہ شہاب بمع احبابِ سخن سنج: ابنِ انشا صاحب و جمیل الدین عالی، نواب ٹونک کے شریکِ بزم ہوئے۔ تم گویا نوشہ بنے۔ یوں بھی حسنِ صورت اور حسنِ سیرت تم میں جمع ہیں۔ بتاؤ جلسے کا بل کتنا آیا؟ کس نے ادا کیا۔ میں تمہارا قائل اور مدّاح ہوں کس انکسار و فروتنی سے سرپرستیٔ زبانِ اردو کا کلاہِ تفاخر اوڑھے ہو!

ایک داستان ایک لطیفہ گو افرنگ نژاد حضرت ووڈ ہاؤس کے ڈھنگ پر مرقوم۔ یہ ہیچمدان پارسل کے ذریعہ بھیجتا ہے۔ نقوش میں چھاپو تو بندہ کو گویا بے دام مول لے لو۔ معاوضہ کی ہنڈی کا طلب گار نہیں۔ دستخطی رسید بھجوانا نہ بھولئے گا۔

عبدالعزیز خالد کے نام —

بھائی، اس کلبۂ احزان میں تین شاعر ایسے ہوئے کہ میں نے ان کو سلام کیا۔ دو خلد بریں کو کوچ کر چکے۔ ایک ابھی جیتا ہے۔ وہ پہلے دو غالب اور اقبال تھے۔ تیسرے تم ہو۔ اللہ اللہ — اردو زبان کے شیرِ مصفّیٰ ہیں قندِ فارس و ہریرہ بلادِ عرب کو جس ارزانی سے تم نے گھولا ہے، سزاوارِ صد ستائش ہے۔ اساتذہ مسلم الثبوت میں اس نوعمری میں جگہ پانا تمہارا حصہ ہوا جن اشخاص کو بہرہ زبانِ عربی سے نہیں، ان کو البتہ مقصود تمہارے کلام کا شتابی سے فہم میں نہیں آتا۔ فقیر نے اپنے بچپنے میں مولوی کرامت اللہ صاحب سے قرآن مجید بمعہ ترجمہ کے پڑھا۔ تھوڑی شد بُد عربی زبان سے اس کے طفیل سے ہوئی۔ مگر جو کچھ سیکھا بوجہ عارضۂ نسیان اب حافظے میں نہیں۔ ہر چند کہ کلم کلام تمہارے کو سمجھ نہیں پاتا اس کی شوکتِ الفاظ اور فصاحتِ بیان کا

قائل ضرور ہوں۔کتابیں تمہاری اسی خاطر پسندیدہ جمہور ہوئیں اور تمہاری حیات جاودانی کی ضامن!

یاد ہوگا، سال گزشتہ تمہارے محکمہ کے دفتر میں تم سے ملاقات ہوئی۔ فقیر تب شہر آشوب کراچی میں ایک مہاجن آدم جی سے بتوسط انجمن مصنفین پانچ ہزار روپے کی ہنڈی اور ایک سند وصول کرنے پہنچا تھا۔ فقیر تمہاری صحبت میں شادو خرسند ہوا۔ اگلے دن تم سے ملنے کو تمہارے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ تمہاری شیریں گفتار کے وصف میں کیا کہوں۔ مزے آگئے دیکھ کر حیران ہوا کہ اس فقیر کے طور پر فرش پر بستر جمایا ہے۔ لکھنا پڑھنا وہیں ہوتا ہے کہیں آتے جاتے نہیں۔ سرہانے کی جانب لغت عربی و فارسی کی موٹی ضخیم کتب ایک صف میں آراستہ ہیں جاتے ہوئے ایک ڈھیر اپنی تصنیفات کا تم نے بندے کی خاطر جمع کے لئے مرحمت فرمایا ایک من وزنی ہوگا۔

صاحب، اس روانی اور قادر الکلامی سے چشمہ سخن سرابی جاری رہا تو عجب نہیں وقتِ وصال تلک کم و بیش ڈھائی سو دیوان پانچ پانچ سو صفحے کے مکمل کر جاؤ۔ عہد حاضر میں سکندر قلمروئے سخن وری و لغت دانی تم ہو۔ حضرت علامہ مجتہد الدہر سیدنا و مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یونہی تم کو اپنے سینے سے نہیں لگایا۔

یہ تو تھی ہنسی۔ بندہ سچ مچ تمہارے اوصافِ حمیدہ کا گرویدہ ہو کر لوٹا۔ جو کراچی سے آتا ہے یا نہیں آتا اُس کے رُوبرو تمہاری مزے کی صحبت، اور جودتِ تخیل اور حقیقی لگن کی تحسین کرتا ہوں۔ ہو بھی اس لائق۔ اساطیرِ یونان کی ہمکلامی بعینہٖ اہل یونان کی بولی ٹھولی میں دردو درماں کے مدارج کا اظہار، ہجر و وصال کی روئداد جگر پاش۔ رزم و بزم کی مرقع بیانی۔ شاہِ دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰ کی مدحتِ دل پذیر — سب کچھ تمہاری تصنیفات کا مضمون ہے۔ "تمثیل نگاری" کے خاتم تم ہو۔ صحبت تمہاری پھر کب میسّر آئے گی —؟

والسلام مع الاکرام

جوشؔ ملیح آبادی کے نام ـــــ

اجی شبیر حسن صاحب ملیح آباد کے رہنے والے ـ آداب، صد آداب!

ایک کرم فرما فقیر کے، پروفیسر ہیں حیدرآباد کراچی میں ـــ چوہدری ضیاء الحق ان کا نام، ضیاء برعایت اختصار اسم کے ہر کوئی ان کو کہتا ہے۔ شعر نہیں کہتے۔ انہوں نے ایک پارسل دو من وزنی میرے نام کا بھیجا، مع ایک خط کے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو پارسل لے کر آیا، اس غریب کا اس بار کے مارے سانس چڑھا ہوا تھا۔

پارسل کھولا ـــ اہاہا! ہمارے شبیر حسن کی تصنیف لطیف چھاپے کی موسوم بہ "یادوں کی برات" کہ ہر جگہ اس کا شہرہ ہے۔ اس میں سے نکلی ـــ ایک ہزار سے متجاوز صفحات، جلد بندھی ہوئی، لوح طلائی۔ کاغذ پرافشانی، غرضیکہ انطباع دل پذیر۔ مہتمم مطبع نے بے بہا روپیہ اس کے چھاپنے پہ صرف کیا ہوگا۔

یہ گزشتہ یک شنبہ، ۱۷ اکتوبر کی بات ہے آج ۲۴ اکتوبر اتوار کا دن ہے۔ ان سات روز میں کوئی کام نہیں کیا۔ ماسوا اس کے کہ اس برات بے مثل و فوق البھڑک، کی سیر کرتا ہوں حضور کی گل فشانی نثر اردو داستان طرازی نشاط انگیز پر عش عش کر اٹھا۔ سچ کہتا ہوں مصنفین داستان امیر حمزہ و طلسم ہوشربا کو مات دی۔ عجائبات کی حیرت افزائیوں سے آنکھیں فقیر کی کھلی کی کھلی ہیں اور بند نہیں ہوتیں۔ ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام تمہیں بعد مرنے کے اپنی نگرانی میں برزخ کے بابت تک چھوڑیں ـ!

کوچہ ہائے عشق و حسن میں آپ کی معرکہ آرائیوں کا احوال پڑھ کر اتنا ہنسا ہوں کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ بھائی فی الواقع اس معاملے میں تم ثانی نہیں رکھتے۔ کیوں حضرت، تم نے ستر برس کی عمر میں بست سالہ نوجوانوں میں اپنا نام لکھوایا، تو فقیر خضر کو بھی حق پہنچتا ہے کہ کچھ اوپر پچاس کی عمر میں خود کو نونہالگان میں شمار کرے۔ حیران ہوں کہ اس

پیرانہ سالی میں حرارتِ مزاج، اور ہوسِ عشقِ مجازی جوں کی توں قائم و دائم۔ یہ معجون سدا جوان رہنے کی کس طبابت خانے میں تیار ہوتی ہے کیونکر ملتی ہے اور بھاؤ کیا ہے؟ فقیر کو مطلع کیجئے گا۔ مدام کیفیتِ شباب پر تہنیت قبول ہو۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ خفا نہ ہو جایئے گا۔ وہ ناگ جو محل سرا کی منڈیر پر حائل تمہاری راہِ شوق میں ہوا تھا، اُس وقت جب تم تیرہ شب کو لونڈی کی رہنمائی میں وصالِ محبوب کی خاطر افتاں و خیزاں سوئے منزل رواں تھے، کالا ناگ تھا یا افعی کوڑیا نہ؟ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اس بدطینت نے ڈسنے سے اجتناب کیا۔ گویا مروّت دکھائی۔ اسے کیا خبر کہ احسانِ عظیم اس نے افسانہ و داستانِ اردو کی اصناف سے کیا۔ افواہ گرم ہے کہ تمہارا قصہ اس داستان کو بڑھانے اور ایک کتاب مزید اسی مضمون میں لکھنے کا ہے۔ مرحبا صاحب یوں کرو تو بندے کو اور عشاق پیشہ ور کو بے دام مول لو۔ تمہاری تصنیف قصرِ دل کشا قلمرو ئے اردو میں بن لائے گی اور حسن پرستگانِ زنان و اطفال کے لئے عطیۂ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ کا درجہ پائے گی۔ فرہاد و کا سانو وا کو لوگ گیدی جانیں گے اور ڈوبنے کے لئے چلو بھر پانی ان صاحبوں کو دکھائی نہ پڑے گا۔

حضرت! نثر کا رنگ جدا ہے نظم کا اور ڈھنگ! آپ نے خوب سررشتۂ آمیزش ان دو اصناف میں باندھا کہ تمہاری شاعری کی شوکت آرائی الفاظ و زمزمہ پردازی نثر تمہاری میں بھی جلوہ مارتی ہے۔ یعنی یوں کہو کہ ہر دو کا فرق مٹا۔ سبحان اللہ شاعری میں تم سا نغز گو آج موجود نہیں۔ سچ ہے تم یوسفِ کنعانِ معانی ہو۔ کیا کڑک ہے کیا چمک دمک! کہ خروشِ آبشار اس کے آگے ترشحِ بے صدا لگے، ضیغمِ دشت اسے سُن پائے تو شرمساری میں دھاڑنا اپنا موقوف کرے۔ ساتھ تمازت اس کی ایسی کہ جیسے دریائے آتش فشاں پھنکار ابھرے۔ کلام بس مور کا نمونہ ہے۔ نزولِ وحی ہے۔ ہر کوئی حیران ہوتا ہے کہ فنِ لغتِ پارسی و اردو پہ یہ دسترس کہاں سے تم نے حاصل کی۔ میرے یار کے سامنے الفاظ ہر قد و قامت کے رنگین پیراہنوں میں پرا جمائے کھڑے رہتے ہیں اور خود کو بڑھ بڑھ کر پیش کش کرتے ہیں کہ نظرِ انتخاب ہم پر پڑے، اور ہم کو ملا ئے

دُرہائے سخن میں پرویا جائے۔

ہاں صاحب، یہ نہیں سمجھ سکا کہ انقلابی تم خود کو کیونکر جانتے ہو، اور "شاعرِ انقلاب" ہونے کا کس لئے اشتہار دیا ہے کس برتے پر تتّا پانی۔ انقلاب کے داعیوں میں تو اوصاف پائی جاتی ہیں سخت کوشی و بے نوائی کی۔ تہی دستی اور جذبہ قربانی کی، وطن کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کی۔ آپ تو فلاں ابن فلاں، اہلِ تمول میں اٹھنے بیٹھنے والے اور ان کے عاشق صادق۔ سیج گل اور مسند حریر پر ساری عمر استراحت کی۔ جام و مینا کی محفل سدا جمائے رکھی۔ حبِ جاہ و تمکنت نے ایک جگہ اور ایک سلطنت میں نہ ٹکنے دیا۔ حضرت، فقیر کو موردِ عتاب نہ کیجئے گا۔ داعیان انقلاب تو اور ہی مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ ان کا خمیر مختلف! ان کی نمود جدا — نہ ان کو پاسِ ناموس و عزت، نہ تمنائے امرد پرستی۔ وہ تو دنیا پر لشت مارتے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے اور اصول پر مرنا اور مارنا جانتے ہیں۔ دن رات میں دو بار روٹی ملی، بہت خوش۔ دو روز میں ایک بار ملی، چہرے پر ملال نہیں۔ یہ واہمہ شاعرِ انقلاب ہونے کا دور کرو۔ تم انقلاب کا مطلب نہیں سمجھتے۔ اپنی تصنیف "یادوں کی برات" میں اپنے نواسے کے بلاد کراچی میں اہلِ حرفہ ہونے کا جو رونا رویا ہے اور جس طور سے شکوۂ ناقدردانیٔ زمانہ کرتے ہو، یہ باتیں انقلابیوں کو زیب نہیں دیتیں۔ ان کے نزدیک البتہ مرتبہ اس آدمی کا جو ہاتھ کے ہنر سے روٹی پیدا کرے، قابلِ صد تحسین و تشکر ہے، نہ کہ وجہ شکوہ و شیون —!

اور سنو، مانا کہ کبھی یوسفِ ثانی تھے، اور جس نازنین کی نگاہ تم پر پڑتی تھی وہ بمثل لوٹن کبوتر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی اور اختلاط یا ہمی کی متمنی و خواہاں۔ اگر مطلب اس کا یہ نہیں کہ تذکرہ اس امر کا اس تکرار سے کرتے جاؤ کہ شبہ ہذیان کا ہونے لگے۔ تسلیم کہ تم نے جب سے ہوش سنبھالا، عشق آشنا ہوئے لیکن اپنی ہوا و ہوس کے کارنامے بگھارنے سے کیا حاصل؟ معقول و اشراف لوگ یوں ڈینگ نہیں مارتے۔ جو تصنیف تمہاری پڑھے گا، اخذ مطالعہ سے یہ کرے گا کہ خود بینی و خود نمائی کے جل گداز عارضے میں ذہن تمہارا گرفتار ہے۔

پروفیسر علی عباس جلال پوری کہ فن فلسفہ و فن تاریخ میں اس کو درکِ خصوصی ہے اور سخن طرازی میں ید بیضا ہے۔ اگلے روز صحبتِ احباب میں کہنے لگے کہ شبیر حسن بے چارہ "نرگسیت" کا شکار ہے۔ "نرگسیت" دراصل فلاسفہ فرنگ کی اصطلاح "نارسسزم" کا ترجمہ بزبان اردو ہے اور اطلاق اس کا اس شخص پر کرتے ہیں جو والہ و شیدا آپ اپنی ذات کا ہو، اور سپنے اپنی دولت و اقبال و کمال کے شب و روز دیکھے۔ یہ عارضہ ذہنی ہے، شفا جس کی کسی حکیم کے پاس نہیں۔ خدا کی قدرت کہو "نرگسیت" میں مبتلا شخص وارداتِ واہمہ و تخیل کو حقیقت کے روپ میں دیکھتا ہے اور بالعموم حافظہ اس کا بوجہِ نسیان ماؤف ہوچکا ہوتا ہے۔

انطباع "یادوں کی برات" کی مجلد ثانی کا کب ہوگا؟ بسبیل ڈاک رجسٹری کر کے بھجوایئے گا۔ اور اس فقیر کو بے دام خریت لیجئے گا وہ ساہوکار صاحب نظر جس نے پہلی مجلد کو بصرف کثیر چھاپا ہے آپ بھلا اس کو اپنا مربیؔ و محسن کیوں نہ سمجھیں گے، اور کیوں نہ دوسری مجلد بھی اس کے نام معنون کریں گے۔ بامروت و فیاض طبع شخص ہے۔ کراچی کے کس محلے اور کون سے مکان میں رہتا ہے۔ پورا نام و پتہ مرقوم کریں۔ ہاں حضرت، وہ پدم بھوشن کا اعزاز مع خلعت جو عالی جناب جواہر لال نہرو آنجہانی نے آپ کو سرکار ہندوستان کی طرف سے عطا کیا تھا، ابھی تک آپ کے پاس ہے یا آپ اسے لوٹا آئے؟ قلمروئے پاکستان میں ورود پر کوئی خلعت آپ نے پائی؟—

یقین ہے کہ آپ اب تک مع الخیر دار الریاست اسلام آباد میں پہنچ چکے ہوں گے، اور بہ جمعیتِ خاطر روزے رکھ رہے ہوں گے۔ حاکمِ اعلیٰ جناب آغا محمد یحییٰ خاں صاحب کے دربار میں اگر باریابی کی کوشش بر آئے اور اُن سے ربطِ بے تکلفانہ کی نوبت آئے، تو ایک دو حرف فقیر خضر کی آشفتہ حالی کے بارے میں معروض کر دیجئے گا۔ ہنڈوی کے آنے کی راہ دیکھوں گا۔

خوب جانتا ہوں از روئے عتاب مجھ کو گالیاں دیتے ہوں گے۔

ہم اور آپ اور دیگر مدعیانِ علم و فضل پر اللہ تعالےٰ اپنی رحمت کریں!

ننگِ آفرینش ـ خضر سوختہ اختر

مرقومہ سہ شنبہ یکم رمضان ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء

شورش کاشمیری کے نام ——

شفیق مکرم حضرت شورش کاشمیری کی خدمت میں بعد ارسال کورنش و بندگی عرض کرتا ہوں کہ آپ کا انطباع کردہ رسالہ چٹان، ہر ہفتہ کے روزاخبار کا ایجنٹ پھینک جاتا ہے۔ میں منع نہیں کرتا، اس لئے کہ قلم قتلے اور مقالۂ ادارت، جو تم اس میں چھاپتے ہو باعثِ فرحت و نشاطِ روحانی ہوتے ہیں۔ کلام تمہارا خواہ نثر میں خواہ نظم میں ایزدی سروش ہے۔ بادِ سموم صحرا اور خوننابۂ ترشِ زہرآلود ہے۔ قلم سے چوکھی کھیلتے اور ہلاک کرتے ہو۔ صاحب، ہجوگوئی میں تم کو یدطولیٰ ہے۔ کمالِ سہل نگاری اس کو سمجھتا ہوں کہ جو نیا رسالہ تمہارا آتا ہے، چار پانچ ہجویں تمہاری مع ایک دو غزل کے اس میں تفننِ طبع کے لئے موجود۔ میرزا سودا عالمِ برزخ میں پڑھیں تو کانوں کو ہاتھ لگائیں اور تسلیم کریں کہ اس میدان میں تم ان سے آگے اور انہوں نے بھاڑ جھونکی۔ حضرت تم یوسفِ سخن ہو۔ مردانِ حُر کی صحبت میں کندن ہوئے اور مے خانہ و بازار و زندان سے نکل کر تختِ فرمانروائی قلمروِ سخن پر جلوہ افروز ہوئے۔

صاحب، میں آپ سے پوچھتا ہوں ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے اتنی پرخاش کیوں رکھتے ہو۔ ان کی کونسی ادا ناگوار خاطر ہوئی اور انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا، جو فنِ ہجو کے تیرِ تفنگ کا کلہم ان کو ہدف بنایا؟ وہ لاکھ بُرے سہی، سزاوارِ لعن و طعن سہی، مگر یہ طریقہ جو تم نے اختیار کیا ہے ان کو موقع بے موقع کوسنے دینے اور جلی کٹی سنانے کا، وضعِ شرافت ہرگز نہیں۔ سخنور و منصف طبع خاندانی لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اچھوں کا شیوہ ہے۔ بڑوں کو اچھا کہنا۔ میری اس بات پر برہم نہ ہو جیئے گا۔ یہ امر خیال میں رہے کہ کسی کی پگڑی اچھالنے سے اپنی پگڑی سنبھالنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ اہلِ فرنگ کا یہ مقولہ بڑا مشہور ہوا اُن اصحاب کو کہ کانچ کے حجروں میں رہتے ہیں دوسروں پر خشت باری سے احتراز لازم ہے، تو جیہہ بندہ اس کی کیا کرے۔ خود سمجھ لو!

اب کے "چٹان" میں سرنامے پر ملیح آباد کے شبیر حسن کی تصویرِ عکسی مع ایک نظم بعنوان "حیف اے ہندوستان" دیکھ کر آنکھیں ملتا رہا۔ باور کسی طور نہ آتا تھا کہ ہمارے شبیر حسن اس رسالے کے صفحۂ اول پر ٹھاٹھ باٹھ سے براجمان ہوئے اور ان کی نظم سرِعنوان تم نے چھاپی ہے حضرت یہ معجزۂ حیرت افزا ظہور میں آیا کیونکر؟ دلوں کی میل آناً فاناً دُھل کیسے گئی! کل تک تو شبیر حسن اور آغا شورش میں وہ سر پھٹول و مخاصمت تھی کہ الامان والحفیظ! تم شبیر حسن کو بندۂ فاسق و مقہور لکھتے تھے اور خوب اس کے لتے پر لتے اڑاتے تھے۔ اب وہی راندۂ درگاہ تمہارے دیدوں کا نور ہوا۔ اور تم نے اسے گلے سے لگایا۔ الحمد للہ۔ فرہاد اور شیریں ہم آغوش و مختلط ہوئے۔

بھئی دیکھتا ہوں رسالے کے صفحہ دوم پر انہی تمہارے ماضی کے عدو اور دشمن جان شبیر حسن کا ایک قصیدہ نثر میں تمہاری تصنیفِ گراں بہا "پس دیوارِ زنداں" کے بارے میں انطباع پذیر ہے۔ فرماتے ہیں۔ "شورش کا شمیری فولادی کردار ہے" اور مزید یہ کہ آپ کی خوبیوں نے اُن کو آپ کی طرف کھینچ لیا۔ سبحان اللہ العظیم! یہ مدحت پردازی کا عجوبہ پڑھا تو ماتھا فقیر حضر کا ٹھنکا، اور وجہ اجتماعِ اخوانِ باصفا سمجھ میں آئی۔ دعا کرتا ہوں کہ محبت کا نخلِ نورسیدہ پروان چڑھے اور برگ و بار لائے۔ دونوں صاحبوں کی آنکھ کا پانی نہ مرے!

یہ باتیں واسطے آپ کی سبکی اور تخفیف کے کرتا ہوں تو دیدے پھوٹیں۔ صاحب، میں خیال کرتا ہوں کہ انسان مجموعہ اضداد ہے۔ اوصافِ ضدین بشر کی سرشت میں جمع ہیں۔ فیاضی و خست، ہوسِ جاہ و مال اور بے نوائی پر توکل، سخت کوشی، و تعیش پسندی، خودنمائی و کسرنفسی، مردانگی و بزدلی! اہلِ انگلستان میں ایک داستان طراز سحر بیان رابرٹ لوئی اسٹیونسن ہو گزرا ہے۔ اس نے ایک قصۂ دل پذیر بعنوان ڈاکٹر جیکل و مسٹر ہائیڈ اس حضرتِ انسان کی جبلت کی دوئی کے مضمون میں تصنیف کیا، کہ صفحہ روزگار پر یادگار ہے۔ صاحب برا نہ مانیے گا، اگر یہ کہوں کہ آپ بھی اس قاعدہ فطری سے مستثنیٰ نہیں۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے اس قلمرو کے مسلمین نے خرقہ ریائی اپنی روح کے اوپر اوڑھ رکھا ہے۔ سچ بات نہ کہتے ہیں، نہ کسی اور کو کہنے دیتے ہیں۔ اس عارضے میں

ہم سب مبتلا۔ آپ کو مطعون کروں تو کیونکر! آخر فرد اس فرسودہ معاشرت کے ہی تو ہو!

اپنی روئداد میری زبانی سنو! اور کشفِ فقیر کی داد دو۔!

آپ کا حافظہ یاوری کرتا ہو تو آپ کو یاد ہو گا ایک بیرسٹر ولایت سے بازیافتہ ایک وقت میں اس قلمرو میں مدار المہام کے منصبِ اعلیٰ پہ فائز ہوئے۔ ممدوح نے جس طور سے پاپڑ بیلے اور جن طریقوں سے لاکھوں، جماعت کے چندے کے نام سے، ساہوکاروں اور اہلِ تمول سے بٹورے وہ سب جانتے ہیں۔ کھلنڈرا پن اور ذوقِ حسن ان کو پنگھوڑے سے ودیعت تھا۔ ولایت امریکہ میں خیر سگالی کے دورہ پر گئے۔ وہاں خوب کھُل کھیلے۔ دار الریاست واشنگٹن میں رہے غالباً چار دن، اور پھر جا پہنچے شہر پرستان ہالی وُڈ میں! وہاں تصویر ساز آلے سے نازنینانِ حور شمائل کے فوٹو لیتے پھرے۔ لوٹے تو آپ نے ان کو شیشے میں اتارا۔ سنا ہے کہ تم سے گاڑھی چھنتی تھی۔ ممدوح رات کو خلیفۃ المسلمین والمسلمات ہارون الرشید کے تقلّد۔ بس بھیس بدل کر رعیت کا حال معلوم کرنے کو کوچوں اور بازاروں میں تفریح کرتے۔ تم اور مقربین خاص ان کو راہ دکھلاتے۔ صلہ تم کو اس کا ملا معزولی سے چند ماہ پہلے ایک لائسنس کئی لاکھ کا برائے درآمدی چھاپہ خانہ تم کو مرحمت کیا۔ صاحب، چھپانے سے کیا حاصل۔ باری تعالےٰ نے رزق حلال کمانے سے ممانعت نہیں فرمائی۔ تم نے بھی حق دوستی پوری طرح ادا کیا۔ اب تک ان کی مدحت طرازی میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ یہ وصف تمہارا ہمیں بھاتا ہے کہ مربی ناشناس اور محسن کُش نہیں ہو! ——

دیکھئے پھر آپ ہمارے مجتہد العصر علامۃ الدہر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کے درپے ہوئے۔ ان کی اور ان کی جماعت کی ببیل ہجو د مضمون نثر وہ خبر لی کہ سب نے پناہ مانگی۔ تین برس بعد خیالات تمہارے بدلے اور تم نے الٹی زقند لگائی، یعنی کل کے معتوب و ملعون خاتم العلماء و فخر الفضلاء قرار پائے۔ دین اسلام کے محافظ و پاسباں بھی وہی اور امامِ زمانہ بھی وہی۔ واہ صاحب واہ! جب بموجب فتوے علمائے قلمروئے پاکستان و مصر کل مسلمین اس ریاست کے ماسوا فتویٰ نویساں و معدودے چند اخوانِ باصفا کے دائرہ اسلام سے خارج قرار پائے تو آپ نے بھی

اس کامیابی پر بغلیں بجائیں۔ فقیر سمجھ نہیں سکا کہ یہ کامیابی کیونکہ ہوئی۔ کفار کا غلبہ ریاست میں ہوا مقام رونے کا تھا، نہ کہ شادیانے خوشی کے بجانے کا۔ خوب شوکتِ اسلام بلادِ لاہور میں منایا۔ جمِ غفیر پیر و جواں کا مع اسپانِ نحیف و نزار و شترانِ بے مہار اکٹھا کیا اور شہر کو فتح کیا۔ یہ سوچتے ہو گئے کہ اس فوج ظفر موج کی یلغار کے بعد بھی باشندگانِ ریاست ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ووٹ کا فرِ اعظم ذو الفقار بھٹو کو دیئے۔ ہیہات! دینِ ختم المرسلین پر اجارۂ فقہا کا رد کیا۔ ایک قوالی کے بول عرض کرتا ہوں، ایک صاحب میجر ضمیر جعفری نے کہے ہیں۔

جلسوں میں بھر تقریر لیا　　نعروں میں بھر ہنگام لیا
خبروں میں بھر عنوان لیا　　پرچوں میں بھر پیغام لیا
جلوت میں کوئے عام لیا　　خلوت میں بروئے جام لیا
نوٹوں پہ خدا کو بھول گئے　　ووٹوں پہ خدا کا نام لیا
اسلام کا نام تو عام لیا　　اس نام سے کتنا کام لیا

ہاہاہا، اس نام سے کتنا کام لیا!

اس تلخ نوائی و ہرزہ سرائی کو معاف کرو۔ قبلہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ میں تمہاری تحریر کا عاشقِ صادق ہوں۔ گلفشانی جاری رہے۔ تمہارا ہم زباں ہو کے اذہان کے افلاس کا ماتم دار ہوں۔ تم چاہے جرمِ گستاخی پر کھال فقیر کی ادھیڑو، ہمارا تمہارا علاقۂ محبت ازلی بحیثیت انساں قائم و دائم ہے۔

ایک مجلد اپنی تصنیف نادرا فزا ”پس دیوارِ زنداں“، اگر بسبیل ڈاک مرحمت کیجئے گا تو فقیر کو بے دام مول لے لیجئے گا۔ جناب مجتہد العصر صاحب کی خدمت میں بندگی اور ان سے مجلس خلوت میں سفارش کر دیجئے گا کہ میں ان کا وظیفہ خوار، جاں نثار، تکیہ دار ہوں۔ کرم گستری سے ہاتھ نہ کھینچیں، اور عطیہ مقررہ کی ہنڈوی فوری طور پر ترسیل کریں۔ رسید آ جائے گی۔ ایک بات رہ گئی، وہ یہ کہ ایک قصیدہ آپ کی مدح میں چند روز کے اندر گزرانوں گا۔ چاہتا ہوں کہ سرورقِ رسالہ

پر میری تصویر کے تحت چھپے۔ امید دیرینہ بر آئے گی اور با اطمینان و فراغت جان جان آفریں کو حوالے کر سکوں گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

سہ شنبہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء

ڈاکٹر وزیر آغا کے نام

حکیم الادب، رئیس اعظم سرگودہا عالی جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی خدمت میں ہیچمدان خضر کا مجرا۔

صاحب، یہ جو آپ نے اپنا نام وزیر رکھا تو کیونکہ نام کی رعایت سے وزارت ادب کی آپ نے سنبھالی۔ ایک صاحب انگلستانِ عالی شان میں انشا پرداز بے مثل سیموئل جانسن ہو گزرے ہیں۔ آپ ہی کی طرح ڈاکٹر تھے اور حلقے والے سخنور و مصور و مرصع کار لندن کے ان کے معتقد اور مرید تھے، اور وہاں کی ایک سرائے 'ماٹر' میں ہر شام ان کی باتیں سننے کو ان کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ اُن سا شیریں مقال و خوش گفتار شخص اہل انگلستان میں اور کوئی نہیں ہوا۔ آپ میں اور اُن میں یہ فرق، وہ فربہ اندام، بلکہ فیل اندام، تم چھریرے اور بانکے۔ وہ البوالہول، کریہہ صورت اور بے ہنگم، تم طرح دار، نستعلیق۔ وہ انتہائی میلا، ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے والے، تم چشم بد دور جامہ زیب، خیاطانہ نفاست کے قائل۔ وہ بیئر کے کنستر کے کنستر لنڈھانے والے تم زاہد خشک اس نعمت کبریٰ سے محروم۔ یہ ڈاکٹر جانسن صاحب ماٹر میں اپنے اہلِ ارادت کے حلقے میں اجلاس فرماتے۔ تم لاہور میں بیٹھتے ہو گارڈینیا کے بھٹیار خانے میں۔ سرگودہا کی جائے اجتماع میں نہیں جانتا۔ یہ جاہل المجہول، ننگِ سخن محمد خالد خاں بھی دو تین بار گارڈینیا میں تمہاری مجلس میں شامل ہوا۔ چائے پُر تکلف سے تم نے اہلِ بیعت کی تواضع کی متوقع تھا کہ انبساط و اختلاط کی باتیں ہوں گی۔ وہاں شاعریِ جدید

کی ہیئت اور اس کی علامتوں کے بارے میں جامع مذاکرہ ہوا۔ تمہارے شاگردوں نے بڑھ بڑھ کر بحث اس مضمون میں کی۔ فیصلے کے لئے منہ تمہارا تکتے تھے۔ تمہارے جواہر گفتار سے بعد عقیدت و نیاز جھولی بھرتے تھے۔ فقیر نے معانی سمجھنے کی خاطر پورا سر مارا۔ خاک پلے نہ پڑا۔ بالآخر اپنی دانش و آگہی کا ماتم کیا اور وہاں سے بھاگا۔ تم کہتے ہوگے کس جاہل و کم فہم سے پالا پڑا۔ یہ کون شخص تھا۔ پیرو مرشد، میرا قصور نہیں، طالب فرومایہ ہوں، فن شاعری جدید اردو سے ناآشنائے محض، اشاریت و علامت میں ناتمام!

لو اب تفنن برطرف۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا کلام، کیا نظم کیا نثر، سر آنکھوں پر اس کو رکھتا ہوں۔ کچھ سمجھتا ہوں، کچھ نہیں سمجھتا۔ اور جب معانی کی تہہ پاتا ہوں تو اپنے بخت اور قسمت پر ناز کرتا ہوں۔ نثر میں تمہاری البتہ لطف اور ہے۔ گو بات خقفانہ گرہ دار کرتے ہو، اور دور کی کوڑی لاتے ہو! ہمارے ممدوح ڈاکٹر سیموئل جانسن بھی بزبان انگریزی طرز قدیم کی نگارش میں ید بیضا رکھتے تھے، گو ان کے مضمون و فسانہ میں فکر و اظہار کی صفائی ہے۔ فرصت ہو تو ان ڈاکٹر جانسن کی کتب، تاریخ راسیلس، اور لائیوز آف دی پوئٹس، و مجموعہ مضامین پڑھے گا اور میری سفارش کی داد دیجئے گا۔ بھائی بات وہ دل کو لگتی ہے جو فہم میں آئے۔ دور از کار نہ ہو۔ فن سخن کے زور آور میدان تحقیق میں بھسڈی ہوتے ہیں۔

بزبان اردو آپ نے جو چار پانچ رسالے چھاپے، وہ میری نظر سے گزرے۔ اسلوب ناقدانہ و فصیحانہ پر تہنیت قبول کیجیے گا۔ یہ جو انشائیے کا لفظ مطابق انگریزی زبان کے ایسے کے تم نے وضع کیا ہے۔ اختراع احسن ہے۔ صاحب اردو میں انشائیے کے موجد و بانی تم ہوئے۔ اپنے شاگردوں کو آپ نے اس راہ پر ڈالا ہے، اچھا کیا ہے۔ ہر چند کہ نصرانیوں کا ادب پڑھنا آج کل چند صاحبوں کے نزدیک مکروہ و موجب قباحت ہے، ان نونہالوں کو صلاح لیمب و ہیزلٹ و جانسن وغیرہم کا مطالعہ کرنے کی دو۔ انشائیہ لکھنے سے بیشتر یہ جاننا ضروری ہے کہ انشائیہ ہوتا کیا ہے؟

صاحب، ایک اور معروض فقیر حضرآپ کی حضور میں کرتا ہے۔ دستور اس قلمرو کے سخنور واہلِ قلم کا ہے کہ اپنے اپنے حلقے بنا رکھے ہیں۔ گویا چھوٹی چھوٹی ریاستیں مع تخت وعصا وسکّہ شاہی قائم کی ہیں۔ ایک حلقہ دوسرے حلقے کے منہ کو آتا ہے۔ اپنے حلقے والے کو بڑھا چڑھا کر غالب واقبال ومنٹو کا ثانی بنلاتے ہیں۔ گویا ایک سازش کر رکھی ہے، تحسین وستائش باہمی کی۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ عاشقان وکشتگانِ فن ان بکھیڑوں سے دور رہتے ہیں۔ بندہ پرور! — خفا نہ ہو جیئے گا۔ آپ کو اپنی نمود وشہرت مطلوب ہے تو اپنے معتقدین کو لگام ڈالئے۔ آخر کو، ہم کیوں آپ کے مددگاروں کے کہے کو وحی سمجھیں۔ فقیر نے اکثر دیکھا کہ آپ کے چھاپے کے ایک پرچے میں ہر صفحہ پر بالعدد دو تین سطور کے کسی ضمن میں آپ کا اسمِ گرامی مندرج ہوتا ہے۔ واہ صاحب، آپ کچھ سمجھیں، میری رائے میں یہ آپ پر ظلم ہے آپ کے دوست دشمن ہوئے!

یہاں کا حال خوب ہے۔ اس گرما میں اس خطہ میں آم کم اور مہنگا رہا۔ سنتا ہوں آپ کے باغات میں اس میوہ بہشت کی افراط ہے۔ دعوت دیجیئے گا، تو اگلی گرما آپ کی میزبانی کا لطف وہاں آکر اٹھاؤں گا۔ بن بلائے کہیں آتا جاتا نہیں۔

ظہور نظر سلام کہتے ہیں۔ ان کا مکان کہ بہاولپور میں ان کے نام الاٹ تھا، ڈھے گیا ہے۔ اس کی تعمیرِ نو میں لگے ہیں۔ خدا ہم سب کا انجام بخیر کرے۔ بظاہر صورت دیگر است!

مرقومہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء

انتظار حسین کے نام —

نورِ چشم، راحتِ جان انتظار حسین —!

پہلے ایک حکایت سنو! — غدرِ اولین سے پہلے کی بات ہے، چچا سام زاد الطافہم

کی سلطنت میں ایک شخص تھا، رپ دین ونکل۔یہ صاحب تھے بالکل نکھٹو، ایک ہی کاہل۔ لال بجھکڑ، تنگ ودو ئے روزگار سے گریزاں۔ گویا کہ ان کی طبع قلندرے فقیر خضر کی طرح آزاد تھی۔ سب ذمہ داریاں گھر کی اپنی زوجہ کے سر ڈال رکھی تھیں۔ خود قصبے کے بے کار لوگوں و فاترالعقل اصحاب کے ساتھ سارا دن گپ بازی کرتے اور ایک پہر دن ڈھلے سے وہاں کے میخانے میں جا ڈیرہ جماتے تھے۔ نیک سیرت، خوش طبع، دوستوں پر جان چھڑکنے والے۔ ہر ایک کی مدد کو تیار۔ اطفال ان کے شیدا اور عاشق یوں تھے کہ ان کے کھلونے ٹوٹتے تو یہ رپ دین ونکل ان کی مرمت و درستی کر دیتے۔ زوجہ میاں ونکل کی اسے نکما سمجھتی۔ صبح سے لے کر شام تک اسے لعن طعن کرتی رہتی لیکن بگڑے کہیں سنورتے ہیں۔ وہ اپنے کان لپیٹ، چپ چاپ اپنے کتے کو ہمراہی میں لئے بندوق کندھے پر ڈال خرگوش اور تیتر پکڑنے نکل جاتے۔ ایک دن وہ معمول سے کچھ دور نکل گئے کہ کسی نے پکارا: "رپ دین ونکل، اجی رپ دین ونکل"۔ کلہ کوہ سے پیچھے دیکھا تو آواز دینے والے کو ایک باریش مرد بزرگ کوتاہ قد پایا۔ پشت پر ایک پیپا لادے وہ متکلم ہوئے: "جی رپ، ذرا مدد کیجئے گا"۔ رپ دین ونکل تو ہر کسی کی مدد پر تیار ہو جاتے تھے انہوں نے پیپے کو اپنی پشت پر منتقل کیا اور کہنے لگے "کہاں جایئے گا"۔ "پیچھے پیچھے چلتے آؤ"۔۔۔ وہ پہنچے ایک وادی میں گھاس جہاں چھوٹی اور گھنی تھی۔ وہاں بہت سارا اور ویسے ہی باریش مردان بزرگ بیٹھے تھے۔ سر پہ کلاہِ سرخ۔ بے بٹنوں کے کوٹ اور چڑھے ہوئے پاجامے تن پر۔ پاؤں میں نقرئی بکسوئے لگے جوتے۔ وہ "نائن پنز" کھیلتے تھے۔ گویا اہلِ ولایت کا گلی ڈنڈا۔ رپ وین ونکل قریب آیا، تو انہوں نے کھیل روکا۔ اور ایک مرد بزرگ نے بڑے بڑے آب خوروں کو پیپے میں سے بھرا۔ اور رپ کو اشارہ کیا اس معنی کا کہ ان سب کو دے۔ مردان بزرگ خاموشی اور سنجیدگی سے آب خورے چڑھا پھر منہمک ہوئے اپنے کھیل میں۔ رپ وین ونکل نے جو ایک آب خورے سے چکھا تو اس سے نہ رہا گیا۔ پیاس بھی لگی تھی، سو بہت سے آب خورے خالی کر ڈالے۔ اب آنکھیں ہوئیں بوجھل مارے

نیلند سکے۔ ہوش و حواس قائم رکھنے کی سعیٔ بے حاصل کی۔ مگر پھر نیند نے غلبہ کر لیا نیچے لڑھکے، خراٹے لینے لگے ۔۔۔ آنکھ کھلی تو ایک برڑ کے نیچے اپنے کو پایا۔ مردانِ بزرگ اور ان کا فاٹن پن کا کھیل غائب! دن چڑھا ہوا تھا اور طائرانِ خوش الحان پیڑوں میں نغمہ ریز تھے۔ سوچا ساری رات سو یا رہا ہوں سکتے کو ڈھونڈا، وہ غائب۔ بندوق اوزار کہنہ و زنگ آلودہ بنی تھی۔ کوہ سے اترے۔ قصبے میں آئے وہاں لوگوں کے لباس بدلے ہوئے کسی کو جانتے نہیں۔ خود کو ملاحظہ کیا تو حیران ہوئے کہ ڈاڑھی گز بھر لمبی فرشِ زمین کو بوسہ دیتی ہے ۔ قصہ مختصر، بیس برس تک سوتے رہے اور جاگے تو ایسی دنیا میں کہ اس کی بوالعجبی اور نیرنگی میں کھو گئے! ۔۔۔

صاحب! یہ رِپ وین ونکل کی واردات ایک طرح تم پر بھی گزری کہ اس بیسویں صدی کے شہر لاہور میں حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ کے لکھنؤ میں جیتے ہو۔ نثر تمہاری پڑھو تو میر امن دہلوی اور رجب علی سرور کی نثر آمیختہ کا مزہ لو۔ لاہور نامے کو ملاحظہ کرو تو گویا قدیم لکھنؤ کے کوچوں، میلوں ٹھیلوں، عاشوروں اور مجالس کی سیر کرو۔ راوی پر سے چلو تو وہ گومتی لگے۔ روایت کا دامن مضبوطی سے تھامے ہو، بلکہ تحفظ تمدن قدیم کے علمبردار خشم ناک ہو۔ آپ کو کون سمجھائے کہ لاہور لکھنؤ نہیں ہے اور لکھنؤ بھی اب اس ڈھنگ سے نہیں بستا جس کا تم خیال کرتے ہو۔ جس ازمنہ وسطی کی تمہاری تحریر غماز ہے اور اب فلک کے دوران سے فکر و نظر انسانی میں تغیراتِ انقلاب آفریں رونما ہوئے۔ تمدن و معاشرت و تہذیب کچھ کی کچھ ہوئی۔ اب زمانہ کے طور دوسرے ہیں۔ نگارش نثر و نظم کے رنگ بدل گئے آہنگ بدلے، تصور عالم و کائنات و متقاضاتِ بشری اب اور ہیں۔ صدی گزشتہ میں شرق و غرب و شمال و جنوب میں دانایانِ رموز فطرت و پیغمبرانِ علم و آگہی نباضانِ ہیئت و نجوم ایسے ایسے پیدا ہوئے کہ کایا پلٹ اذہانِ مخلوقات اور ان کے احساسِ باطنی کی، ان کی دریافتوں سے ہوئی۔ ایک صاحبِ انگلستان، چارلس ڈارون صاحب نے، جو ماہر علم حیوانات و ذوات الثدی تھے۔ سررشتہ

انسان کا ماہی ولبوزنہ سے جوڑا اور نظریہ تخلیق و آفرینش کی دھجیاں بکھیر ہیں۔ ایک یہودی مفلوک الحال جرمن نژاد کارل مارکس نے سالوں کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک تصنیف بعنوان "ڈاس کیپٹال"، لکھی۔ وہ گویا معاشیات و تعلقاتِ مابین الطبقات الانسانیہ کا صحیفہ بنی۔ ریل و طیارہ و لاسلکی و ٹیلی ویژن و دیگر ایجادات ایسی ایسی دریافت ہوئیں کہ عقل حیرت میں ہے۔ دنیا ان کی بدولت سمٹ کر تنگ ہوئی اور آدمی مختلف ممالک و نسلوں کے ایک دوسرے کے قریب آئے ـــــ برخوردار سب کچھ ہوتا تم نے بھی دیکھا، پر تمہاری بلا سے۔ تم اب بھی رونا اس امر کا روتے ہو کہ کوچہ ہائے لاہور میں لوگ ٹکرم وا کے میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو نہیں جاتے۔ جا بجا شربت و آب مصفا کی سبیلیں لگا کر نہیں بیٹھتے گلی ڈنڈا نہیں کھیلتے۔ کنکوے نہیں اڑاتے۔ وغیرہ علی ہذا القیاس آپ عوام الناس کی رسوم و روایاتِ کہنہ سے روگردانی پر برہم و نالاں ہوئے۔ کس لئے میاں؟ فقیر حضر پوچھتا ہے یہ تمدن آباء و اجداد۔ یہ روایت بزرگان کیونکر اتنے متبرک اور واجب التعظیم تمہارے خیال میں ٹھہرے کہ ان کے بدلنے سے آسمان ڈھے جائے گا۔ کیا یہ پتھر پہ لکیر ہے کہ مٹ نہیں سکتی۔ دلی و لکھنوئے قدیم کے بانکے۔ ترچھی دو پلی ٹوپی پہنے، بے شکن ململ کے انگرکھے زیب تن کئے بیش قبض لگائے مرنے مارنے کو تیار اب دکھائی نہیں پڑتے تو کیوں کفِ افسوس ملو۔ آہ و بکا کرو۔ ملاحیاں و صلواتیں ایک زمانے کو دو!ـــ

مزے کے آدمی ہیں ہمارے انتظار حسین۔ حکایت کوئی ایسی نہیں لکھتے جس میں استبعاد و استعجاب نہ پایا جائے۔ رنگ حکایاتِ بید پائے کا نہ ہو۔ فنِ پھبتی و چگی بازی میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل ہے جس بدبخت کا اپنے اخبار کے ورق میں مذکور کیا، اس کو نیشِ عقرب سے ڈسا۔ ان کے وار سے نہ زندوں کو مفر ہے نہ مرے ہوؤں کو۔

لطیفہ ۵:۔ ایک داستان گوئے سحر انگیز اہل انگلستان میں سومرسٹ ماہم نام کے ہو گزرے ہیں۔ فنِ قصہ نویسی میں استاذ مسلم الثبوت تھے اور سکہ ان کا سب ذی ہوش سخنور مانتے

ہیں۔ چار پانچ برس ان کے انتقال کو ہوئے۔ فنِ قصّہ نویسی کے مذکور میں تم اپنے ورق میں ممدوح کے بارے میں فرماتے ہو۔" انگلستان میں ایک صاحب سومرسٹ مام نامی بھی تھے جو بیسویں صدی میں افسانے انیسویں صدی کے لکھا کرتے تھے"۔ فقیر خضر نے پڑھا تو باور نہ کیا۔ دوبارہ پڑھا۔ ایک فقرہ چست ایسا کیا کہ سومرسٹ مام کی ساری زندگی کی کاوشِ فن ملیامیٹ ہوئی۔ واہ بھائی صاحب واہ، مام خاک ہوئے لیکن برخوردار تم نے یہ خیال بھی کیا کہ مام تو پھر انیسویں صدی کی کہانیاں لکھتا تھا، تم حکایات کہتے ہو سولھویں اور سترھویں صدی کی اور خوشہ چین میر امن و رجب علی سرور کے اسلوب کے ہو۔ ایک کہانی مام سی لکھ دینے تو میں حضور میں مجرا کرتا۔ اہلِ فرانس کے مصنّفین کاموں اور سارتر کا مذکور زنہار کر دیتے ہو، کس شانِ استادانہ و بزرگانہ سے کب جیسے تم ان کے ہاں جاؤ تو وہ دہلیز دد سے بڑھ کر رسم استقبال کے لیے آئیں۔ ہاں صاحب یہ لوگ کس باغ کی مولی ہیں۔ تمہارے آفتابِ دوپہر کے آگے مٹی کے جلتے ہوئے دیئے ہیں۔ فقیر خضر البتہ تمہیں حکایت نویسِ بے نظیر گردانتا ہے اور خواہش اندرونِ دل رکھتا ہے تمہارے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی۔ تم سے اس فن کے رموز سیکھنے کے لیے اس واسطے کہ تم بلا کلام اس دور کے میر امن ہو۔

سنو، ایک ورق اخبار، مشرق، میں تم نے ایک صاحب کے متعلق خدا جانے کیا فقرہ چست کیا کہ وہ خفا ہو گئے۔ وہ بھی تھے اخبار والے۔ بھڑکے اور انہوں نے بھی جواباً اخبار میں خبر تمہاری لے ڈالی۔ بلکہ خیریتِ مزاج اچھی طرح پوچھی۔ یعنی چند بھونڈی مغلظات سے عبارت کو آراستہ کیا۔ تم اس پر تلملائے اور اپنے ورق میں ان کو خطاب کیا: "جو مکھی بے شک لڑو، مگر شائستگی سے دائرہ تہذیب میں رہ کر کے ——— ہاں صاحب نورِ چشم، تم واقع میں اپنا لوہا منوانے میں شائستگی اور آدابِ وضعداری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہو۔ خوب ہے صاحب! ——— ناوک تمہارے زہرِ قاتل میں بجھے ہوتے ہیں جس کو لگے، وہ پانی کو ترسا اور ڈھیر ہوا۔

فقیر خضر نے ایک رسالہ کسی زمانہ میں بعنوان "کھویا ہوا اُفق"، لکھا۔ اس کے بارے میں

جو آپ نے اپنے ورق اخبار میں رائے ظاہر کی وہ بھی بالکل بجا۔ سو فیصد صائب۔ تہنیت بھیجتا ہوں۔ اسی طریق کی تحسین کا ہی امیدوار تھا۔ باتیں کرنے کو آپ سے بہت جی چاہتا ہے۔ لیکن کیا کروں کاغذ نیٹڑ گیا ہے۔ ہاں جاتے جاتے کبوتروں کا نسخہ کہ ایک کتاب قدیم میں دیکھا درج کرتا ہوں۔ لقّے کبوتروں پر البتہ نہ آزمایئے گا، باقی سب قسم کے کبوتروں کے لئے مجرّب ہے۔

پتہ تمہارا معلوم نہیں۔ مخمصے میں تھا کہ کس کی معرفت یہ خط لکھوں۔ توکلت علی اللہ۔ اخبار "مشرق" کے گورنر بہادر کی معرفت بھیجتا ہوں۔ تمہیں مل گیا تو زہے نصیب!

فخر الشعراء ناصر علی خاں المتخلص ناصر کاظمی کو آپ کا جلیس مشاہدہ کرتے ہوئے آپ کی جناب میں بھی کورنش بجالاتا ہوں۔ قاضی القضاۃ پنشن یافتہ صاحبِ ارمغان خاب ایس اے رحمان مصنف "سفر"، کو میرا اسلام پہنچا دیجئے گا۔ اور یہ عرض کر دیجیے گا کہ مابعد "سفر" کے کوئی مجموعہ کلام استاد نظر افروز نہ ہوا۔

مرقومہ ۵ راکتوبر ۱۹۶۹ء

سید کاظم شاہ (کراچی) کے نام—

جناب رفعت مآب مولائی و مرشدی!

یکے بعد دیگرے آپ کے عطوفت نامے پہنچے۔ ایک ماہ کے عرصے سے تمہیں لکھنے کا قصد کرتا ہوں۔ خانہ کا ہلی خراب ا۔ آج لکھوں، کل لکھوں، اب کون لکھے۔ بھاڑ میں جائے کراچی کا کاظم شاہ۔ صبح ہوئی، خضر لویں نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اب لکھ ڈالو، کل صبح کو لکھوں گا،— ایک مہینہ گزرا۔ کل ہرکارے نے تمہارا خط دیا۔ ساتھ میں تمہارا ٹیلیفون کراچی سے آیا، کہ جواب نہ دیا تو خود بذریعہ ریل و طیارہ پہنچتے ہو۔ چشم ما روشن دل ماشاد۔ اطلاع بروقت اوقاتِ آمد

کی ضرورت سمجھئے گا، تاکہ بندہ باقاعدہ رسم خوش آمدید کا اہتمام کر رکھے۔ دو تین مطرب، بینڈ والے، کہ شادی بیاہ میں تاشہ و نفیری بجاتے ہیں، اسی محلے میں رہتے ہیں۔ ان سے فقیر کی علیک سلیک ہے۔ ورودِ مسعود بروز جمعہ نہ ہو۔ اس دن دونوں سوداگرانِ شراب لو! ان اور منیجر جی اپنی دکانیں بند رکھتے ہیں۔ ان کے گھر کا پتہ فقیر کو معلوم نہیں۔

اب صبح کا وقت ہے۔ دن سنیچر کا، رمضان المبارک کی تیئس تاریخ اور نومبر کی تیرہ۔ روزہ رکھنے کے لئے اٹھا۔ چائے چولھے پر بنائی۔ سوچا کاظم کو لکھو۔ چنانچہ دوات مونڈھے پر رکھ، تکیے سے ٹیک لگا، لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ مراد اس سے امتناع تمہاری آمد کا نہیں۔ تمہیں اس ناسازیٔ طبع کی حالت میں رنج سفر اٹھانے کی نوبت کیوں آنے دوں۔ دفتر جاتے ہی یہ خط چپڑاسی کے ہاتھ بیرنگ ڈاک میں ڈالنے کے لئے بھجوادوں گا۔ یہ اس کی منشا کہ ڈالے، نہ ڈالے۔ پہنچے، نہ پہنچے۔ وہ اہتمام جو میرے دوسرے مولائی مولوی محمد کاظم لاہوری ڈاک کے معاملے میں عمل میں لاتے ہیں، یعنی خطوں کو خود ٹکٹ لگانا اور صندوقچہ خطوط میں بنفس نفیس ڈال کر آنا، مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ صاحب، لاپرواہ مجھ کو کہو، تساہل پسند کہو، میری سرشت میں یہ شے نہیں۔ نیکی کر کے دریا میں ڈالنا میرا مسلک حیات ہے۔

حضور کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک موجب تشویش و ملال ہوئی۔ لیکن چونکہ کیفیت مستقل و دائمی ہے، اس لئے خطرہ فی الحال نہیں۔ ہم سب اس دنیا کے رہنے والے پابرکاب ہیں۔ اور میں تم سے آگے جاؤں گا۔ تاریخ مراجعت الی العدم کسی منجّم و ستارہ شناس سے پوچھ کر مطلع کروں گا۔ فرماتے ہو، "بھائی، اختلاج القلب کے دورے پر دورے پڑتے ہیں۔ صاحب فراش ہوں"۔ یہ خوب ناٹک تم نے رچایا ہے، اپنے رفیقانِ سفر کو پریشان کرتے اور ان کو کلپانے کا۔ اس طریق سے منت کشِ ترحّم و ہمدردی اخوان ہوتے ہو۔ دیکھو یہ ٹھیک نہیں۔ پھر عارضہ قلب تم کو نہ ہوگا تو کس کو ہوگا۔ برسرِ راہ لوگوں کو مرتے اور مارتے ہو۔ جس دکان یا موٹر گاڑی میں رُخِ حسین کو دیکھا، وہیں سینے پر ہاتھ رکھا اور اویلا مچایا۔ آؤ بچاؤ کشتنی و سوختنی ہوا۔ ماشاء اللہ

پینتالیس، پچاس برس کی عمر میں ولولۂ شباب اور امنگیں جوانی کی رکھتے ہو۔ فرما دے ٹھکرا دیتے ہو۔ ایک اس فقیر کو دیکھو۔ چند سال ہی تم سے عمر میں بڑا ہوں گا۔ کوچہ عشق مجازی کو کبھی کا چھوڑ چکا۔ بلکہ یوں کہو کہ اس کی زنہار سیر نہ کی۔ قوت غضبی و شہوی سے محروم رہا۔ ایک نصیحت بوجہ قطب الاقطاب ہونے کے تمہیں دوں۔ کیوں عمر رفتہ کو آواز دیتے ہو اور اختلاج القلب کا شکار ہوتے ہو۔ اس عمر میں جس میں اب ہم اور تم ہیں، یاد اللہ و خیالِ عاقبت میں استغراق مناسب ہے۔ تمنائے اعادہ شباب خیالِ خام ہے: حدِ امکاں سے باہر۔ ہر چند کہ بڑے بڑے اشتہاراتِ دیوار و اخبار مقامی اطبائے جرمن و چین ہفت روز میں قوائے مضمحل میں حیاتِ نو دوڑاتے ہیں اور پیرِ صد سالہ کو جوان تو نگر بست سال کا بنا تے ہیں، سب بکواس، خرافاتِ محض۔ ہمارے ملیح آباد کے شبیر حسن صاحب نے جو اپنی داستان ہائے عاشقی و مردی کا مجموعہ 'یادوں کی برات'، کے نام سے چھاپا ہے، اپنی جگ ہنسائی کرائی ہے۔ تخیل و ایجاد ان کی البتہ حیرت میں ڈالتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کتاب لکھ کر صاحب "مائی لائف اینڈ لوز" فرینک ہیرس کا ہم پلہ ہوا۔ ننگ آفرینش کہتا ہے کہ شبیر حسن نے تحمیق کرائی، کئے کرائے پر خاک ڈالی۔

فون پر بھی کہہ چکا ہوں، اب بہ تاکید مطلع کرتا ہوں کہ منشی صہبا لکھنوی کا پرچہ "افکار" بسبیل پارسل رجسٹری میرے پہلے پتے پر موصول ہوا۔ اپنے مکاتیب جن کے مکتوب الیہ چند مشاہیر پاکستان و خوبانِ روزگار ہیں۔ اس میں انطباع ہوئے دیکھے۔ خوش ہوا کہ رشحاتِ قلم فقیر کے خاص و عام کو پہنچے۔ اگرچہ شہرت و ناموری اپنی مقصود بالذات نہیں، اقراری ہوں کہ اپنے لکھے کو چھاپے میں پاکر مسرتِ بے اندازے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں۔ منشی صاحب کا صد تشکر! مگر سہہاتا یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا کیا گاڑ دیتے ہیں، مسخ کر دیتے ہیں۔ ایک دو سطور میں الفاظ آگے پیچھے اور مطلب غت ربود۔ میرا محررہ، ہنڈوی، ہنڈی، کتابت ہوا۔ در آنحالیکہ ہنڈی بغیر واؤ کے اصلاً غلط ٹکسال باہر۔ لوگ سہو کتابت کو اساتذہ کے سر ڈالتے ہیں۔ منشی صاحب کو ہدایت کر دیں آئندہ پرچے میں بوسیلہ اشتہار ان اغلاط کی تصحیح چھاپیں، معذرت نامے کی

ضرورت نہیں۔

لو۔ ہمارے خواجہ معین الدین تمثیل نگارِ اردو، صاحبِ لال قلعہ سے لالو کھیت تک، اور، مرزا غالب بندر روڈ پر، بھی مغفور اور جنتی ہوئے۔ میں ان سے زندگی میں نہ ملا۔ ہمکلامی ان سے نہ کی۔ اس کا ملال ہے۔ ٹیلی ویژن سے صورت شناسی تھی۔ اخبار سے معلوم ہوا حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے اور بوقتِ انتقال عمر صرف پچاس برس تھی۔ ہائے ہائے، جب کوئی ہم سخن، صاحبِ کمال یوں بے سرو سامانی میں اس سرائے سے جاتا ہے، درد کی ٹیس سینے میں اٹھتی ہے۔ اپنے انجام کو سوچتا ہوں۔ خضر تو بھی اپنا بستر گول کر رکھ، کس کس کو روئیے۔ اخبار میں خبر ان کے انتقال کی آئی تو دو حرفی۔ گویا واقعہ معمولی ہے۔ جائے عبرت برائے سخن گزاروں کے ہے۔ تم ان کے اعزا کے ہاں جانا، اور اپنی اور میری طرف سے فاتحہ پڑھ دینا۔

میرا حال سنو۔ مجھے زعم تھا اس بات کا کہ مرنے سے مجھ کو خوف نہیں آتا۔ اب بست دن ہوئے سینے کی زیریں پسلی کے اوپر گٹھلی سی ابھری دیکھی۔ واہمہ سرطان دماغ پر مسلط ہوا۔ سچ بات ہے کہ زہرہ آب ہوا۔ اس دن سے سگرٹ پر سگرٹ بے تحاشا پیتا ہوں کہ نمودِ سرطان بسرعت ہو۔ جو ہونا ہے ہو۔ جلد قصر و حور و شرابِ طہور ملیں۔ یہاں کا پارسی منچر جی ڈھنجر جی ایک بوتل لندن بیئر کی آٹھ روپے میں فروخت کرتا ہے جو اب مجھ کو بوجہ عوارض و آلامِ بدنی دلچسپی نہیں۔ آپ اس خبرِ منحوس سے متوحش نہ ہوئیے گا۔ اپنے مہربان ڈاکٹر محمد شریف جو سند طب ولایت کی رکھتے ہیں، ان سے اس گٹھلی کا بغور معائنہ کرایا۔ وہ کہتے ہیں سرطان نہیں، پسلی پر اساسی نمکیات و مادہ شور کا اجتماع ہوا ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔

مرشد پھر، ہم کو کراچی بلاتے ہیں۔ میں اب تک سفرِ اول کی یادوں پر جیتا ہوں۔ اور ہنگامے وہاں کے مانند خواب من النوم آنکھوں کے سامنے پھرتے ہیں۔ وہ ہمارا تمہاری موٹر گاڑی کہنہ مستی بہ کیتھولک وائف، میں صبح و مسا سیر بازار و دریا کرنا، نازنینِ حسین،

خندہ جبیں، تحفہ چین کے طعام خانے میں ناشتہ کرنے جانا، اور اس کا رستہ بتانا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے راجر کے سوڈے کی خالی بوتلوں میں ولایتی و دیسی دو آتشہ کا عرق معطر انڈیل کر جرعہ جرعہ پینا۔ اور ہل پارک کی روشنی شبانہ میں رات گئے تک واہی تباہی بکنا۔ دن کو ساحل کلفٹن پر مجاہدین شتر سوار بننا اور تصویریں اتروانا۔ ایروکلب کی یخ بستہ فضا میں تمہارے قصہ ہائے ہوشربا جہاں نوردی و عاشقی کے سننا۔ ہائے وہ رات سحر سماں محفوظ کتابِ ذہن ہوئی۔ جب ہم نے تین سندھی مطربوں کو ہل پارک میں موٹر گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا، اور نیم شب تک رواں گاڑی میں ان سے شاہ لطیف بھٹائی علیہ الرحمۃ اور دلی کے اسداللہ خاں غالب کا کلام وجد انگیز سنا کئے۔ ایسا لطف آ گے زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوا کیا صاحبِ کمال لوگ اس قلمرو میں بستے ہیں کہ کوئی ان کا قدر دان نہیں۔ بھوکوں مرتے ہیں۔ بھائی وہ شخص اسمٰعیل تو ساحر تھا۔ سحر ساز تھا۔ بیر اُس رات خوب سر کو چڑھی ریک سر بیڑنے اور اسمٰعیل کی نغمہ سرائی نے اس طور اثر کیا کہ خود کو ایک محمد خالد خاں نہیں، ایک سرمدی و ازلی روپ قلزم کائنات کا جانا۔ کہ قیود مکان و زندان سے آزاد، فلک نیلی مرام کی پہنائیوں میں اڑا جاتا ہو۔ ایک کیفیت وجدان کی ہم سب پر طاری تھی۔ تم پر بھی اور ہمارے مفتی محمد کاظم پر بھی۔ فقیر مدہوش، ہوشمند تھا۔ ہاں، میں جو ہنسا تھا بے روک اس عمارتِ منورہ پر کہ بتقریبِ شادی ہزار ہا روشنیوں سے ضوفشاں تھی۔ تو توجیہہ میرے ہنسنے کی ہرگز میری نشے میں بدحواسی نہ تھی۔ مجھ کو ہنسی آئی دنیا داروں کی نمائش پر تصنع پر۔ عقائد و رسومات تمدن پر دستور شادی مناکحت پر کہ اس کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں۔ اب کہو میری ہنسی جائز تھی یا ناجائز! لوگ رہیں جنت الحمقاء میں اور فضول و لایعنی رواجوں کو بقائے آدمیت سمجھیں، تو یہ فقیر ہنسے نہ تو کیونکر۔ بھگت کبیر ہندی تماشہ دنیا دیکھ کر روتا تھا۔ دوہے لکھتا تھا۔ میں ہنستا ہوں۔ فرق رونے اور ہنسنے میں کچھ نہیں سفاک سمجھ آئے گی تمہیں اس منطق کی۔ تم ٹھہرے گنوار آدمی، افغانی الاصل۔

حاصلِ کلام یہ کہ خوب کراچی میں مزے لوٹے۔ آپ کی صفاتِ حمیدہ سے آگاہ ہو کر شاد و خورسند اپنی بیبیوں کے پاس لوٹے۔ تم کہتے ہو جلد آنے کو، اور دانہ ڈالتے ہو اس بات کا کہ وہ حبینۂ مخزوں وگندم گوں پھر ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرانے کو راضی ہو گئی ہیں۔ تم نے ان کو جو منوایا۔ گویا ناممکن کو ممکن کیا۔ صاحب تم مرد آدمی ہو۔ اُس بی بی کے مرد بچہ قصابِ چادر پوش سے البتہ حذر آتا ہے۔ سوچتا ہوں۔ وہ بیچاری کیونکر اس منزل میں آئی۔ میاں یہ ہے تمہاری مقدس مناکحت، دو ابدان و ارواح کا ایک ہونا! — آنے کی صحیح تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔ انحصار جلد یا بدیر آنے کا ہمارے فخر الفضلاء مفتی محمد کاظم لاہوری کے پروگرام پر ہے۔ ان کی عرض داشت تا حال شعبہ مرکزی مجلسِ مالیات سرکار پاکستان میں زیرِ غور ہے۔ اس پر حکم صدر الصدور شعبے کا جب مبری ہو جائے گا، تقریب سفر کراچی کی تشکیل پائے گی۔ پہلے مزوں کا اعادہ ہو گا۔

صاحب، یہ اچھی رہی، زبیر وزیر وسیلون (۷...) کا خطاب مجھ کو دیتے ہو۔ صاحبِ دانش ہائے جاسوسی وحیرت آئن فلیمنگ نور اللہ مرقدہ کی روح کو اس طور طعنہ دیتے ہو فقیر جسم نزار، مرزا نہیں، قوت شامہ و باصرہ کا ضعیف عذو دانِ ضروریہ سے محروم، کس بنا پر، زبیر وزیر وسیلون، تمہاری رائے میں قرار پایا۔ وہ مرد تنومند تو کسرتی جسم رکھتا تھا۔ اہلِ جاپان کی جوزنگ وکشتی کا ماہر کامل تھا۔ طاقتِ مجامعت دس گھوڑوں کی اس کو تھی۔ نہیں صاحب یہ ہنسی اچھی نہیں۔ زیرو زیرو سیلون ہو تم، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کہ زبیر وزیر وسیلون اور جاسوس غیب داں مولانا شرلک ہومز کی صفات ظاہری و باطنی بالاشتراک آپ کی ذات والا صفات میں مجتمع ہو گئیں، داد! داد! انصاف! انصاف! صورت بھی تمہاری با جبروت، رعب دار، بازار میں چلتے ہو تو لوگ بائیسکوپ کا "سولئے عالم ستارہ کمال" تم کو سمجھ کر انگشت نمائی کرتے ہیں۔ یہ لطیفہ تو میرے روبرو ہوا۔ پھر وہ جو واقعہ تم نے سنایا محلہ سوسائٹی میں کسی گمنام بی بی کا، اس کا نام کو بار بار ٹیلیفون کرنا اور تمہارا کتابِ ہدایتی ٹیلیفون اور رصد لئے طیارہ کی مدد سے اس ستم پیشہ کی رہائش گاہ، نمبر ٹیلیفون اور نام کا کھوج

لگا لینا، شاہکارِ سراغ رسانی ہے۔ میرے مرشد کی یہ کشور کشائی نیرو زیرو سیون اور شرلک ہومز اور سینٹ صاجان اگر سن پائیں تو اس کام سے توبہ کریں اور ملک الاکشاف کو سلام کریں۔

ملتان کا احوال پوچھتے ہو۔ لو سنو۔ لوگ یہاں کے شوقین مزاج، آزاد طبع شیریں زبان ہیں۔ کبوتروں کے کابک ایک کوٹھا چھوڑ دوسرے پر۔ بٹیروں کی پالیاں ہر محلے میں علمائے مجتہدین کے فتوی کے بعد اہلِ اسلام میں سے اس شہر میں فقط تین چار آدمی باقی ہیں دوسرے دو سے میری علیک سلیک نہیں تیسرا یہ شتر بے مہار دنیا موسوم بہ خالد خاں جو شمس آباد کے محلے میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

ورق نبٹرنے سے پہلے ایک سرگزشت ماضی قریب کی اور سنتے جاؤ۔ پرسوں بروز جمعہ ۲۳ رمضان المبارک کو قلعہ کہنہ والے قاسم باغ میں فرقہ ہائے متحدہ اسلام پسندگان کا جلسہ فقید المثال ہوا۔ چار پانچ ہزار کا جم غفیر تقریر آرائی زعمائے قوم کی داد دینے کے لئے فراہم تھا۔ فقیر گیا۔ عم، ہمہ وکل نواب ابن نواب مولانا نصر اللہ خاں بہادر مع خاصانِ درگاہ مسندِ اجلاس پر موجود تھے۔ احاطہ مشرقی سے مولوی نور الامین۔ شمال سے ضیغم شصت سال ملا خان عبد القیوم خاں اور خاص خطہ لاہور سے نحافظِ شہر میجر جنرل شیخ الاسلام سرفراز خاں بہادر شریک جلسہ تھے۔ گویا نظریۂ دین کی سب توپیں گھن گرج کرنے کو موجود۔ اہل کفار کے مجمع کی یہ حالت تھی کہ فرطِ ہیبت و دہشت سے بدن رعشہ دار تھے۔ توپِ اول میجر جنرل صاحب بہادر آپے سے باہر ہوئے رعدِ آفت خیز و ابرِ قہر آلود کے مثل گرجے برسے۔ وہی تکرار میرے دوستوں کی، وہی اسلام کا درد، وہی الفاظِ بے معنی کے لچھے، ہم یہ کریں گے، ہم وہ کریں گے۔ رود گنگا لہو سے رنگین ہو گی۔ ساتھ میں بھٹو پر پھبتی بازی، چار پانچ حکایتیں میدانِ جنگ کی، رٹی ہوئی، حسبِ معمول مسلمین کا خون گرمانے کی کیں۔ ان کے بعد توپِ دوم ہمارے خان خاقان نے کوئی آدھ گھنٹہ جوہر خطابت دکھایا۔ سبحان اللہ! مومنین کے واسطے نوید سراسر امید لائے، یعنی بصورت جنگ

کلکتے، لکھنو اور دلی پہ ہمارا قبضہ ہوگا۔ فقرے بھٹو کی تضحیک کے کسے۔ کام کی باتیں بنگلہ اردو میں نورالامین صاحب نے کیں، وہ محلِ نظر تھیں۔ مولانا نصراللہ خاں رئیس غالباً مظفر گڑھ کے آئے۔ جلسے کو اپنے کلام مخصوص سے رونق بخشی۔ تاثر مجموعی ان تقریروں کا اہلِ کفار میں یہ ہوا ہوگا کہ کھسیانی بلیاں کھمبا نوچتی ہیں۔ اہلِ انگلش کی لغت میں ایک لفظ ہے "فوبیا"، بمعنی کسی واہمہ وخیال کا دماغ پر مسلط ہو جانا۔ یہ صاحبان بھٹو فوبیا میں مبتلا ہیں حسد کے مارے مرے جاتے ہیں۔ ملک تباہ ہو۔ اس میں گدھے کے ہل پھریں، ان کی بلا سے۔ فقیر نے سوچا یہ اکابرین کس دنیا میں رہتے ہیں۔ مرکبِ زمانہ کی گرد ہو ئے۔ باتیں وہی جو بیس پچیس سال آگے کی کرتے ہیں۔ نظریہ ریاست و مذہب اسلام کے بارے میں ہندی کی چندی نکالتے ہیں۔ نسلِ نو ان کو سمجھتی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں (بیت)

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

بھٹو کا ذکر اس تلخ نوائی سے لیتے ہیں جیسے وہ یزید ہو، شمر ہو، وہ بھی مردِ دلیر اکیلا ان اصحابِ کلاہ و پیرہن سے چومکھی لڑتا ہے۔ دیکھو، خط کی طوالت شیطان کی آنت ہوئی۔ لکھتے لکھتے ایک پہر دن ہوا۔ نہ کاغذ نبڑا، نہ سیاہی سوکھی، نہ لوحِ قلم ریخت ہوئی، دل پھر بھی نہیں بھرا۔ اس واسطے کہ تم ہمارے والا برادر از جان عزیز ہو۔ بہ دل نزدیک واز دیدہ دور۔ امیدوار ہوں کہ اس ماہ کے اواخر میں از دیدہ بھی نزدیک ہوگے۔ دیکھی میرے قلم کی خوننابہ فشانی! روز کہتے تھے خط لکھو ـــــ خطاب از روئے احتیاط و کفایت زر بیرنگ ڈاک میں ڈالنے جاؤں گا۔ آزمائش لیں، تمہاری چاہت واسطے اس فقیر کے کی کرنی مقصود ہے۔ یہ پہنچے تم کو

ف شیخ اصغر علی کا وطن اصل رہتک تھا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر میں یہ اور ان کا خاندان خاک پاک ملتان میں آکر متوطن ہو گئے۔ یہ بھینسوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ شیخ اصغر علی کے برادر اکبر شیخ اکبر علی ملتان میں بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کے ممبر مجلس ہیں، کبوتر بھی پال رکھے ہیں۔

کل بروز یک شنبہ دیکھو اور چپ چاپ منشی صہبا کو پہنچا آؤ۔ تصرف کیجئے گا تو درویش پر اور اپنے پر ظلم کیجئے گا۔

طالب دیدار۔ بندہ خضر

شیخ اصغر علی رہتگی شیرفروش کے نام

شیخ مکرم، بندگی ــــ بآغاز ماہ صیام، یعنی اکتوبر کی تیئیس تاریخ سے دودھ تمہارا ہمارے ہاں آنے لگا۔ لڑکا ہر صبح آپ کی سبیل پر برتن لے کر جاتا ہے اور عطیہ شیر سپید و ملذ لاتا ہے فقیر دودھ پیتا ہی نہیں کہ غذائے مرداں اسے تصور نہیں کرتا۔ میری بی بی کہنے لگی شیخ صاحب کا دودھ خالص ہوتا ہے۔ باور نہیں آیا۔ ایک جرعہ نوش کیا۔ سچ مچ شیر آپ کا گاڑھا، شیر ناب نکلا۔ خداوند تعالےٰ آپ کی بھینسوں کو سلامت رکھے اور گوارہ اُن کو موافق آئے!

میں سمجھتا ہوں کہ تم قطب القطبین، صاحبِ کرامت ہو۔ اس واسطے کہ اس ریاستِ مسلمین میں اغلباً شیرفروش واحد ہو جو آبِ تازہ میں قطرہ ہائے شیر کی آمیزش سے مجتنب ہے یا رمضان کے مہینے کی برکت ہے۔ متوقع ہوں کہ بعد ختم ہونے ماہِ مبارک کے بھی تمہاری سبیل کے دودھ کی یہ حلاوت و لطافت قائم رہے گی ــــ شیخ جی، کیا زمانہ آیا ہے۔ سب ساہوکار، تاجر، دکاندار اس سلطنت کے یزید و شمر بنے ہیں۔ اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ اجزائے ضرر رساں کی کیے بیچتے ہیں اور خلقتِ خدا کو مار ڈالنے پر تُلے ہیں۔ سوچتے نہیں کہ یہ حال رہا تو ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ نزولِ قہر خداوندی ــــ کل میں خود لڑکے کے ہمراہ قدم بوسی کو حاضر ہوا۔ واہ کیا سماں روح پرور دیکھا۔ آپ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے دودھ کی بالٹی رکھی ہے۔ دودھ لینے والے بچے، بڑے تمہارے گرد حلقہ باندھے ہیں۔ لہک لہک کر نعت خوانی کرتے جاتے ہو، اور مبدأ فیض جاری و ساری ہے جی بہت خوش ہوا۔

فقیر سے پوچھو، شیخ جی، اس ملک کے کل علماء و فقہاء و رؤساء تمہارے سامنے روحانیت میں گرد ہیں۔ ان کی سب باتیں ہی باتیں۔ موعظت ہی موعظت! تم شرح متین کے مطابق عمل کرتے ہو۔ خاک پاک ملتان میں دو آدمی ولی صفت مجھے ملے۔ ایک تم، دوسرے ہمارے پانوں کے شہنشاہ نجم الدولہ محمد یونس الماس۔ ان کو حرص وطمع نہیں۔ خدا نے نفسِ مطمئنہ انہیں بخشا ہے۔

اپنی بھینسوں کو سلامِ مسنون اور ماتھے پر تھپکی۔ پروردگار دودھ ان کے تھنوں کا زیادہ کرے، اور وہ کبھی نہ سوکھیں۔ کبوتروں کو دعا

فقیر خضر۔ مرقومہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے نام ـــــ

نواب الملک، عالی خاندان میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ!

سلام و کورنش مودبانہ بجالاتا ہوں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو، فقیر خضر ایک مدت سے نیاز معتقدانہ آپ کی ذات والاصفات سے رکھتا ہے۔ میاں صاحب! تمہارے بزرگوں اور میرے بزرگوں کے درمیان روابط قریبی تھے۔ تمہارے والد مرحوم و مغفور جامع مدارج، قدسی صفات تھے اور یونینسٹ طائفے کے روح رواں۔ زمانہ طالب علمی میں ان کے مضامین بزبانِ انگریزی اکثر اخبار میں نظر افروز ہوئے۔ شرپسند اور حاسد کہتے تھے کہ خود نہیں لکھتے کسی منشی مشوری سے لکھواتے ہیں۔ میں اسے غلط جانتا ہوں۔ آپ نے باپ کے کمالات میں افزونی کی۔ ولایت کے جامعۂ کیمبرج سے اعزاز کے ساتھ سند لے کر وطن لوٹے۔ ماشاءاللہ العزیز یہاں پر کیا کمی تھی۔ جائداد و املاک بے حساب، خدام و گماشتے آگے پیچھے۔ تمہاری ذہانت و فطانت کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ اشغال کے بغیر زندگی میں لطف نہیں۔ تمہاری طبع کو مناسبت تھی سیاست اور ریاست گری سے۔ اس میں جو ہاتھ تم نے دکھلائے، واہ واہ! سب عش عش

کرا تھے۔ گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ جوڑ توڑ کے استادِ مسلّم الثبوت گردانے گئے۔ انتخابات عملداری
پنجاب میں ہوئے تو ایسے داؤ پیچ لگائے کہ مدمقابل نے پٹخنی کھائی۔ آخر کو صوبہ پنجاب کے
مدارالمہام بن گئے۔ گویا سیاہ سفید کے مالک! انصاف میں تین اسم سرفرازی پاکر ضرب المثل
ہوئے۔ ایک نوشیرواں الملقب بہ عادل۔ دوسرا خاندان مغلیہ کا نورالدین جہانگیر، تیسرے تم!
عدلِ جہانگیری کی یاد تم نے تازہ کی، احیاء اس کا کیا۔ زنجیر سے گھنٹی بجانے کی طرح البتہ تم نے
توڑی۔ اغلباً ہر چہار شنبہ کو دربارِ عام کرتے تھے۔ فریادی درخواستیں لے کر پیش ہوتے، تم ہر
کسی کی دادرسی کرتے۔ کوئی خالی ہاتھ باہر نہ آتا۔ کسی کو کوتوالِ شہر کے نام پروانہ اپنے ہاتھ سے
مرقومہ تھماتے، کسی کی درخواست پر سکتر، مکشنر کو حکم صادر فرماتے۔ کئیوں کے کام بنے، بہت
سوں کے بگڑے۔ فقیر خضر نے بھی ایک بار درِ آستاں پر قدم بوسی کا قصد کیا تھا، وہاں جمِ غفیر
دیکھ کر پلٹ آیا۔ اخبار میں نقشہ تمہارے دربار کا البتہ دیکھا، کہ زریں کرسی پہ پائپ منہ میں ڈالے
بیٹھے ہو۔ ایک پیر فرتوت نیازمندی میں کھڑا ہے اور اس کی درخواست پہ کچھ حروف لکھتے ہو۔
ولولہ انگیزی اور جولانیٔ طبع نے آپ کو اکسایا، حاکمِ اس قلمرو کے بننے پر۔ صوبہ پنجاب کی زمین
تنگ نظر آئی۔ چنانچہ ختم نبوت کی تحریک کا شوشہ چھوڑا۔ جنوب و شمال، شرق و غرب سے
علمائے مجتہدین جمع کئے۔ طعام و قیام کا انتظام ان کے خاطر خواہ اونچے بھٹیار خانوں میں کیا اور
حکومت کی تعلیمی و خیراتی مدّوں سے وظائف معتقد بران کی نذر گزرانے۔ وہ ہوئے تمہارے والہ و
شیدا۔ اور ان کے بوتے پر خطۂ پنجاب میں ایک آگ سی لگادی۔ بچوں اور بوڑھوں کی ٹولیاں نعرۂ
تکبیر پڑھتی، گلے میں موتیا و چنبیلی کے ہار پہنے ریل کے اسٹیشن پر جاتی میں نے بھی دیکھیں۔ وہ
بلا ٹکٹ ڈاک گاڑی میں دارالسلطنت کراچی کو جانے کے لئے سوار ہوتے۔ میاں صاحب! یہ بات
سمجھ میں نہ آئی کہ یہ ہڑبونگ اور بدنظمی تم نے مچوائی کس خاطر؟ اور مدارالمہام اعلیٰ بھولے میاں
خواجہ ناظم الدین غضنفر کا ناطقہ بند کرنے سے حصول کس مدعا کا تمہارے پیش نظر تھا۔ تدبیر تمہاری
الٹ پڑی۔ دیارِ لاہور میں فوجی قانون لاگو ہوا۔ تم اور تمہارے اخوان عالی شان و یاران باصفا

معزول ہوگئے، سوچا کچھ، ہوگیا کچھ، سلطنت جاتی رہی۔ آپ کے دولت کدے پر پہرہ بیٹھ گیا۔ صاحب، اب اُس وقت کو روتے ہوگے۔ سو دن اور آج کا دن، سلطنت پھر ہاتھ نہ آسکی کچھ سخت جان ہو، میدان سے ہٹے نہیں اور کُل گُر کہ فنِ ریاست گری کے اساتذہ قدیم کی کتب میں پڑھے تھے آزما ڈالے۔ جب سپہ سالارِ اعظم جنرل ایوب خان بہادر نے امورِ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو آپ بشمول اپنے ہوا خواہوں کے مراقبے میں چلے گئے۔ گوشہ نشینی اختیار کی، زبان پر مہرِ سکوت لگانے میں مصلحت جانی۔ فقیر حضر کو گمان ہوا کہ اس کے وطن میں سب گونگے، تملّق پسند، جاہ پرست بستے ہیں۔ حق کی صدا لگانے والا کوئی نہیں۔ ماسوا ایک واحد شخص منصبِ اعلیٰ قاضی القضاۃ محمد رستم کیانی کے۔ وہ مردِ نحیف و نزار واقعی اسم بامسمّٰی یعنی رستم نکلا۔ اس کی باتوں نے ایوانِ سرکار میں وہ چوٹیں کیں کہ اس کے درو دیوار متزلزل ہوگئے۔ ایک عزیز سے تمہارا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ استغراقِ مطالعہ میں اپنا غم غلط کرتے تھے۔ سیاست کا دامن بظاہر چھوڑ دیا تھا۔

ایوب خان کا سفینۂ سلطنت ڈوبنے لگا تو آپ پھر کھٹ سے موجود! جبۂ درویشی و عزلت نشینی اتار پھینکا۔ مصالحتی مجالس میں آپ پیش پیش تھے۔ نواب صاحب، کہاں تک طول بات کو دوں!

بری بات، مالو۔ اصولِ سلطنت جو تم نے پڑھے، اب پرانے ہو چکے۔ ان کو اب سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔ میکاویلی، کا فلسفۂ حکومت کبھی کا زنگ خوردہ ہو چکا۔ اس زمانے کے رنگ ڈھنگ، آفتاب و ماہتاب دوسرے ہیں۔

سنتا ہوں آپ کی طبع ناساز رہتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بہانہ ڈھونڈا ہے، اور اس میں بھی چالِ سیاست ہے۔ فقیر حضر متشوش ہے اور حصولِ صحت کی دعا وقتِ خاص میں بلا ناغہ مانگتا ہے۔ ہرزہ سرائی کا گناہ معاف کیجئے گا۔ قلم، دوات اور کاغذ پاس رکھا تھا جی چاہا آپ کے ساتھ کچھ باتیں کر لوں۔ جو دل میں تھا وہ صفحہ قرطاس پر لے آیا۔ ورنہ تمہاری خاطر مجھے ہمیشہ مرغوب

رہی۔ تم کیا سب نوآبانِ عالی مقام و صاحبزادگانِ بلند منظر اس قلمرو کے بے نصیب کے میرے ممدوح و معشوق ہیں۔ ان کے احوال سنتا ہوں، ان کے بیان اخبار میں پڑھتا ہوں۔ سچ جانو، بڑا لطف آتا ہے۔ بندہ سب کا ثنا خواں اور نیاز مند ہے۔ شعر:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کورنش بجالاتا ہوں۔ کاغذ باقی نہیں رہا، اور قلم کا نب بھی چپس بجیس ہو چکا ہے۔ شوکت صوبہ پنجاب، عالی جناب شوکت حیات صاحب کو فقیر خضر کی بندگی پہنچا دیجئے گا۔ بھائی نور خاں کے کفِ مبارک کو بوسہ! ——— دعا گو خضر۔ مرقومہ یک شنبہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء

ذوالفقار علی بھٹو کے نام——

ذوالفقار علی، سیماب صفت، برقِ مجسم، جناب ذوالفقار علی بھٹو کو فقیر کا سلام و دعائے درویشانہ!

صاحبزادہ والا تبار، یہ کیا بات ہے کہ میرا دل تمہارے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ جہاں کہیں تم جاتے ہو تازگی اور زندگی اور بہارے آتے ہو۔ خدا کی پناہ! تقریر تمہاری عوام الناس کے لئے موجب انبساط و فرحت ہوتی ہے۔ ان کے دل کو مٹھی میں کر لینے کا ملکہ تم میں خوب ہے۔ برق کیا چمکتی ہے جیسا تم چمکتے ہو۔ رعد کی کڑک تمہاری کڑک کے سامنے ہیچ۔ اپنے اعداء کے پول کس بے باکی و دلیری سے کھولتے ہو۔ واللہ تمہاری گفتار میں مزہ ہے۔

صاحب، تم نے فرسودہ سیاست کو کہ امراء تعلق دار، پیر اور ملّا اپنے محلات و مساجد میں بیٹھ کر کھیلا کرتے تھے یکسر بدل ڈالا۔ اپنی بساط الٹ جانے کے بعد اب وہ بمثل کھسیانی بلی کھمبا نوچے جاتے ہیں۔ تم ان کے معتوب ٹھہرے۔ اس واسطے کہ تم نے ان کی جبلی ہوسِ جاہ اور عیاری پر

سے پردہ اٹھایا اور ان کے مقاصدِ مفسدانہ کو خاک میں ملایا۔ ایک ہنگامہ پرخروش انہوں نے تمہارے خلاف اٹھایا ہے، تم مرد آدمی ہو، سچ بات کہنے سے نہیں چوکتے۔ تم ان کے نزدیک قصوروار گردن زدنی یوں ہو کہ ان کی رونمائی بر سر بازار کرتے ہو۔ میاں صاحبزادے، سلمہ تعالیٰ، تم جانتے نہیں کہ یہ ولایتِ پاکستان جس میں ہم تم کسنے کو جیتے ہیں ان صاحبوں کی جاگیر ہے۔ عوام الناس کو رزق جن کا اس مملکت میں مسدود ہے! کنجڑے، بساطی، پھیری والے، اکے والے، دہقان، ان اہلِ دولت و ثروت کے نزدیک مرتبہ انسانی نہیں رکھتے۔ یہ چاہتے ہیں کہ غرباء اپنے مقدور پر قناعت کریں اور عالمِ انسانی کو امیر و غریب کے دو درجات میں منقسم کرنے کا الزام خداوند باری تعالیٰ کے سر تھوپے جاتے ہیں، معاذ اللہ!

تو جانِ من، ان کے کھیل کو تم نے بگاڑا۔ ان کی خفگی اور رنجش تم سے بجا اور یہ حقِ اخبار میں جلے پھپولے نہ پھوڑیں تو اور کیا کریں۔ عوام الناس تو ان کو منہ نہیں لگاتے اور نہ ان کی بات سنتے ہیں۔ ان کو اپنے محلّاتِ عالی شان میں مجالس رچانا، ہرزہ سرائی سے غبارِ دل نکالنا، شطرنج سیاست گری کی بساط بچھانا مبارک ہو۔ وہ آگاہ اس امر سے نہیں کہ ان کے مہرے پٹ چکے۔ اب اس عہد کا ڈھنگ اور ہے۔ افقِ نو کی نوجوان آنکھیں متلاشی ہیں۔ چالبازی و ریاکاری و تنفر و تمسخرِ خواص کا دَور ہو چکا۔

ان کے مریضانہ و مدقوق ذہن کی ایک مثال کل میری نظر سے گزری۔ ایک کتابچہ ایک پیر صاحب نے انطباع کیا ہے۔ اس میں مرقومہ عبارت کے ایک فقرے پر فقیر حقیر کے کان کھڑے ہوئے۔ بندے کے نیاز اور باری تعالیٰ کی شانِ بالا کے مذکور میں لکھا ہے" بندے کی کیا مجال کہ بارگاہِ ایزدی میں گستاخی کرے۔ کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں کہ آپ کا کمین، نوکر، بھنگی آپ کے ساتھ اس چارپائی پر آ بیٹھے جس پر آپ محو استراحت ہیں۔۔۔۔ وغیرہ،، تم خود سمجھو جہاں یہ ذہن کارفرما ہو وہاں علم و عرفان، ہمدردی و دل سوزی کا گزر ہو تو کیونکر!

دیکھو صاحبزادے، ایک نصیحت میری پلّے باندھو۔ فتح و فیروزمندی اپنے مقاصد میں

تم کو حاصل ہو یا نہ ہو، یہ باعثِ الم و تلخیٔ طبع نہ ہونا چاہیئے۔ عوام الناس کے دکھ اور غم کا تم نے احساس کیا، اور باوجود اس کے کہ خود طالع بخت اور صاحبِ ثروت ہو، اپنے بلند منظر سے ان کے درمیان آ گئے، ان کی رفاقت کا دم بھرا۔ یہ بڑا کام ائمہ کرام نے تمہارے ہاتھوں سے سرانجام پہنچایا۔ میری نگاہ میں ارجمندی جو تمہاری خواہش تھی تمہیں مل چکی۔ چونکہ جیتنا دلوں کا حصولِ سلطنت سے اولیٰ اور مسعود ہے۔

دل کہتا ہے ہم تم اکٹھے رہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی غم میں شریک ہوں۔ ایسا جانتا ہوں کہ ایک وقت میں تمہارا دیدار روبرو ہوگا ضرور حضرت امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ تمہارے بازو پہ باندھنے کی رکھتا ہوں۔ ہنوز طویل سفر در راہِ محبت آپ کو طے کرنا باقی ہے۔ باری تعالیٰ تمہاری ہر لحظہ نگہبانی کریں۔ حاسد و فتنہ جو خاک چاٹیں۔

عالی جناب جے۔ اے رحیم اور جناب مصطفیٰ کھر قبلہ کو فقیر کا سلام پہنچا دیجیے گا۔ اپنے ملازم و وفادار کو کہ شراب ناب تمہیں پیش کرتا ہے۔ فقیر کا سلام بندگی۔

فقیر اب ایک بوتل تری بیئر کی نوش کرنے کے بعد عالمِ ارواح کی خبر لائے گا۔ ع

تم سلامت رہو قیامت تک

خضرِ خستہ جاں، مرقومہ سہ شنبہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام ——

پیر و مرشد، آداب!

آج چہار شنبہ کا دن ہے، ۲۰ اکتوبر کی ہے۔ پہر دن رہے گا، تکیے سے ٹیک لگا، لڑکے کی دوات پہلو میں رکھے، آپ کو شکایت نامہ لکھتا ہوں۔ کل صبح دم ڈاک میں نہ بھیجوں گا۔

پروردگار دولت و اقبال روز افزوں کرے۔ حضرت اب کے آپ کے بیت المال سے مقرر شدہ تین سو روپے کی ہنڈی کہ دو سال سے ماہ بماہ ملتی تھی اور ناغہ نہیں ہوتا تھا فقیر کو نہیں پہنچی۔ خدشہ ہے کہ ڈاک میں تلف ہوئی یا بصورت دیگر آپ کے عُمّال و کارپردازوں نے کوئی بات میری برائی کی آپ کے کان میں پھونکی اور آپ نے ان کو آئندہ ماہانہ بھیجنے سے منع کر دیا۔ میرے قبلہ و کعبہ سچ جانیے گا آپ سے جو عقیدت مندی اور ارادت مجھے ہے اس میں فرق نہیں آیا۔ میرا بھٹو کا جاسوس ہونا اور خفیہ مراسلے آپ کی مجالس کی کارروائیوں کے اس کو بھیجنا محض کسی بدخواہ کی اتہام بازی ہے۔ اگر کوئی قصور عاجز حقیر سے سرزد ہوا تو اس کی نوعیت کی مجھ کو خبر نہیں۔ بہرحال متوقع ہوں کہ میرا وہ قصور معاف ہو، اور ہنڈی کی عنایت حسب دستور جاری رہے۔ ایامِ الیکشن میں جو دوڑ دھوپ میں نے کی اور مفاد جماعت میں جیسی کچھ سرگرمی دکھائی، وہ آپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ خط بنوانا چھوڑ دیا تھا اور والہانہ سڑکیں اچھرہ کی ناپتا تھا۔ آپ کی خوشنودی مجھے حاصل تھی حضرت کو یاد ہوگا۔ آپ نے اپنے ایک خاص کام پر مجھے ڈھاکہ بھیجا تھا اور تین ہزار روپے کا تمسّک وہاں کے ایک ساہوکار میزان الرحمٰن عرف بدھو میاں کے نام لکھ کر دیا تھا وہ کام الحمدللہ بخیر و خوبی سرانجام پایا یا بوم شوکتِ اسلام پر اونٹوں اور گھوڑوں کی فراہمی میں نے کی۔ قبلہ اب منہ پھیر لینا اور وظیفہ سے ہاتھ کھینچ لینا، وہ بھی چغل خوروں کے کہنے پر، کیونکر روا ہے۔ پھر آپ کی بارگاہ عالی سے وظائف و عطیات ہزاروں کے مقرر ہیں۔ مجھ غریب کو ماہانہ سے محروم کرنا سراسر ظلم ہے۔ فقیر کہیں کا نہ رہے گا۔ شراب تک خرید کر پینے کی استطاعت باقی نہیں رہی، اور پارسی سوداگر قرض پر دینے سے انکاری ہے۔

حضرت، دو خبریں یہاں اڑی ہیں جن کی توثیق آپ سے چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ بھٹو کو نیچا دکھانے کی غرض سے آپ اور ممتاز محمد دولتانہ اور نواب زادہ عالی مقدار نصر اللہ خان صاحب یک جان و متحد ہو گئے اور ان صاحبان کے درمیان معاہدہ ہوا اس بات کا کہ سب جماعتیں

دائیں بازو کی مل کر نمائندے انتخاب کریں گی یقین نہیں آتا کہ گٹھ جوڑ کے لئے جماعت کی اصول پرستی مصلحت کوشی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ اگر یہ امر وقوعی و حقیقی ہے تو جائے افسوس ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ یہ اتحادِ فرضی مابین مختلف الخیال اصحاب کلپنے گا نہیں۔

دوسری خبر یہ ہے کہ ہمارے چودھری طفیل محمد صاحب کہ ملک کے مشرقی حصے میں طفیل محمد چودھری بنے ہوئے ہیں اسلام آباد گئے اور قاضی کارنیلیس صاحب کے تحریر دستور و آئینِ حکومت کے سودے کو پڑھ آئے۔ اخبار میں اشتہار ان کی طرف سے آیا ہے کہ وہ آئین سے مطمئن ہیں یعنی یہ سراسر اسلامی ہے اور کارنیلیس صاحب کی اسلام پرستی کا غماض! عقل حیران ہے کہ ایک عیسائی امورِ مذہبِ اسلام میں اتنا درک رکھے کہ اسلامی آئین لکھے گا۔ گویا کارنیلیس صاحب مشرّف بہ اسلام ہوئے اور آپ کے اور چودھری صاحب کے محبوب و ممدوح۔ کیوں صاحب یہ سچ ہے تو پھر ذوالفقار علی بھٹو کہ مسلمان کلمہ گو ہے اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والا کیونکر معتوب ہوا، اور اہلِ کفار کے زمرے میں شمار ہوا۔ اس واسطے کہ وہ شراب پیتا ہے؟ شراب تو آپ کے میرزا اسداللہ خاں غالب بھی ہر شب پاؤ بھر کے پیمانہ میں پیتے تھے۔ ایک داستان طراز، مفلس، قلاش سعادت حسن منٹو بھی مانگ تانگ کر پیتا تھا۔ اُن صاحبوں میں سے جن کے ساتھ آپ نے یک جانی کی قسم کھائی ہے بہت سوں نے نے لکوئر اور شمپین کے خم کے خم لنڈھائے ہیں۔ قبلہ اصل بات کہتا ہوں گستاخی جان کر بُرا نہ مانیے گا۔ بھٹو بے چارہ یوں زندیق و قابلِ زدنی قرار پایا کہ وہ خواہاں ہے مخدوم و خادم میں امتیاز مٹانے کا دہقان کو اپنے مزروعہ خطہ زمین کا مالک بنانے کا!

خدا کرے یہ دونوں خبریں غلط ہوں۔ غلط ہونا ان کا آپ کے لکھنے اور وضاحت پر منحصر ہے۔

آج کل آپ کی تصنیفِ لاجواب "پردہ" پڑھتا ہوں۔ سبحان اللہ! الفاظ متین، مضمون عمدہ، معانی بلند، اعلان کلمۃ الحق ہے۔ کہ عورتیں بیویاں اور بہنیں اور مائیں ہیں۔ کسی نامحرم مرد کے

ان کے چہرے کلائی، ہاتھ کو دیکھ لینے سے آفت آتی ہے۔ اس لیئے ان پر پردہ واجب، اور پردہ بھی ایسا کہ سراپا جسم لباسِ سفید و سادہ میں ملفوف ہو جائے۔ ہاتھوں میں دستانے پہنیں، پاؤں میں موزے، اس طور سے کہ جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ رہے۔ خدا جانے کس وقت کسی مرد کی نظر پڑ جائے اور عشقِ مجازی کی ہنگامہ آرائی کا آغاز ہو جائے شعر و شاعری کرنا، ناچنا گانا، ان کے لئے ممنوع اور خلاف شرع۔ معمولی طور سنگار کرنے اور لب پرستی لگانے کی اجازت البتہ آپ نے ان کو دی ہے۔ لیکن صرف اپنے گھر میں اور اپنے شوہر کی خوشنودیٔ خاطر اور رجوع یا اختلاط حاصل کرنے کے لئے۔ بچے وہ جن سکتی ہیں۔ درجنوں اگر چاہیں تو بشرطیکہ حلال کے ہوں۔ واہ واہ قبلہ! کیا مساوات مرد اور عورت میں آپ نے قائم کر دی اور کیا مقام عورت کو دیا۔ میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ خوب مضمون رقم فرمایا ہے۔ تبلیغ و ہدایت کا حق ادا کر دیا ہے ہاں ایک بات کی آپ سے وضاحت چاہتا ہوں، اگر مرد و عوت کا مقام باری تعالیٰ کے نزدیک ایک ہے اور ان کے باہمی اختلاط اور میل جول میں قباحتِ خطیر ہے تو کیوں نہ مرد بھی پردہ کریں اور اپنے جسم کے ہر عضو کو ڈھانپے رکھیں کہ کسی نامحرم عورت کی نظر ان پر نہ پڑے۔ یہ ایک جاہلِ مطلق شخص کی رائے ہے۔ تم کہ سلطان العلوم اور مجتہد الدہر ہو، بہتر ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ گمان ہے کہ کارنیلیس صاحب نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور اپنے محررہ آئین اس سلطنت کے میں خاص باب قوانین پردہ پر لکھا ہوگا۔

مدت ہوئی لاہور میں ایک شخص سعادت حسن منٹو سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ فنِ داستاں طرازی میں ماہر کامل یہ شخص مبتلائے فسق و فجور تھا۔ شرابی، کبابی۔ البتہ آدمی طرح دار انسان دوست بے باک واقع ہوا تھا۔ آپ کی جماعت کے لوگ اُسے مطعون جانتے ہیں۔ آپ پردہ ڈالتے ہیں، وہ پردے اٹھاتا تھا۔ اس نے ایک مضمون لکھا اس طور کا کہ آپ کی اسلامی جماعت کی حکومت ملک کے شرق و غرب، شمال و جنوب میں قائم ہے اور نفسِ مضمون یہ کہ ایک عام شہری پر اس حکومت میں کیا بیتتی ہے اور کس دوزخ میں وہ بے چارہ سفرِ زندگی

طے کر رکھا ہے۔ فرصت ملے تو اس کو پڑھیے گا اور ہمارے چودھری طفیل محمد صاحب کو بھی پڑھوائیے گا۔ کارنیلیس صاحب کا آئین میں نے نہیں پڑھا۔ سعادت حسن منٹو کے مضمون کو اس آئین کی تلخیص جانیے گا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن تبلیغ و موعظت کے لیے وقف۔ شعر و شاعری، داستان طرازی، مجسمہ سازی، کل فنونِ لطیفہ پر پابندی۔ ہر شخص صالح، مردِ مومن باریش مسجع مقطع۔ ہر عورت گھر کی چار دیواری میں مقید، دردِ زہ میں مبتلا۔ پروردگار بتصدق ائمۂ اطہار ایسی سلطنت اس قلمرو میں وجود میں لائے۔ آرزو تمہاری جلد پوری ہو اور مدت انتظار انجام کو پہنچے۔ وہ زمانہ آیا تو فقیر اس قلمرو سے ہجرت کر کے کسی اور ولایت میں جا بسے گا۔ شعر

پائے گدا لنگ نیست
ملکِ خدا تنگ نیست

اپنے خفقان کو لعنت کرتا ہوں۔ واللہ کیا ہرزہ سرائی دانائے رموزِ شرعِ متین اپنے قبلہ و کعبہ ابوالاعلیٰ کی بارگاہ میں کی ہے۔ اسے جسارتِ نیازمندانہ پر محمول کیجیے گا اور عفو سے محروم نہ رکھیے گا۔

والیٔ قفقازِ امریکہ خلیفۃ المسلمین، عالی مقام رچرڈ نکسن صاحب بہادر کا کوئی خط اگر واشنگٹن سے آیا ہو تو مجھ کو بھی آگہی دو۔ ان کے سفیر باتدبیر جوزف فارلینڈ تو گاہے گاہے سلام کے لیے درِ دولت پر حاضری دیتے ہوں گے۔

ہنڈوی کو نہ بھولیے گا۔ میرا یہاں لین دین جس ساہوکار سے ہے وہ نیشنل بنک کہلاتا ہے۔ رسیدیں ہنڈوی پہنچنے پر فوراً بیرنگ ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ خاطر جمع رکھیں۔ اس خط کا جواب باصواب یعنی نویدِ قبول جلد مرحمت ہو۔

ہمارے چودھری طفیل محمد صاحب کو بندگی اس عاجز کی ضرور پہنچائیے کہ نائب اور قائم مقام آپ نے ان کو منتخب کیا ہے۔ کاش میں ان کی جگہ ہوتا۔ حق میرا تھا جو اُن کو ملا۔ مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

طالب عنایت خضر بھجوہ

جمیل الدین عالی کے نام —

برخوردار جمیل صورت جمیل الدین سلمہ تعالیٰ کو خضرِ لورِیہ نشین کی دعا پہنچے۔
اہاہا! تمہارے دوہے ایک پرانے پرچے اردو زبان میں میں نے دیکھے۔ غنچہ دل کا کھلا۔ نظر بد نہ لگے۔ زبان اردو میں الفاظ ہندی و بنگلہ اس خوش سلیقگی سے پروئے ہیں کہ خوبی اُن کی دوچند ہے۔ کوئی یہ دوہے زبان بنگلہ کے جان کر پڑھے تو لطف مستزاد ملے۔ خوشامد و تملق کی خو نہیں، فن دوہا گوئی میں بھگت کبیر رحمۃ اللہ اور ایک اور صاحب کے بعد کہ نام ان کا نذرِ نسیاں ہوا آپ جیسا نغز گو نہ ہوا، اور تم اُن سے فضیلت میں آگے۔ اس واسطے کہ مطربِ خوش گلو بھی ہو۔ چند برس ہوئے ڈھاکے کی ایک مجلس میں تمہارے دوہے تمہاری زبان سے سُنے۔ سحر تم نے سب پر کیا۔ فقیر دیر تک حالتِ سکتہ میں رہا۔ ایک زمانے میں نثر تمہاری بھی اپنا رنگ رکھتی تھی۔ ایک پرچے "نقوش" میں تمہارا مضمون سائل دہلوی کے بارے میں نظر سے گزرا تھا۔ کمال مرقع نگاری و سوانح نویسی اسے منصور کیا۔ مابعد اس کے البتہ کوئی کام کی چیز نثر میں تم نے نہ لکھی، ماسوا ایک قصیدے کے جو تم نے سابق فرماں روائے قلمروئے پاکستان جنرل محمد ایوب خاں کی تاج پوشی پر ان کی نذر میں گزارا۔ وہ کیا دن تھے! ہر سخنور ممدوح کی مدحت طرازی میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی قسم کھائے تھا۔ ذاتِ سلطان میں خوئے درویشی و گدائی پاتا تھا۔
اب تم ہو مبتلائے اخبار نویسی۔ نثر اردو میں دفتر کے دفتر تم نے سیاہ کیے۔ یعنی قلم اٹھایا

اور چل میرے گھوڑے۔ نتیجہ: معلم زبان حضرت ماہرالقادری کو چھوڑو، مجھ سا جاہلِ مطلق زبان اردو سے ناآشنا بھی اس تحریر کو پڑھے تو ایک خانہ اخبار میں بیس غلطیاں املا کی نکالے۔ خیالات پوچ محض، معانی مضمون ندارد۔ خدا جانے خود بھی نوشتِ خود کو سمجھتے ہو؟ میں نہیں جانتا ہنڈوی کتنے سو کی بصلہ یک کالم بھرائی نورالملک نصرتِ جنگ میر خلیل الرحمٰن مدظلہ العالی سے بٹورتے تھے۔ ایسا ایک کالم تمہارا پڑھا، کلیجہ منہ کو آیا۔ اے خضرِ بے دقر! تمہارے جمیل الدین کو کیا ہو گیا۔ کیا بہکی بہکی لایعنی باتیں کرنے لگا ہے۔ برخوردار ایک قاعدہ مسلّمہ سنو: جو سخنور جیب خرچ و مصارفِ شرابِ ناب کی خاطر اخباروں میں دھڑا دھڑ تابڑتوڑ لکھے گا، وہ پیشہ ور بنے گا یعنی عاقبت اس کی سنور نہیں سکتی۔

حال میں "فنون" میں کچھ دوہے اور نظمیں دیکھیں۔ وہی قدیمی سادگی و غنائیت و سحر آفرینی شادماں ہوا، تمہارا کلامِ تازہ پڑھ کر خاطر جمع ہوئی کہ جمیل الدین ابھی جادہ پیمائی راہِ سخن سے ہٹا نہیں۔ راستے سے بھٹکا نہیں۔ القصّہ مختصر قلم روک کر لکھا کرو۔ اخبار میں یوں ہر معنوں میں نگارش آفرینی اہلِ بصیرت و عاقبت کا شیوہ نہیں۔ بات خضر کی بری لگے تو طلب گارِ معافی ہوں۔ منہ پر آئی، کہہ دی۔ اب التفاتِ خاص تمہارے کے لئے اپنی روئداد لکھتا ہوں۔

توطیہ۔ فروری کے مہینے میں اس فقیر کی ایک تصنیف بعنوان "کھویا ہوا افق" منشی رشید احمد چودھری کے مطبع موسوم بہ مکتبہ جدید الطباع ہوئی۔ چھ سو روپیہ حق تصنیف و طباعت کا ان کے نام لکھ دینے کا طے ہوا، اس میں سے چار سو کے لگ بھگ مجھے ملے، یا میں نے بالاقساط وصول کئے۔ بقیہ ان کے ذمے ہوئے۔ وہ بوجہ نسیان بھولے ہوئے ہیں۔ یہ رقم خطیر جو میں نے وصول کی تمہارے غالباً ایک خانہ اخبار کے پر کرنے کی اجرت ہے۔ یہ احسان البتہ انہوں نے کیا کہ کتاب میرے اپنے نام سے چھپی۔ تمہاری نگاہ سے فقیر کی یہ تصنیف گزری ہوگی۔ پڑھی ہو تو زہے نصیب۔ کاپی نویس نے چند اصلاحیں ایسی بڑی نثر میں حسبِ روایت کر دی ہیں کہ دعا اس کے واسطے کرتا ہوں۔ بہرحال کئی ایک اخباروں اور پرچوں میں بسبیلِ مروتِ دوستاں تبصرے اس کتاب پر

ہوئے۔ان صاحبوں کی کرم فرمائی قابلِ تہنیت وتحسین ہے اس واسطے کہ ان کی مجھ سے صورت آشنائی تک نہ تھی۔علیک سلیک کا مذکور نہیں۔بیس مجلد کمال فیاضی و دریا دلی سے منشی صاحب نے مصنف کو مرحمت فرمائے۔ وہ احباب میں تقسیم ہوئے۔ دو جن سے اوپر جلدیں خود اپنی گرہ سے خریدکیں یعنی کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی۔ مہتمم مطبع کے پیچھے پڑ کے سات مجلد کتاب کے مع سرورق تمہاری کمپنی رائٹرز گلڈ کو، جو ملجاو ماوی سخنوروں کا بنی ہے۔ارسال کئے گئے۔ پارسل کی رسید آگئی۔کوئی عرصہ چار پانچ ماہ بعد چودھری رشید احمد کلبۂ احزان پر تشریف لائے اور مٹھائی کھلانے کا تقاضا کیا۔پھر نوید سنائی کہ کمپنی مذکور نے لائق آدم جی ایوارڈ اسے گردانا ہے اور پانچ ہزار کی ہنڈوی اجلاس عام میں مجھے دیں گے۔حاشا و کلّا باور نہیں آیا۔خیال کیا رشید احمد آمادۂ شرارت ہے جب انہوں نے یقین دلایا اور ثبوت اخبار کے تراشے سے دیا، تو فرطِ مسرت سے دیوانہ ہوا۔خواب نئی موٹر گاڑی، دو نئے سوٹوں اور درجنوں بوتل ہائے بئر کے حالتِ بیداری میں دیکھے۔بندہ پرور! ہشتہ دو ماہ نوروز ہونے کو آئے، اس ہنڈوی کی نہ شنید ہے نہ دید۔سوچتا ہوں معاملہ بگڑ گیا۔تم نے یا کارپردازانِ کمپنی نے رائے منصفین کی تنسیخ کی، یا ساہوکارِ ریاست، مربّیٔ علوم حضرت آدم جی دیوالیہ ہوئے۔ ایک افواہ اڑتی یہ بھی کان پڑی کہ ایک خاتون مزئم زمانی عالمگیر نے مقدمہ پیش کر رکھا ہے۔خضر کے خلاف۔ وہ یہ کہ اعزاز غلط آدمی کو ملا، اور اصل استحقاق ہنڈوی پانے کا اُن کا تھا۔اب صاحب آگے سنو۔ دو ماہ ہوئے تمہارے شہر کراچی میں کسی کام سے جانا ہوا۔بندر روڈ پر ایک حویلی دو منزلہ میں سیاحِ شرق و غرب منشی ابن انشا سے ملاقات کی۔ وہ وہاں غالباً کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں، لیعنی اس دوران میں جب جہاں گشتی کی ماندگی میں دم لینا مقصود ہوتا ہے۔وہ مصروفِ کار رہتے اور آدھ آدھ گھنٹے کے بعد کسی کارپرداز کے ہاتھ مکتوبہ رقعے اخباروں کو بھجوائے جاتے تھے۔ فقیر مدعا و مطلب نوکِ زبان پر لایا۔فرمانے لگے بھائی خضر، یہ کیا کہتے ہو کہ انعام تمہیں تا حال نہیں ملا۔کسی کتاب تمہاری پہ ملا تھا۔میں بولا ہنڈوی نہیں ملی اور اعزازی کتاب کا نام بتایا۔

انہوں نے ایک رسالہ چھاپے کا کہیں سے منگوایا اور تصدیق اس امر کی کی کہ کتاب موسوم بہ کھویا ہوا افق "پر واقعی انعام دیا گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے " بھئی خضر بات یہ ہے کہ اس گلڈ کمپنی کی تجوری بحیثیت خزانچی کے ضرور میری تحویل میں ہے لیکن مجھے کچھ کچھ یوں یاد پڑتا ہے کہ پانچ ہزار کی ہنڈوی تمہیں بھجوا دی گئی تھی۔" عرض کیا تا حال نہیں ملی۔ پوتھی دیکھ لو، بھجوائی ہوگی تو اس میں چلت میرے نام کی درج ہوگی۔ انہوں نے کچھ سوچ کر مشورہ یہ دیا کہ جمیل الدین عالی سے ملو، یا بمع آداب والقاب کے اُن کی خدمت میں عرضی اس بارے میں دو۔ وہ تمہاری مشکل حل کر سکے گا۔

بموجب اس مشورہ کے تمہارے حشمت خانہ پر قدم بوسی کو حاضر ہوا۔ خادم نے بتایا ولایت کسی کام کو گئے ہو، اور ہفتہ عشرہ میں لوٹو گے۔ نامراد، گاڑی میں بیٹھ کر لاہور آگیا۔ یہاں سے بروز یک شنبہ ۲۰ اکتوبر یہ خط تم کو لکھتا ہوں۔ یہ خط کیا ہے کشکولِ گدا ہے۔ پرسوں اسے ایک معتقد کے ہاتھ بھجواؤں گا۔ محکمہ ڈاک کا یہ حال ہے کہ اب بیرنگ خط بھی جا ہئے مستقر تک نہیں پہنچ پاتے۔ متوقع ہوں ہنڈوی کے جلد از جلد ملنے کا۔ بعد حصولِ مراد ایک قصیدہ پیرو مرشد، جلیل المناقب، عالی مقام، جمیل الدین عالی کی خدمت میں گزاروں گا۔ خود تو اس سرزمینِ سخن دفن بحور و قوافی سے ناآشنا ہوں۔ افسر الشعراء احمد ندیم قاسمی صاحب سے لکھواؤں گا۔

محترمہ مریم زمانی عالمگیر کے معاملے سے متشوش ہوں۔ خاطر جمعی اس ہیچمدان کی کرانا لازم، اس امر میں کہ بہر صورت انعام و اعزاز اس کا بدستور بحال ہے، اور آدم جی اپنے قولِ مردان پر مستقل ہے۔

ابن انشا اگر وہی آنا سے آجائیں تو میرا سلام دینا۔ ان تک پہنچا دو مفسر العصر پیر علی محمد راشدی کو سجدہ تعظیمی۔ نور الملک میر خلیل الرحمٰن کو بندگی۔ مریم زمانی عالمگیر صاحبہ کی خدمت میں مجرا۔

طالبِ کرم بندہ خضر (مرقومہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

وحید مراد کے نام ——

برخوردار نورِ چشم وحید مراد سلمہ اللہ تعالےٰ

اہا ہا، اپنے پیارے وحید مراد سے پھر ملا، یعنی پردۂ سیمیں یا بائیسکوپ پر۔ واہ کیا عجوبہ دانایانِ فرنگ نے برائے تفریح و تربیتِ عوام ایجاد کیا ہے۔ تین روپے کچھ اوپر کا ٹکٹ لو، چوبارے پر بیٹھو اور زمانہ کی حیرت افزائیوں اور نیرنگ کاریوں کا تماشا کرو۔ اس پر مستزاد تعلیمِ اخلاق و تہذیب اور درسِ عاشقی و نامرادی سیکھو۔ سچ ہے۔ میری جان، اس دنیائے رنگ و بو میں ماسوا عاشق ہونے یا معشوق بننے کے دھرا کیا ہے۔ فکرِ معاش و اندیشۂ غمِ روزگار۔ یہ بکھیڑے اگلے زمانہ کے لوگوں کو ستاتے تھے۔ آج کل ہیرو جوان قاتل و قتیل بنے ہیں۔ یعنی مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ بائیسکوپ کا ناٹک میں نہیں دیکھتا، اس واسطے کہ عرصہ پینتیس برس سے ایک ہی تماشا مختلف عنوانات سے پیش کرتے ہیں۔ داستان وہی ایک حسن و عشق، حسد و رقابت، شادی بیاہ کی۔ ہر ناٹک میں تین چار رقص، ایک قوالی، کم و بیش درجن گانے ایک دو اموات لازم۔ حیران ہوں کہ ایک ناٹک کو دیکھ دیکھ کر اس قلمروئے پاکستان کے اہالیان کا دل کیونکر نہیں بھرتا، کلیجہ کیوں منہ کو نہیں آتا۔ جہاں جاؤ تماشا گاہ پر مردوں اور طبقہ اناث کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ قطاروں کی قطاریں۔ گویا دنیا میں اور کوئی کام نہیں۔ نہ ناٹک کے بہروپیوں کو، نہ تماشا دیکھنے والوں کو۔

کل اتوار کے دن رمضان المبارک کی دو تاریخ تھی۔ میری ایک چھوٹی بچی ہے۔ پنجسالہ، ریل کا نصف ٹکٹ اس کا لگتا ہے۔ باتوں میں بڑے بڑوں کے کان کترے، اور بعضے اوقات اس دور کی کوڑی لائے کہ آدمی سن کر انگشت بدنداں ہو۔ جدید نسل کے ہر فرد کے مثل وہ بچی بھی ہے تم پر لٹو۔ اس کی ضد "بابا، وحید مراد کا فلم ستانہ ماہی دیکھوں گا"، لڑکا خود کو سمجھتی ہے اور لڑکوں کے طور بولتی ہے چاروناچار اُسے اور اپنے بڑے لڑکے برخوردار منصور کو اس ناٹک

ہیں لے گیا۔

صاحب، اس ناٹک میں تم نے فنِ نقل میں کمال کر دیا۔ ہرچند کہ فقیر وقفہ یا بزبان انگلش، انٹرول، کے بعد عالمِ خواب کی سیر کرتا تھا، وقفے سے پہلے کافی چاق و چوبند بیٹھا رہا۔ سبحان اللہ جیتے رہو برخوردار! اس کو کہتے ہیں حق ادا کاری اور نقل کا ادا کرنا۔ دم دم میں کیا زقندیں بھرتے ہو، کیا کلا پنچیں مارتے ہو۔ گویا عضو عضو میں کمانیاں لگی ہیں۔ قیاس میرا یہ ہے کہ ہیولائے سیماب ہو، یا بصورتِ دیگر ماہیٔ بے آب ہو۔

ماشاء اللہ مطرب بھی بے نظیر ہو۔ تان سینِ جدید، بلکہ میں کہوں گا تان سین پر بازی لے گئے، اس واسطے کہ وہ گاتا تھا ایک جگہ جم کے بیٹھ کر، تم گاتے ہو اچھلتے کودتے، نخلِ چمن پر چڑھتے ندی میں شناوری کرتے، پھر تان سین کا فنِ راگ و موسیقی اب قصۂ پارینہ ہو چکا۔ لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ تم موسیقی جدید کے استاد ہو۔ انجمن نامی ناٹک میں تمہارے اس گانے نے بڑا لطف فقیر کو دیا۔ بول: ———

میری بھابھی — ہو میری بھابھی، ہائے ہائے بھابھی ——— تم جیو ہزاروں سال!

مرضِ نسیان کے باوجود وہ منظرِ حیرت خیز، اور سماں تمہارے گانے کا تا حال ذہن میں محفوظ ہے۔ میرا لڑکا برخوردار منصور مجھ سے کہتا ہے کہ یہ آواز جو اپنے لحنِ داؤدی سے تم نکالتے ہو، فی الحقیقت ایک اور صاحب احمد رشدی کی ہے۔ میں باور کرتا ہوں کہ یہ اطلاع غلط ہے چونکہ ایسا ممکن نہیں کہ بولے وحید مراد اور آہنگ ہو احمد رشدی یا کسی اور مطرب کا۔ اب کل کو کوئی یہ اڑائے کہ مجرے تمہارے اور کرتب دراصل ہیں کسی اور رنٹ کے، تو میں جانوں گا کہ میری فاختہ اڑانے کے درپے ہیں۔

صاحبزادے، تم اس نوعمری میں فرخندہ اختر صاحب اقبال، ناٹک کے ستارہ فروزاں ہوئے۔ تمہارا باپ اگر جیتا ہے تو اپنے خلف کی نیک نامی و شہرت کو دیکھ کر جامے میں پھولا نہ سماتا ہوگا بہ تباؤ اس بازیگری کا مالہٗ نہ تم کو کیا دیتے ہیں۔ ایک اخبار میں دیکھا کہ بیس پچیس ہزار روپے

ایک مہینے کے کما لیتے ہو۔ بارک اللہ۔ میرزا غالب ایک شاعر تھے دلی کے رہنے والے، تم نے نام ان کا ضرور سنا ہوگا۔ کل عمر عزیز نظم و نثر میں مشقت کرنے اور وظیفہ و پنشن کی کمی کا رونا رونے میں بسر کی شراب قرض کی پیتے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اس شاعر بے مثال وسحر بیان کو اکھتر برس کے عرصہ حیات میں جو اس نے اس دنیا میں کاٹا مجموعی اتنی رقم مرتبانِ عالی شان و سرکار انگلیشیہ سے مرحمت نہ ہوئی ہوگی جتنی تم ایک ماہ میں پیدا کر لیتے ہو۔ پھر نام تمہارا زبان زدِ خاص و عام۔ شہرتِ کامل تم کو حاصل۔ طبقہ اناث میں باختصاص تم بلا شرکتِ غیرے مقبول و محبوب۔ میرزا غالب بے چارے کو اپنی زندگی میں ماسوائے چوہدری عبدالغفور، میر مہدی، میرن میاں، منشی ہرگوپال تفتہ وغیرہم اور چند والیانِ ریاست کے کہ جن کے آموں کے باغ تھے کسی نے پوچھا تک نہیں —

کل دوشنبہ کے روز پہر دن رہے یہ نامہ تمہیں لکھا۔ آج بیرنگ ڈاک میں بھیجوں گا، اگر ٹکٹ کا کہیں سے لفافہ مانگ لایا۔ اس کے صلے میں یہ انعام دو کہ ایک درجن مری لنڈن بیئر کا کریٹ بسبیلِ ڈاک ترسیل کر دو۔ بلٹی کی رسید ساتھ ہی بذریعہ رجسٹری لفافے میں ملفوف بھجوا دو۔ یہاں کا اسٹیشن ماسٹر میرا صورت آشنا ہے۔ جواب لکھنا اس خط کا ضرور نہیں، اور مجھ کو لکھو گے بھی کیا؟ نہ میں چنتا جان نہ میں منتا جان۔

ہماری بھابھی کو میری دعا کہہ دینا۔ وہ جئیں ہزاروں سال۔ تم تو جیو گے ہی۔ روزے رکھ رہے ہو گے۔

عاجز: خضر (مورخہ انوار، ۲ رمضان، ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اے ایم قریشی کے نام—

قبلہ، تسلیمات!

آج صبح اخبار "امروز" میں خبر دیکھی کہ معلم الملک عبدالمجید قریشی صدر امین قیوم خاں مسلم لیگ بمع اپنے چند بھائی صاحبوں کے گرفتار ہوئے اور زندانِ کراچی میں ان کا مسکن بنا۔ توجیہہ مزید یہ تھی کہ آپ پر ایک مقدمہ ایک درس گاہ کے عملہ کی رقومِ سرمایہ مخصوص میں خورد برد کرنے کا ایک مدت سے عدالت میں زیر سماعت تھا۔ بیچ میں فوجی کورٹ نے اس کو اپنی عملداری میں لیا، اور فوری احکام آپ کی اسیری کے صادر ہوئے۔ اس خبر سے طبیعت سارا دن متوحش رہی۔ اللہ اللہ کیا زمانہ آیا ہے۔ اہلِ تموّل و موقر و معزز لوگوں پر الزامات و اتہامات قسم قسم کے دھرتے ہیں اور پکڑ کرے جاتے ہیں۔ صاحب! یہ قیامت کی نشانی ہے۔ آپ گو متموّلین میں بظاہر گنے جاتے تھے اہل اللہ اور ملک و ملّت کی ناموس پر مر مٹنے والے! اس ریاستِ مسلمین کے استحکام و تحفظ کا درد رکھتے تھے۔ ضیغمِ سرحد، نصرتِ جنگ سردار الملک عبدالقیوم خان کے مقربین بارگاہ میں تھے۔ حیران ہوں کہ آپ کی ماخوذی پر عرش نہ ہلا، نہ زمین پہ بھونچال آیا۔ کج روی افلاک پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوں۔

اچھا صاحب! دل پر ملال نہ لاؤ، حبِ وطن کی سزا پائی۔ اور سرخرو ہوئے۔ جہاں کہیں بھی رہو ائمہ صلوٰۃ اللہ علیہم کی امان میں رہو۔ دن رات میں روٹی کے بار دیتے ہیں، یا خوان پوش طعام باجازت حکّامِ زنداں گھر سے منگواتے ہو؟ مسکین خضر کا ارادہ بھی جلد تمہارا قرب حاصل کرنے کا ہے۔ یہاں بھی اب تہی دستی و مہنگائی نے ہوش و حواس گم کر رکھے ہیں۔ پارسی کی بیئر آٹھ ساڑھے آٹھ روپے ہیں۔ معاذ اللہ—! سچ کہتا ہوں ایک ہفتے سے کافر منہ سے نہیں لگی۔ ذائقہ لکوئر کا بھول گیا۔ آبِ لائیم گرم پانی صراحی میں سے انڈیل انڈیل پیتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

ابھی یہ خط لکھا۔ ابھی محمد شریف چپڑاسی کے توسط سے اسے بیرنگ ڈاک سے معرفت

اخبار "امروز" بھیجوں گا ـــــ امیدوار ہوں کارپردازانِ اخبار اسے آگے مکتوب الیہ کو جائے اقامت پر پہنچا دیں گے۔

اپنے بھائی صاحبوں کی خدمت میں فقیر کا کورنش پیش کیجیے ـــــ

والسلام

خضر (مرقومہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء دوشنبہ کا دن)

مجید نظامی، ایڈیٹر "نوائے وقت" کے نام ـــــ

مصلح الوقت، رئیس التحریر "نوائے وقت"، کی خدمت میں فقیر خضر کورنش بجالاتا ہے۔ حضرت برادر کو چلے نے برادرِ بزرگ کا کام تمام کیا جب تمہارے برادرِ مرحوم زندہ تھے، ان کے اداریے تمہارے ورقِ اخبار میں پڑھتا تھا اور وجد کرتا تھا۔ فی الواقع منشی طلب بلا کا قلم و ذہن رکھتے تھے۔ البعاض کے نزدیک ان کی تحریر کلام وحی ہوتی تھی۔ فقیر کو اس معاملے میں کچھ اشتباہ رہا۔ مابعد ان کے انتقال کے تم نے مطابع و اخبار کا انصرام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اداریہ نویسی میں مشق بہم پہنچائی۔ آہنگ و ڈھنگ ہو بہو اپنے بھائی کا اختیار کیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کے لئے نگارشِ حضرت بھی بمنزلہ وظیفہ روحانی ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ منشی تم بھی برے نہیں۔ فکرِ سلیم البتہ ارشاداتِ گرامی کو قبول نہیں کرتی، اس واسطے کہ سلطانِ کابل محمود غزنوی کا عہد کئی سو برس آگے اختتام پذیر ہو چکا اور تم مع اپنے اخوان الصفا کے ہنوز اسی زمانہ گزشتہ میں جیتے ہو۔ آپ پہ معلوم ہو کہ یہ بیسویں صدی ہے، ہجری کی چودھویں صدی! یعنی روزِ قیامت جلد آیا ہی چاہتا ہے۔

مقصودِ مکتوبِ خفیہ گوش گزار کرنا ہوں۔ ہر چند کہ پرچہ تمہارا "نوائے وقت" ایک عرصے سے میرے زیرِ مطالعہ نہیں رہا، چار روز ہوئے اسے خریدا۔ استعجابِ دلی تھا کہ اس فتنہ و فساد کے زمانے میں تمہاری نہجِ فکر کیا ہے اور کس ڈھنگ پر رشحاتِ قلم کو رواں کرتے ہو۔ یہ ۲۰ شوال

المکرم مطابق ۷ دسمبر کی تاریخ تھی۔ دن جمعرات کا تھا ورق محررہ تمہارا بعنوان، مخلوط وزارت کی ذمہ داریاں، پڑھا۔ طبیعت میں اس سے شدید برہمی ہوئی۔ ریاست پر ابتلائے عظیم اور تم کو اپنی تحریر میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی تخفیف و تذلیل کرنے سے غرض۔ فرماتے ہو۔

ہمارے ایک رہنما جو کسی طرح مغربی حصے کے دو صوبوں میں انتخابی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے تھے اور اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ عوامی لیگ کے خلافِ قانون قرار دیئے جانے کے بعد بلا شرکتِ غیرے اقتدار کے دعویدار بن گئے تھے۔ وہ قومی اسمبلی کے ضمنی انتخاب کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور بلا مقابلہ کامیابی کو بسکٹوں کی تقسیم کا نام دیتے رہے۔ اگرچہ چھ، بسکٹ، خود انہوں نے بھی حاصل کر کے اپنی پارٹی کو ملک گیر حیثیت دلا دی تھی، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔"

حضرت! ــــ اس اقتباسِ عبارت میں" کسی طرح کامیابیوں سے ہمکنار ہو گئے تھے" خوب قابلِ داد ہے ۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے، اس کو کہتے ہیں۔ آپ کو یہ غصہ و رنج ہے کہ انتخابات روایتِ دیرینہ پر کیوں نہ ہوئے۔ آپ کے میکا دیلیٔ اعظم کیوں نہ سرخرو ہوئے۔ ما بعد اس کے یہ مانیے گا کہ مشرقی حصے میں جو ضمنی انتخابات ہوئے ان کی حقیقت سب جانتے ہیں۔ قوم کو ہنسی کا موقع بہم پہنچا۔ کئی انتخابات کی نشستوں پر تو امیدوار بھی غائب ہوئے۔ جناب بھٹو نے اگر ان کو 'بسکٹوں کی تقسیم' کہا، تو کچھ غلط نہ کہا۔ چھ بسکٹ انہوں نے لوٹ لئے اس واسطے کہ کہیں اندھا سارے کے سارے بسکٹ اپنوں کو یعنی اہلِ طہارت کے مابین نہ تقسیم کر دے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ 'بسکٹوں کی تقسیم' والے فقرے کی داد دیتے۔ جان رکھتا ہے بے روح نہیں!

آگے رقم طراز اس طور سے ہوئے:

نقلِ عبارتِ اداریہ:

" بین الاقوامی سیاسی محاذ پر ذمہ داری مسٹر بھٹو نے سنبھالی ہے۔ وہ چھ

سال پہلے (ستمبر ۶۵ کی پاکستان بھارت جنگ میں) بھی یہ فریضہ سرانجام دے چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اگر محنت و جانفشانی سے کام لیں۔ (اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا نہ کریں) تو وہ پہلے سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ازیں پیشتر وہ آمر ایوب خاں کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ گئے تھے۔ اب وہ قومی حکومت اور ایک منتخب عوامی نمائندے کی حیثیت میں نیویارک جا رہے ہیں۔ اس بار وہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ وزارت خارجہ کی زمام کار سنبھالنے سے پہلے ہی اقوام متحدہ میں امریکہ اور چین کے زیر اثر بین الاقوامی رائے عامہ کا پانسہ پاکستان کے حق میں پلٹ چکا ہے اور دنیا کے ممالک پاکستان کی حق پسندی کے قائل ہو چکے ہیں...... اس کا کریڈٹ صدر یحییٰ کو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر بھٹو اپنے طرز عمل سے پاکستان کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ کریں گے، کمی نہیں۔ مسٹر بھٹو کے اقوام متحدہ میں جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس اپنے پرانے دوست، سورن سنگھ کے خلاف نکال آئیں گے اور اُن کے پاکستانی حریف یا حلیف سیاسی رہنما شاید نسبتاً محفوظ رہیں...۔"

بھٹو اقوامِ متحدہ میں سورن سنگھ خالصہ کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہیں یا نہیں، تم نے عبارت مندرجہ بالا میں بھٹو کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک ایک فقرہ تمہارا ایک نشتر۔ چھرے اور گراپ گھونپتے جاتے ہو۔ حضرت، پہلی کارکردگی بھٹو صاحب کی اقوام متحدہ میں سب کو معلوم ہے۔ ایک عالم میں سب نے تسلیم کیا کہ اقوام متحدہ میں ایسی پُر اثر تقریر اپنی ریاست کے حق میں کسی مندوب نے پہلے نہ کی۔ اور یہ جو کریڈٹ صدر یحییٰ کو آج ہر چیز کا دیتے ہو، خیال رکھئے گا کہیں کل کو ہر بات کا مورد الزام ان کو ٹھہرا کر اور ان کے لہو کے درپے ہو۔ حضرت آپ مدعی ہیں صائب الرائے ہونے کے، اپنی رائے کو کبھی

نہ بدلنے کے یہ دعوی آپ کا لغو اور پوچ۔ فقیر نے آج تک کوئی صحافی واستاد سیاست ایسا نہ دیکھا کہ موقع و محل کے مطابق عقیدے اپنے میں تصحیح نہ کرے۔ آپ کے ایک دوست ہمدم صحافی آزاد زیڈ اے سلہری، ہر مہینے کے بعد پینترے بدلتے ہیں۔ چڑھتے آفتاب کی پرستش ان کا واحد مقصدِ حیات۔ جس نے بوٹی ڈالی اس کے ہمراہ ہو لئے۔

بقیہ اداریہ فقیر بخوفِ طوالت نقل نہیں کرے گا۔ اس میں تم نے ففتھ کالمسٹ بھارتی ایجنٹوں اور کمیونسٹوں اور تخریب کاروں کے لتے لئے ہیں۔ خوب انداز ہے ایک طریقے سے بھٹو صاحب کو مطعونِ غضب کرنے کا۔ بھٹو آپ کو اچھے نہیں لگتے: بس تمہارا اور تمہارے اخوان کا چلے تو ان کی کھال ادھیڑ ڈالیں۔ آپ کے محبوب صاحب الممتاز نواب ممتاز محمد خاں دولتانہ ٹھہرے۔ واقع میں فقیر بھی ان کو توحید کی فروزندہ شمع اور مستغرق مشاہدہ ذات جانتا ہے۔ تم ان کے اور ان کی جماعت کی توصیف میں کہتے پھرتے ہو کہ صرف وہ ایسے لوگ اس ریاست میں ہیں، جن کو اسحکام ملکی کے لئے جھاڑو بھی دینی پڑے وہ اس سے گریز نہیں کریں گے سالللہ اللہ یہ کیا کہتے ہو۔ ہمارے نواب صاحب اور خاک روبی کا تذلیل کن پیشہ اختیار کریں۔ یہ نوبت کیوں آئے گی؟ دولت و اقبال ان کا مدام رہے۔ جھاڑو دیں ان کے دشمن! حضرت نے کہیں دیکھا ہو گا کہ فغفور چین ماؤزے تنگ اور وزیر اعظم چو این لائی نے پیکنگ کے بازاروں میں کئی بار جھاڑو پھیری۔ خاک روبی دستور ہے اہل کفار اور پنج لوگوں کا، نہ کہ اہل اسلام کے اصحابِ عالی مقام کا۔ بھٹو صاحب کے متعلق یہ کہتے تو باور کر لیتا، کہ وہ بھی بعضوں کے نزدیک اہلِ کفار میں سے ہیں مسلمین میں سے نہیں۔!

تم کو دعویٰ ہے سلطان جابر کے سامنے کلمۃ الحق کہنے کا۔ بھائی یہ کام ہے بے حد مشکل۔ ہم نے تو اس ریاست میں ماسوا قاضی القضاۃ رستم کیانی کے کسی کو کلمۃ الحق کہتے نہ سنا۔ جب نواب خدا ایوب خاں بہادر کا دورِ حکومت تھا۔ اور آپ اور آپ کے ممدوح نواب صاحب گھروں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے، یہ مردِ آزاد دلیر بے ٹوک انداز دل نشیں میں

دل کی بات کہتا پھرتا تھا۔ یہ جانتا ہوں کہ تم نے جبّار الملک نصرت الدولہ نواب کالا باغ مرحوم کی خوشنودیٔ خاطر ہمیشہ اُس زمانے میں پیشِ نظر رکھی۔ ان کے قدم آئے دن سرِ شام دیکھتے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر مزاجِ مبارک کی خیر پوچھتے تھے۔ تمہارے اخبار نے ہمیشہ ان کی دینداری اور پارسائی کی تحسین کی۔ عقل مندی کی! مصلحتِ وقت تھی، ورنہ مطبع ضبط ہو جاتا۔ اچھے پہلوان کے ہاتھوں پٹائی کرا دیتے۔ زندان میں ڈالتے۔ کلمۃ الحق بے شک کہو۔ حاکمانِ ذی اقتدار سے بگاڑ ہرگز مناسب نہیں۔ اہلِ اسلام کا شیوہ یہ نہیں۔ ممدوح نے انتقال برضائے الٰہی کیا۔ سمجھتا ہوں آپ ضرور برائے تعزیت کالا باغ پہنچے۔ اکثر مسلیمن ان کے پاؤں دھو کر پینے والے اور جن پر ان کے احسانات تھے کنّی کاٹ گئے۔ حاکمِ اعلیٰ کا ڈر غالب تھا۔ جانتے تو وہ بُرا مانتے۔ وہ ان سے، بعد ممدوح کی سبکدوشی از منصبِ گورنری کے، کدورتِ دلی رکھتے تھے۔ خود انہوں نے رفیقِ وفادار کی رحلت پر ایک لفظ افسوس کا نہ کہا۔ رنج البتہ ہوا ہوگا۔ اس کو بُھلانے کی خاطر دو روز کے بعد خطہ سندھ میں تیتر کا شکار کھیلنے چل نکلے۔

حضرت! تم عقلِ کُل کے استاد ہو۔ میں سیدھی بات کرتا ہوں۔ مگر خیال میں آپ کے جب آئے گی کہ تاریخ عالم کا دیدہ و دل روشن کر کے مطالعہ کرو۔ اقرار خود کرو گے کہ ریاست کی حالت جو ردی ہوئی اور گدھے کے ہل اس کے شہروں میں پھرے، تو اس میں بڑی وجہ موجودگی کج فہم مسلیمن کی تھی۔ تم اور تمہارے ہم خیال راہِ ترقی میں حائل ہوئے۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی فتوحات کا سبق دہراتے رہے۔ وجہ نہیں پاتا آپ اصحاب کے کبھی ہوش مند ہونے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی آپ کی عینک کے شیشوں پر دُھند کے دُھلنے کی۔

نسخہ رفعِ اعوجاجِ ذہنی سن لیجئے۔ "ٹائن بی کی تاریخ اور برٹرینڈ رسل صاحب کی کتب اس ریاست میں کہیں سے دستیاب ہو جائیں، تو طوعاً کرہاً پڑھ ڈالیے۔ یہ دونوں اصحاب ہیں تو فرنگی، بلکہ انگلستان کے رہنے والے۔ لیکن قابل اچھے ہیں۔ آپ کے مجتہد العصر

سے کہیں زیادہ وسیع النظر و بلند منظر! فقیر دعا کرے گا کہ آپ کی عینک کی دھندان کے مطالعے سے چھٹ جائے تعصبات و توہمات کے کنویں سے نکلو۔ امید البتہ تمہارے سدھرنے کی موہوم ہے۔

معاف کیجئے گا، فقیر کے حواس بجا نہیں۔ نہ حافظہ رہا۔ اکثر الفاظ بے مقصد لکھ جاتا ہوں۔ باون برس کی عمر ہوئی۔ یاد اللہ کا زمانہ ہے۔

اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ دفتر جا کر خط کو سرنامہ کر کر چپراسی کو دوں گا۔ وہ ڈاک میں ڈالے گا۔ پیش گاہِ نواب دولتانہ صاحب بہادر میں میری بندگی پہنچے۔ ان کو کہیئے گا کہ عرض داشت ہنڈوی کے بارے میں ان کی خدمت میں مع قصیدہ بعد میں آئے گی۔ جناب شوکت الملک سردار شوکت حیات خاں صاحب کو سلام و نیاز۔ قاضی القضاۃ کابوس صاحب کو سلام۔

استزاد۔ اس تاریخ کو یہ مکتوب ڈاک سے رہ گیا جیب میں پڑا رہا۔ آج خبر سنتا ہوں کہ افواجِ ہند ڈھاکے میں داخل ہوئیں۔ ڈھاکہ عجیب نگر ینا۔ کہہ نہیں سکتا، دل ملول ہے قیاس کرتا ہوں کہ جنگی ترانے اور قوالیاں ریڈیو پاکستان کی ہم کو سے بیٹھیں۔ پروردگار تمہیں اور سب خوبانِ روزگار کو آگہی بخشیں۔ کُل مجمع عجوبہ ہستی کو سلامت رکھیں۔

حجرے میں تنہا بیٹھ کر روتا ہوں ——— تیرہ بخت: خضر

ریڈیو پاکستان کے نام ——

اہا ہا! ہمارا محبوب ریڈیو پاکستان طرب کناں ہوا۔

اڈو بھائی، مزاج تو بخیر ہے حضور کا — گدجو، غراؤ، چھکو، یہ ریڈیو پاکستان ہے آج جمعہ کا روز ہے اور دسمبر کی چوبیس تاریخ۔ اس وقت مغربی پاکستان میں شام کے چھ اور مشرقی پاکستان

بس سات بجے ہیں ـــــ اعجاز ایک چابی کا ہے، گھاؤ اور اخبار و افکار و مرثیہ گوئی کا سرور اٹھاؤ یا ـــــ

بھائی صاحب، کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کی آواز سنتا ہوں۔ ریڈیو کے صندوق پر ضرب کاری لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ اب موجدِ صندوق نے ایسی صنعت اس میں رکھی ہے کہ چابی کسی اور ہند سے پر گھماؤ اور یورپ وامریکہ وہند کی بولی سن لو۔ صندوق جواب تک توڑ پھوڑ سے مامون رہا تو اس کی وجہ محض یہ ہے آپ پر غالباً یہ حقیقت امرِ عیاں نہیں، ورنہ اپنے طور بدلتے۔ میاں کوئی آپ کی آواز سننے کو مجبور نہیں جس کا دل چاہے شوق سے چابی مروڑے اور لندن و دہلی و واشنگٹن کی سیر کرے۔

پھر بھی ایامِ جنگ میں بوجہ ضعفِ قلبی تم کو سنتا تھا۔ دھڑ رگڑا جیسے ترانے اور سیف و ساز کے باب میں دادو لوہار صاحب کی فصیح گوئی سے تقویت پاتا تھا۔ متوقع ہوا کہ ہم جلد دلی پہنچیں گے لال قلعے پر رسم پرچم کشائی عمل میں آئے گی۔ اہلِ انگلستان کی نیک بخت بی بی سی اور ہنود کے ریڈیو سے بھول چوک میں کوئی منحوس خبر کان میں پڑتی تھی تو دل قدرے مشوش ہو جاتا۔ تمہاری خبروں کے پاٹ دار اعلانچی اور دادو لوہار پر مجھے مکمل اعتبار ا ـــــ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، آپ کی باتوں میں آگیا۔ مطمئن تھا کہ مشرقی خطے میں گھمسان کے رن ہوتے ہیں اور کفار منہ کی کھاتے ہیں۔ آپ نے تو کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، بی بی۔ بی۔ بی۔ سی اور شریمتی آکاش وانی نے بتا دیا کہ ہندوستان کی فوجیں ڈھاکے میں داخل ہوگئیں۔ نوّے ہزار اہلِ اسلام نے ہتھیار ڈالے۔ دو دن کے بعد پہلی بار بسبیل تقریر دل پذیر حاکمِ اعلیٰ اکمیسن جنرل آغا اے۔ ایم یحییٰ خاں اس واقعہ کی آپ نے تصدیق کی۔ سبحان اللہ! عوام ریاست کو صحیح خبر سے ہمیشہ بے خبر رکھنے کے حیلوں میں آپ نے سدا سرگرمی دکھائی۔ لاکھوں روپے کی رقم جو سرکار آپ کی کارکردگیوں کے صلے میں ہر سال خرچ کرتی ہے، مصرف اس کا فقط چشمِ بینا میں دھول جھونکنا ہوا۔ مزید یہ کہ بھائی صاحب آپ نے علاقہ زیادہ تر عالمِ ارواح سے رکھا ہے، عالمِ آب وگل سے

نہیں۔ فقیر اچھا بھلا، زندہ دل، خوش اندیش شخص تھا، تمہاری مستقل مرثیہ گوئی، قل خوانی اور قوالی نے جلا بھُنا دیا ہے۔ انسان کی صورت سے بیزار ہوا۔ دنیا کے کاروبار سب ہیچ ہوئے، جہاد و شہادت منزلِ حیات قرار پائی۔ آپ نے بھی لن ترانی و لاف زنی میں حدیں پھلانگیں۔ ساتھ اس کے چار پہر کا رونا پیٹنا جاری رکھا۔ بھائی جی، یہ ہدایت آپ کو کس صاحبِ بے شعور نے دی کہ اس طور سے ریاست کے عوام کا حوصلہ بڑھے گا۔ کلامِ اقبال لاہوری کی مٹی خوب پلید کی۔ مرحوم و مغفور کو اس بات کا علم ہوتا کہ کلامِ بلاغت نظام اُن کا شکل قوالی کی اختیار کرے گا اور آپ کے ہاتھوں اس کی یہ گت بنے گی تو وہ کسی اور خطے میں پیدا ہوتے۔ اب ملنیے یا نہ مانیے یہ صورت ہوئی کہ ادھر آپ کے اعلانچی صاحب نے یہ اعلان کیا کہ اب علامہ اقبال کی فلاں نظم زنگو قوال سے سنیئے، اُدھر لوگوں نے چابی کنغار کی آکاش وانی پر پھیری۔ بھائی میرے، فطرتِ انسانی کے تقاضے آپ بھولے۔ ہر وقت کی پند و موعظت طبع سلیم کو گوارا نہیں۔ فرض کیجیے گا کہ اہلِ انگلستان کی بی بی۔ بی بی سی ہر آدھ گھنٹے کے وقفے سے خاتم شعرا حضرت ولیم شیکسپیئر علیہ السلام کی تمثیلوں کے حصے گنوانے لگے۔ کب تک لوگ اس کو سنیں گے۔ دو دن یہ اشعار سننے کے بعد کیوں نہ چیخیں گے "شیکسپیئر سے ہم کو بچاؤ۔"

اس باب میں ایک قصہ سنو ــــ انشا پردازِ فرنگ اے جی گارڈنر صاحب اپنے ایک مضمون بعنوان، چلّہ کمان کو ڈھیل دینے پر، کے آغاز میں رقم طراز ہیں: فرانس کے ایک محاذ پر اتحادیوں اور قیصرِ جرمنی کے لشکر آمنے سامنے نبرد آزما تھے۔ فضا توپوں کی گرج سے لرزتی تھی۔ زور کا رن تھا کشتوں کے پشتے لگے تھے۔ بارے گولہ باری کچھ تھمی تو دو سپاہیوں کے چہرے، کالک اور دھول سے سیاہ، ایک خندق میں سے اُٹھے۔ اور ایک نے دوسرے سے کہا "بل، میرے یار، میں کہتا ہوں جان کو ڈوروتھی سے شادی کر لینی چاہیئے تھی"ــــ بھائی صاحب، دیکھتے ہیں آپ، اس جنگ و جدال، اس موت کی گرم بازاری کے دوران بھی دو سادہ دل عام سپاہی، اپنے ایک ساتھی کی محبت کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ گویا کمان کے چلّے کو ڈھیل دیتے تھے۔

موت سامنے تھی اور وہ بے پرواہ تھے۔ ممکن تھا کہ دوسرے لمحے کوئی گولا اُن پر آن گرتا اور وہ کھیت رہتے۔ آپ نے رونے پیٹنے اور نالوں کا جو سلسلہ دن رات قائم کیا، تو نہایت سادہ لوحی دکھائی۔ عام لوگوں کا تو ذکر کیا۔ محاذِ جنگ پر لڑنے والے سپاہی بھی ہر دم جنگی ترانے اور دھواں دھار تقریریں سننا برداشت نہیں کرتے۔ ہم سب کو داد دینے گا۔ آپ نے انحلاط کی باتیں کرنے اور ہماراجی بہلانے کے خلاف قسم کھا رکھی ہے۔ ہمارا ہی دم ہے کہ صبر و ثبات سے آپ کی موعظتِ پیہم کو سنتے ہیں حضرت آپ کے سامعین سب صوفی صافی نہیں، جاہل المجہول نہیں۔ نشاہین کو ہی نہیں جو آپ کی مسلسل وعظ بیانی پر وجد کرتے رہیں، چنانچہ وہ چابی اور مقاموں پر گھماتے ہیں۔

جو خبریں سناتے ہو ان کا حال سنو۔ اعلانچی تمہارے ازل سے وہی پھٹے ڈھول کی آواز والے۔ سمع پران کا لہجہ گراں خبروں کی ترتیب بے روح، بدوضع۔ کسی وزیر باتدبیر نے مزارِ قائداعظم پر فاتحہ پڑھی۔ تم کو سرمایہ آرائشِ گفتار بہم پہنچا۔ اس واقعہ کو سرِ خبرنامہ بنایا، اور پانچ منٹ اس کی تفصیلات بتلانے میں خرچ کئے۔ واہ صاحب، یہ درویش خضر بھی جب پچھلے دنوں کراچی گیا، قائداعظم کے مزار پر فاتحہ خوانی کو حاضر ہوا۔ اس کا ذکر تو آپ نے اپنے خبرنامے میں نہ کیا۔ وزیر باتدبیر کا فاتحہ پڑھنا کیونکہ خبرِ اہم بنا۔ فقیر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا طور ہے۔ قوم کے عوام الناس کو آپ نے ضعیف العقل اور بدھو جان رکھا ہے۔ کوئی حاکمِ اعلیٰ آئے یا جائے، آپ کا آہنگ ایک، ڈھنگ ایک۔ مرض دراصل تمہارا کہنہ ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے۔ تندرست ہونا تمہارا معجزہ عظیم ہوگا۔

اور صاحب! ــــ یہ جو تم نے کٹ ملّاؤں کی فوج ظفر موج ہماری تلقین و ہدایت کے واسطے جمع کر رکھی ہے، اس سے غرض و غایت کیا ہے؟ ــــ بست و سہ سال سے، ہم ان کے ارشادات و وظائف سنتے ہیں۔ قوم کے فکر و عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ عزیزم آپ نے اپنے جی میں یہ ارادہ تو نہیں کیا کہ ہم سب کو کٹ ملّا بنا کر دم لوگے۔ کن قصّوں میں ہم غریبوں کو

پھانستے ہو۔ فقہ عوام الناس کو پڑھانے سے کیا حاصل ہے۔ اس کے لیے مساجد و جوامع موجود ہیں۔ بھائی تم طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ و افسانہ پڑھاؤ جو لوگوں کو آگہی ہو۔ آدمی بنیں۔ اس بیسویں صدی میں جینے کا ڈھب سیکھیں۔ بی بی سی اور دوسرے خطّوں کے نشری پروگرام بھی آپ سنتے ہوں گے۔ ان کی خبریں بھی تمثیلیں بھی، سیاسی مباحث بھی۔ وہ اتنے متنوّع، دلچسپ و فکر انگیز ہوتے ہیں کہ سننے سے طبیعت لطف اندوز ہوتی ہے۔ بی بی سی کو حکام و عمال کی کارگزاریوں سے شغف نہیں۔ آپ کو ماسوا اس کے اور وظیفہ خوانی کے کچھ اور کام نہیں۔ کیوں بھائی، ہم سچ مچ اتنے ہی بے لیاقت، ناقص العقل اور بے شعور ہوئے کہ ڈھب سے دوسروں کی نقل بھی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ظریف الملک احمد شاہ بخاری المتخلص بہ پطرس رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون یاد آتا ہے جس میں اس غریب نے اہلِ ہندوستان کی ہر کام میں بد وضعی، بے سلیقگی، بھونڈے پن کا رونا رویا ہے کہیں مل جائے تو پڑھیے گا۔ آپ کی صورت کے لئے بمثل آئینہ ہوگا۔ تمہارا قصور نہیں میاں ریڈیو پاکستان صاحب، تم کو نہیں روتا، سب اہلِ ریاست کو رونا ہوں۔

حضرت خفا نہ ہو جیئے گا۔ میں اب آپ کو بالکل نہیں سنتا۔ بہت سوں دوسروں کا بھی یہی حال ہے۔ آپ بتائیے گا فقیرِ حضر کیوں نہ بی بی سی کی کوئی تمثیلِ دل پذیر، مباحثۂ علمی سنے، اور کیوں آپ کو سن کر غیظ و غضب سے پیچ و تاب کھائے۔ !

میری بلا اب آپ کو سُنے!

آپ کے نام بس اتنا ہی پیام ہے۔ دیکھو اپنا پورا نام و پتہ نہیں لکھا۔ بھلا دیکھوں تو سہی، تم ملا جیاں اس بیانِ حقیقت پر کس کو سناتے ہو؟ ——

مرقومہ جمعہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء

اشفاق احمد کے نام ——

میرے دادو لوہار! —— کیا پوچھتے ہو خضر علیہ السلام کا احوال۔ مدت سے لکھنا لکھانا ختم ہوا۔ پڑھنا یکسر موقوف۔ دن بھر کولہوئے روزگار میں جتا رہتا ہوں۔ آئے گئے کی بک بک جھک جھک۔ ناشکری البتہ نہیں کرتا۔ حاکمِ وقت نے دفتر میں ایک میکانکی آلہ دے رکھا ہے۔ وہ وحدتِ گرما میں کوہسار کی یخ بستہ ہوا دیتا ہے۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر موٹر گاڑی میں جاتا آتا ہوں۔ گھر لوٹنے پر معرسی کے تتبّع میں ثمرہائے بیش رس کھاتا ہوں۔ مابعد بی بی نیک بخت اور لڑکوں بالوں کو گاڑی میں گھمانا میرا روزمرہ ہوا۔ سیر کی۔ واپس آیا۔ کھانا کھایا۔ آلہ ٹیلی ویژن پر بیٹھ گیا۔ لکھوں کس وقت؟ پڑھوں کب؟ یہ راز زندگی گزارنے کا تم نے بھی اپنایا ہے۔ سوچتے ہو گے آگے جو کچھ کیا جھک ماری، بھاڑ جھونکا۔ حق یہ ہے کہ منصب کا ہاتھ آنا مع موٹر گاڑی رکارخ لعلیں، —— اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ کاوشِ سخن گزاری سب لغو، کچھ حاصل نہیں ——!

تمہارے صدر انجمن ترقی اردو بورڈ ہونے پر تہنیت دیتا ہوں۔ اب یقین ہے کہ جلد قلمدان گوہر بار وزارتِ تعلیم سنبھالو گے۔ مدارجِ عظیم اس عالمِ دار و گیر میں تم سے نبض شناس ہی پاتے ہیں۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ تم نے قصہ گوئی و فسانہ طرازی کی وادی میں قدم دھرا تھا۔ مجموعہ تمہارے قصوں کا بنام "قصہ ایک محبت کا" انطباع ہوا۔ اس نے نوید دی کہ یوسفِ کنعانِ سخن مکتب خانے سے نکل کر تخت فرماں روائی ادب پر جلوہ گر ہوا۔ چنانچہ جشن ہوئے، ڈھول تاشے بجے۔ گھر گھر شیرینی تقسیم ہوئی۔ اردو کی نثر میں تمہارا پایہ اساتذہ نے تسلیم کیا۔ سحر بیانی کلام شاہد معنی کے واسطے پیرایۂ گراں بہا بنی۔ اس زبان میں ہمینگوے ہونے کی تم نے گویا ٹھانی۔ مگر ہیہات، کوئی گربۂ سیاہ تمہارا راستہ کاٹ گئی۔ نیرِ سیاہ اقبال نے بہکایا۔ کون جگر کاوی تسخیرِ حُسنِ سخن کرے۔ کیا حاصل ہوگا۔ صدر بنو۔ کارخ بناؤ۔ ٹیلی ویژن پر سج دھج دکھاؤ۔

تیر افگنی کے تماشے کے مہتمم و منصرم بنو تلقین شاہ اور دادو لوہار کا روپ دھارو۔

یہاں، گو کہ تم پہلے سے شکیل و جمیل ہو۔ خدا جانے کیا بات ہے تمہاری صورت کبھی کبھار نظر آتی ہے تو آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوں۔ باور نہیں کر پاتا کہ ان رسالوں "گڈریا"، اور "عرش منور" کا مصنف سحر بیان یہ شخص ہے۔ تم سے شکوہ کیوں کروں۔ عطیۂ خداوندی گنوانے کا!— فقیر خضر کو بھی یہی سانحہ درپیش ہوا۔ وہ مناسبتِ سخن، تمنائے کمال خواب ہوئی۔ شاید تم اور ہم حق پر ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ خالی سخن طرازی میں رکھا کچھ نہیں۔ جینے کے لئے کچھ تندرستی چاہیے ساتھ فارغ البالی کے۔ موٹر گاڑی اور مخملی بستر ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ۔ قصہ گوئی وہ اصحاب کریں جو سعادت حسن منٹو کی طرح عارضۂ خبط میں مبتلا ہوں۔ سر پھرے ہوں۔ خود قرض کی شراب پئیں اور بی بی بچوں کو بھوکوں ماریں— ہا! ہا!———

لیکن صاحب یہ دادو لوہار کے روپ میں لشکرِ ہنود کو کوٹ کر برادہ بنا دینے کے بعد آپ نے اپنی دکان یک لخت بڑھا کیوں دی؟———

جو کچھ لکھا ہے، بادلِ ناخواستہ لکھا ہے۔ سلسے مجذوب کی بڑ جانو! چھوٹی بچی کہتی ہے: بابا آؤ، کھانا کھاؤ۔ اب کھانا کھانے جاتا ہوں۔ پھر کبھی مل بیٹھیں گے اور بختِ تیرہ کا ماتم کریں گے۔

اپنی بی بی قدسیہ بانو صاحبہ کی خدمتِ اقدس میں فقیر کا سلام و نیاز دو—

خفقانی خضر

مرقومہ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء

مولانا احتشام الحق تھانوی کے نام———

پیر و مرشد— بندگی۔

مکرمت نامہ بہ صفحۂ ورق اخبار جنگ، نظر افروز ہوا۔ مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں۔

مسائل دینی و فضائل احکامِ شرعی کے بیان میں تمہارا قلم مرکبِ سبک رفتار ہے۔ دم نہیں مارتا، تھکتا نہیں۔ سبحان اللہ! نماز و روزہ، نکاح و طلاق کی تقریر مع توضیح و تفسیر محققانہ کس لطف سے ادا ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطانہ بحور العلوم ہو۔ چاہِ بابل روحانیت کا ہو کہ تھاہ کا پتہ نہیں، آفتاب تابان معرفت کے ہو۔ تحریر دل پذیر کو کس شے سے مثال دوں۔ زبان اردو یہاں بے بس ہوئی۔ سعی ناکمل نے امثال یہ سمجھائیں. . . . (تحریر) سیلِ رواں ہے شمشیر براں ہے۔ مدوجزر سمندر کا ہے، باد گرد آفت خیر ہے۔ کونسی ان میں پسند خاطر ہوئی؛ بسبیلِ ڈاک واپسی مطلع کیجئے گا اور یہ امر بھی کہ نور الملک میر کارواں منبعِ جود و سخا میر خلیل الرحمٰن صاحب آپ کو اس ورقِ پند و موعظت لکھنے کا کیا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ کچھ رقم اس میں سے ہنڈی کے وسیلے فقیر حضر کو بطریق زکوٰۃ ارسال فرماتے رہا کرو تو موجب تہنیت و مسرت ہوگا۔ تم کو اور تمہاری اولاد کو دعا دوں گا۔ درویش کا سگریٹ۔ بیڑی کا خرچہ نکلتا رہے گا اور تمہارے اموالِ دنیوی میں کوئی کسر اس سے نہ ہوگی۔

ایک مدت سے سوالات چند ایک میرے ذہن میں تھے آپ کی ذات والا صفات پاک نہاد سے متعدد بار قصد کیا کہ آپ کی جناب میں وہ پیش کروں اور آپ جواب ان کا مناسب مرحمت کریں۔ ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اب لگے ہاتھوں پوچھے لیتا ہوں۔ دیکھیے صاحب ٹالیے گا نہیں۔ میرے سوال تُرکی تُرکی۔ آپ کا جواب عربی عربی ہونا چاہیئے۔ پہلا تو آپ کے مولد و مسکن اصلی کے باب میں ہے۔ مخالفین آپ کے بسبیلِ زبان و قلم برملا کہتے پھرتے ہیں کہ آپ تھانوی ہیں ہی نہیں اور خمیر مبارک خاک کیرانہ سے اٹھا۔ آپ سے براہِ راست بالمشافہ توثیق اس امر کی چاہتا ہوں۔ واسطے اپنے شک و بدظنی مٹانے کے۔ اگر تھانہ کے ہو تو وہ تھانہ کونسی عمل داری میں پڑتا ہے۔ نمبردار وہاں کون کون سے رہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کون سنہ میں آپ نے اس قلمرو میں ہجرت کی اور کس بنا پر املاک آپ کی منقولہ و غیر منقولہ سلطنتِ ہند میں کیا کیا تھیں۔ مالیت کیا تھی۔ آموں کے باغ۔ فیل و

اسپ اگر وہاں آپ رکھتے تھے تو یہاں پہنچ کر آپ نے دعوے ان کا سرکار میں درج کرانے میں تساہل کیونکہ برتا؟ الاٹ، اپنے نام کس لئے نہ کرایا۔ کراچی میں پہنچ کر خدمات کے صلے میں سرکار سے کیا کچھ ملا۔ اپنے زورِ بازو، حیلہ و حکمت سے کتنے اموال متزاد پیدا کئے۔ اس لئے نہیں پوچھتا کہ خود ننگا بھوکا ہوں۔ حسد کرتا ہوں تو مجھ کو موت آئے۔ جانتا ہوں کہ دولت و حشمتِ کثیر کا تمہارے ہاتھ آنا بخششِ خداوندی ہے عطیہ یداللہی ہے۔

تیسرا سوال: کونسا ایسا گُر تمہارے پاس ہے۔ دہنِ مبارک میں کیسا طلسم چھپا رکھا ہے کہ حاکمانِ وقت تمہارے گرویدہ ہوئے۔ جس سلطان ذی شان نے باگ ڈور سلطنت کی سنبھالی تم نے بڑھ کر پیشوائی کی اور اس کو شیشے میں اتار لیا۔ حضرت یہ تعویذ ہم کو بھی بتا دو۔ دبدبہ طہارت و تقدس بدرجہ اتم عمالان و اہل کاران عالی شان و اہل تمول حضرات پر بٹھایا۔ امیر و وزیر نے اپنی بہو کی ساعت سیاہ پر نکاح خوانی کے لئے ہمارے تھانوی کو بلایا۔ ان کے لئے یہ طرّہ امتیاز نہ ہوا' تمہارا شریک برات ہونا اور نکاح پڑھانا تاعمر فخر کرتے ہیں کہ تمہاری زبان مبارک نے مناکحت کے بول پڑھے۔ دو دلوں کو جوڑا۔ تمہارے لئے یہ سعادت کہ اولاد اکابر کا نکاح پڑھایا۔ دستار و جبہ عنایت ہوئے فیس معقول مطابق رتبہ و پایہ کے کف میں آئی۔

چوتھا سوال میں پوچھونگا نہیں۔ میرے ایک صورت شناس سید کاظم شاہ نام کراچی کے محلہ شمس آباد کے رہنے والے آپ سے خود بعد وقت مقرر کرنے کے دریافت کریں گے۔ انہوں نے وعدہ جواب مجھ تک پہنچانے کا کر رکھا ہے۔ متوقع ہوں کہ جوابات جلد نہ کہ بدیر ارشاد ہوں گے۔ جب تک نامہ آپ کا مجمل و مفصل نہیں آئے گا۔ فقیر کی بے کلی دور نہ ہوگی یہ نہ ہو کہ سکتر اپنے کو رقعہ دو حرفی بھیجنے کا حکم لگا دیں۔ شلجم کی کھال سے مٹی دھو ڈالیں۔

ایک بات حضرت کو یاد ہو گی، وہ یہ کہ دورِ الیکشن عامہ سے کچھ مدت پہلے ایک فتویٰ کا اشتہار اس شہر میں ہوا۔ صحیح یاد نہیں، غالباً ایک صد و سہ مفتیانِ شریعت احمدیہ و علمائے دین کے دستخط مہری ورق کے نیچے ثبت تھے۔ اس باب کی توثیق میں کہ ماسوا فتوے دینے والوں اور

ان کے عزیزان واقربا کے اس ریاست میں سب لوگ کافر ہوئے۔ بروئے فتویٰ ہر وہ شخص جو حقِ ملکیتِ شخصی جائداد و اموال میں ایمان نہ رکھے۔ اہلِ اسلام میں سے نہیں۔ انطباع اس فتوے کا مولانا الطاف حسن قریشی کے پرچہ میں کلہم ہوا۔ اور کئی اصحاب نے اس فیصلہ پر شادیانے خوشی کے بجائے۔ آپ کی مہر اس اشتہار پر تھی، یا نہیں۔ بہر حال آپ تھے متفقین میں سے۔ فقیر حیران ہے۔ اہلِ ہنود یہاں کچھ صد ہیں، عیسائی مذہب والے بھی گنے چنے افراد لیتے ہیں۔ وہ تو خیر کفار ہوئے۔ مگر بارہ کروڑ اشخاص نام لیوا ختم المرسلین محمد مصطفٰے کے بھی ان کے ہمراہ مقہور و معتوب ہوئے۔ اس پاداش میں کہ روٹی عزت کے ساتھ اس ریاست میں مانگتے ہیں۔ جزاک اللہ۔

ایک جماعت تھی جو آپ نے کبھی بنائی تھی، مسلمین کی۔ اجماع علمائے مشرق و غرب و شمال و جنوب واسطے حصولِ تخت و سلطنت بک جائے۔ فقیر نے کچھ مدت سے اس کا نام نہیں سنا۔ کچھ خبر نہیں کہ وہ جماعت گئی کدھر۔ تسبیح و مصلا بغل میں داب ہرن ہوئی۔ قصہ پاک ہوا۔ حسرت البتہ اب تک ہے۔ آپ کو معیتِ مریدان باصفا کے باجلاس دیکھنے کی۔ کاش تاج و تخت تم کو مل جاتا۔ اپنا سکہ چلاتے۔ بدستورِ شرع دس کروڑ اہلِ کفار سے جزیہ وصول کرتے۔ برسرِ بازار زانیوں کے کوڑے لگواتے۔ حکومت آپ کی کا کوئی اس طور سے خیال کرتا ہوں کہ متشرع و متقی لوگ جتے پہنے سڑک پر چلتے ہیں۔ اہلِ تمول عالی خاندان، سوداگر و مہاجن اونچے محلوں میں رہتے، امن و امان سے عیش کرتے ہیں۔ لیکن متوسط الحال ان کی خدمت میں چاق و چوبند اپنی محکومی و وفاداری پر قانع و شاکر۔ امتناعاتِ شرعی کی پابندی ان پہ لازم۔ نکاح دھڑا دھڑ پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں اور نظامِ اسلامی کی برکات چار سو روشنی پھیلاتی ہیں۔

ایک شاعر حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال المتخلص بہ اقبال لاہور میں رہتے تھے۔ کلام ان کا اکثر قوال ریڈیو پر گاتے ہیں۔ شاید آپ نے زنہار سماعت فرمایا ہو۔ ان کا ایک شعر ہے۔ بیت

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری

واللہ باللہ اس کے مطالب کا اپنے پر انطباق نہ کیجئے گا۔ یونہی یہ شعر خانہ ذہن میں آیا۔ تم کو سُنایا خفقان نقیر کا روز افزوں ترقی کرتا ہے۔ مجذوب کی بڑ ہانکتا ہوں، خیال نہ کرو۔

ایک گزارش اپنے ایک رشتے کے بھانجے کی جانب سے گوش گزار کرتا ہوں۔ توجہ خاص کی مستحق ہے۔ فقیر حضرو کالت پُر زور کرتا ہے۔ وہ میر منشی محکمہ تعلیم عمل داری صوبہ پنجاب میں ہے۔ اس کی شادی اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو کسی صاحب کی دختر فرخندہ اختر سے ہونا طے پائی ہے۔ برخوردار مُصر ہے، اس بات پر کہ نکاح حضرت خود پڑھائیں۔ آسکو گے؟ دستارِ ململ بارہ گز کپڑے کی۔ تسبیح و بیس روپے نکاح خوانی کی اجرت لڑکی والے دیں گے۔ اس سے زیادہ کا ان کو مقدور نہیں۔ ضرور آیئے گا۔ تفصیلات قریہ و مقام و محلہ کی آپ کی صاد آنے پر لکھ بھیجوں گا۔ آتے ہوئے ایک درجن تولیے، موٹے، عمدہ اپنے کارخانے کے بنے لیتے آئیں تو مسرت سب کی دو بالا ہو گی۔ یہاں اچھے تولیے ملتے نہیں۔ بزبانِ اہلِ پنجاب بڑی تنگی بھڑتی ہے۔

مزید تب لکھوں گا کہ ان مطالب کا اعادہ تحریر، بہ دستخط حضرت میرے پاس آجائے گا۔ زیادہ حدِ ادب

نجات کا طالب خضر

(۷، نومبر ۱۹۷۱ء)

آغا محمد یحییٰ خان کے نام

ہائے یہ کیا سنتا ہوں ہمارے آغا صاحب نے زمامِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو سونپی۔ تخت و تاج سے دستبردار ہوئے۔ گوشہ نشینی اختیار کی۔ اللہ اللہ نیرنگی زمانہ اس کو کہتے ہیں۔ باور کسی طور سے نہیں آتا کہ اب بر دوش ہوا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین دی پریذیڈنٹ!" کی رسمِ تعارف کے بعد ان کی تقریر دل پذیر کسی کارپردازِ مسنعد کی لکھی ہوئی، سماعت پذیر نہ ہوگی۔ کل کو آغا صاحب اس ریاست کے مختارِ کل، فرماں روائے مطلق العنان تھے۔ اخبار و لاسلکی ان کی سطوت و جبروت کی مدحت میں رطب اللساں تھے۔ آج ہر کوئی ان کی کھال ادھیڑنے کے درپے ہوا۔ ہر سو سے لعن طعن ان پر برستی ہے۔ غدارِ ریاست وقرار پائے۔ اشتہار اس باب کے نکلتے ہیں کہ مقدمہ غداری اس فاسق پر چلاؤ۔ ضرب المثل اردو کی ہے، جس کے ہاتھ میں ڈوئی، اس کا سب کوئی، وہ یہاں صادق ہوئی۔ یعنی ڈوئی ہاتھ میں جب تک تھی، کاسہ لیسوں اور نکیہ برداروں کا طائفہ محوِ طواف تھا۔ وہ متاع چھنی تو وہی لوگ بوٹیاں نوچنے کو آئے۔ ایک شاعرِ انگلستان رابرٹ براؤننگ نام کا مشہور ہے اس نے ایک نظم "لیڈر" بمعنی ہادی قوم، کہی۔ فقیر نے زمانہ مکتب میں پڑھی۔ وہ ازبر ہوئی۔ مضمون اس کا اس طور تھا اور لیڈر کی زبانی ہے، لو سنو:

> "جب سالِ گزشتہ مجھ کو یہاں سے جلوسِ ذی شان میں لے جاتے تھے، تو بالا خانوں سے پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ بوئے حنا و بید مشک فضا میں محیط تھی۔ ایک انبوہ میرے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے امڈا تھا۔ ہیہات، آج ایک سال بعد اسی راستے پر شکوہِ شکستہ میں مجھے سوئے مقتل گردن مارنے کو لے جاتے ہیں۔ راہ گیر رک کر مجھ پر تھوکتے ہیں۔ لعین لعین کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔"

یہ سرزنش سرمدی حضرت براؤننگ کا اس کلبۂ ہُوا و ہوس میں کل صاحبانِ شکوہ کے مطابق انجام ہوا۔ حضرت عوام الناس کی طبع میں تلوّن گندھا ہے۔ ہوا کے رُخ کے ساتھ بدلتے ہیں۔

آپ کیا گئے، ساری عمارت ڈھے گئی۔ جاتے جاتے اپنے جرنیلوں کی فوجِ ظفر موج کو ساتھ لے گئے۔ نئے فرمانرواؤں نے انہیں برطرف کیا۔ بنا اس کی یہ ہوئی کہ موٹے تھے تعیّش پسند تھے۔ توندیں نکل آئی تھیں۔ میں کیوں کہوں اس ہزیمتِ بے پناہ میں قصور سراسر ان کا تھا؛ املاک و اراضی و جاہاتِ برقی کے شوق نے جرأت و ہمت ان کی چھینی، سپاہ گری کی عادت عیش کوشی کی لت میں ہار لی۔ ریاست کے سب اہلِ تموّل کا یہ حال ہے۔ عام لوگ، متوسط الحال لوگ اکثر بے چارے معصوم و احمق و بزدل ہیں۔ وہ سمجھتے رہے فیروزپور میں، ہم پہنچ گئے۔ امرتسر کی چھاؤنی میں افواجِ سلام نے ڈیرہ ڈالا۔ العاص نے بازار میں بتاشے بانٹے۔ فقیر بھی جب ریڈیو پہ رزمیہ ترانے جنگ و جدال کے سنتا تھا اور دادو لوہار صاحب کی خوش کلامی سے جوش کھاتا تھا، اس خیال میں مست تھا کہ اہلِ کفر کے دھرے اڑتے ہیں۔ ہندو بنئے لڑ نہیں سکتے۔ ایک مومنِ بے تیغ دس مسلح ہندو پہ بھاری۔ ایک نعرہ علی حیدر کا لشکرِ مسلمین سے بلند ہوا اور بنیوں کی افواج کے اوسان خطا ہوئے وہ منتشر ہوگئیں۔ اکثر اصحاب اس ریاست کے بے چارے شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی کے ازمنہ میں رہتے ہیں۔ بیسویں صدی کی دنیائے آلات و سائنس سے ان کو کچھ علاقہ نہیں۔ ریڈیو اخبار و رسائل یہاں کے اس سرابِ بے حقیقت کو قائم رکھنے میں منہمک ہوئے۔ قیاس کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے جرنیل صاحبان بھی سپاہِ اسلام کو توپ و تفنگ و طیارے سے لیس کرنے کی بجائے، محاذِ پیش پہ جاکر دادِ شجاعت دینے کی بجائے، ریڈیو کے نغمے سنتے رہے۔

واہ آغا صاحب، ہم تو خیر غیر فوجی، جاہل المجہول تھے، آپ تو ماشاءاللہ فنِ سپہ گری کے ماہر بنتے تھے۔ بات بات پہ میں سپاہی ہوں، فرماتے تھے۔ فاتح الاملاک شہنشاہ فرانسیسی

نپولین بوناپارٹ کا کہا آپ نے ضرور پڑھا ہوگا۔ "خدا اکثر جنگ میں بڑی بٹالنوں کا ساتھ دیتا ہے۔" آپ نے ملک کو جنگ میں جھونکا۔ سازوسامان کی کچھ فکر نہ کی۔ حضرت، کیا آپ بھی یہی سمجھتے تھے کہ دادو لوہا رہم کو فتح مندی و فیروزمندی سے ہم کنار کردے گا۔ مسلمین ریاست کو جنت الحمقاء میں رہنے دینے میں آخر کیا حکمتِ عملی تھی؟ —— آپ اگر سپہ گری بھول چکے تھے تو ہمارے فیلڈ مارشل سابق فرمانروائے مملکت، الحاج محمد ایوب خان صاحب سے، ہی مشورت کر لیتے۔ چار پانچ داؤ پیچ تو وہ آپ کو بتا ہی دیتے۔ آپ کا رخ صدارت سے دو قدم کے فاصلے پر ہی تو رہتے ہیں۔ اب ان سے ضرور ملیے گا۔ انبساط و اختلاط کی باتیں کیجیے گا۔ شاید جی بہل جائے!

گستاخی پر محمول نہ کرو، ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ جمہور کو حکومت دینے کا فیصد آپ نے اور آپ کے جرنیل صاحبان نے کیا۔ چہار برس اس کارِ خیر کو ہوتے ہیں۔ اس کام میں تعجیل کرنے میں کونسی مصلحت آڑے آئی۔ آپ کے پیشرو و پیش مقام محمد ایوب خان بہادر نے بھی بحالی حکومتِ جمہور کی خاطر کاروبارِ ریاست سنبھالا۔ دس سالہ ترقی کا جشن منایا۔ رسالہ بے مثال بنام "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"، مصاحبین و اخوان سے لکھوا کر اپنے نام سے انطباع کیا۔ پیر تسمہ پا ریاست کے کندھے پر ہوئے شہنشاہی کے خواب دیکھنے لگے۔ ولی عہد ان کے بلادِ کراچی میں دربار لگاتے تھے اور فرامین کمشنران و حکام کے نام جاری کرتے تھے۔ ان کی معزولی جائے عبرت ہونی چاہیے تھی۔ آپ کے لئے اور دوسروں کے لئے بھی۔ افسوس آپ نے بھی ریوڑ کو ہانکنے کے لئے سونٹا ہاتھ میں سنبھالا۔ نتیجہ اس استبداد کا ظاہر ہوا۔ ایوب خاں بھی گئے۔ تم بھی الگ ہو بیٹھے۔ مگر خمیازہ ہم بھگتتے ہیں۔ ملکِ اہلِ اسلام غارت زدہ ہوا۔ ابتلائے عظیم بپا ہے۔ کل ارض کے ممالک ہم پر ہنستے ہیں۔ اشخاصِ سلیم الطبع یہاں سے غائب ہوئے۔ ترانے گانے والے اور قصیدہ گو رہ گئے۔ جس نہج پر آپ دونوں نے ان کو پندرہ سالہ دوران حکومت میں ڈالا وہ اس کو کیونکر چھوڑیں۔ فطرتِ ثانیہ ان کی

ہوئی۔

مزید کیا لکھوں، باری تعالےٰ تمہیں اور ایوب خان صاحب کو معاف کرے، اور توبہ تمہاری کو قبولیت بخشے! جرنیل گنگ زبان عبدالحمید خان اگر آپ کے پاس بیٹھے ہوں تو ان کی خدمت میں فقیر کا مجرا عرض کیجئے گا۔ پشاور میں اپنے بنگلے میں کب جائیے گا؟ کوئی کہتا ہے مفسدوں نے اسے راکھ کیا۔

خاکپائے سلاطین — خضر
مرقومہ ۲۶، دسمبر ۱۹۷۱ء

سیّد ضمیر جعفری کے نام —

سیّد صاحب۔ ڈاک کا ہرکارہ ایک پارسل لایا۔ اس میں سے ایک مجلّد آپ کی نومطبوعہ ساقی الضمیر، کی نکلی۔ مکتبہ اردو ڈائجسٹ والوں نے یہ گلدستۂ گوناگوں وانبساط انگیز فقیر کو پہنچایا۔ غالباً آپ نے ان کو ہدایت کی ہوگی، ورنہ ان لوگوں کو کیا پڑی تھی مجھ گوشہ نشیں کو عنایتی کتاب بھیج کر مطبع کا نقصان کرتے۔ ڈاک کا محصول بھی ان کے ذمے ہوا۔ میں ابھی اس کتاب کی سیر کرتا تھا کہ بعد چند روز کے ایک مجلد اور اس کی بسبیل پارسل موصول ہوئی گویا ساغر التفات کا دوسرا دور پہنچا، اور پہلے دور سے بڑھ کر دو آتشہ، کہ دستخطی تھی، اور سرورق پر بہر ان کا دل رکھنے کو آپ کے قلم خاص سے میرے بارے میں تہنیت و تحسین کے جملے لکھے تھے۔ جھوٹ کیوں کہوں، تعریف کس کو اچھی نہیں لگتی۔ تمہارا احسان ہے۔ میں خود کو خاک سمجھتا ہوں، اور بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پچیس برس بھاڑ جھونکا اور ہاتھ کچھ نہ لگا۔ ہائے ہائے ہمارے ڈاکٹر اقبال صاحب کا ایک بیت ہے، میرے حسب حال، یعنی ظالم میرے دل کی بات کہہ گیا ہے۔ لو سنو: قطعہ

بس نوائے سوختہ در گلو   تو پریدہ رنگ دمیدہ بو

بس حکایت غمِ آرزو　　　تو حدیثِ ماتمِ دلبری

بھائی! تمہاری کتاب نے دل و روح کو شادماں کیا، مافی الضمیر، کیا لکھی ہے، اپنے اور میرے اور سب اہلِ درد کے مافی الضمیر کو آشکارا کیا ہے۔ سبحان اللہ، تم نے مزاحیہ شاعری میں وہ رنگ جمایا کہ الہ آباد کے اکبر اور راجہ مہدی علی خاں کو رشک آیا۔ جیتے رہو۔ اس دورِ بدذوقی و بے حسی و خود فریبی میں تمہارا دم غنیمت ہے۔ معاشرت و تہذیب وطن کے پہلوہائے مضحک کی اتنی پُراز خوبی پردہ کشائی متقدمین کو بھی میسر نہیں۔ سید صاحب تم سمجھتے ہوگے تم نے نظمیں لکھیں حضرِ آشفتہ تو کہتا ہے کہ ضمیر نے اپنے زخموں کی پٹیاں کھولی ہیں، مگر ہنستا جاتا ہے اور سب کو ہنساتا ہے۔ ناکندہ تراش اذہان کو تمہاری سخن سنجی محض ٹھٹھول بازی لگے گی۔ البتہ وہ لوگ کہ اہلِ دل و اہلِ نظر ہیں، ان کے لئے اس میں سامانِ فکر و عبرت ہے۔ سوچتا ہوں کہ زرِ درد جگر زمانہ کی کیسی کیسی تند بھٹیوں میں تپا ہوگا کہ تب یوں کندن بنا۔ صاحب کوئی ان سخن پاروں کو بین السطور میں پڑھے تو احوالِ کیفیتِ ذہنی، ہم لوگوں کی پر افسوس کرے۔ حمقا بغیر مطلب پائے ہنستی نکالیں گے۔ اب اپنے کچھ اشعار میری زبان سے بسبیلِ حافظہ سُن لو:

ریواز کی تصویر

خوبصورت اچکنیں، زرکار جوتوں کی بہار	ہر طرف پنجاب کے طرّے قطار اندر قطار
رات کی جاگی ہوئی آنکھوں میں خوابیدہ خمار	بالتو مونچھیں، گھنیری، لہلہاتی سایہ دار
گماں اک ایک نوکِ مو پہ نوکِ تیر کا	ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا
کچھ پڑھا کو، کورسوں کو بھی غذا سمجھے ہوئے	زندگی کو اک مشقت کی سزا سمجھے ہوئے
پاس ہونے کے لئے مرنا روا سمجھے ہوئے	دل ممتحن کے غلاموں کو خدا سمجھے ہوئے
نقش فریادی ہے جس کی شوخی تحریر کا	ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

واہ واہ میرے سید، مشاہدہ حقیقت کی معراج اس کو کہتے ہیں۔ الفاظ ظاہری

کے لباس میں مدعائے باطنی کا کمالِ اظہار ہے۔ اسی طور سے بائیسکوپ، ریل کے سفر، شوق الاٹمنٹ، سگریٹ نوشی۔ ریاکاری اربابِ علم وفضل وغیرہ پر تمہاری خامہ فرسائی زیبِ نظر ہے۔ تملّق میری خُو نہیں، لیکن مشاہدہ ایسا گہرا اور ہدف پر لگنا امرِ عامہ نہیں! ذرا اپنا کلام سنو:

مسلمانوں کے سر پہ خواہ ٹوپی ہو نہ ہو لیکن
مسلمانوں کے سر سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

چند مرغ مرغیوں نے کر کے باہم ساز باز
ایک ڈربے میں بنائی، مجلسِ بیضا گداز
مدعا یہ تھا کوئی تنظیم کا پیمانہ ہو
یعنی مرغی خانہ ہر پہلو سے مرغی خانہ ہو

بیت: تھا کبھی علم آدمی، دل آدمی، پیار آدمی
آج کل زر آدمی، قصر آدمی، کار آدمی
کلبلاتی بستیاں، مشکل سے دو چار آدمی
کتنا کمیاب آدمی ہے کتنا بسیار آدمی

بیت: میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

بیت: شرافت کی سند پیغام بر لایا تو کیا لایا
جو اچھے لوگ ہیں بیٹی کو موٹر کار دیتے ہیں

بیت: دریدہ دامنوں خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں
قوافی میں وہی خلد آشیانی حسرتیں اب تک
ردیفوں میں وہی مرحوم ارمانوں کی باتیں ہیں

بیت: جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیرؔ
اب تو اک مدت سے شوہر ہو گیا

قصہ مختصر، نظموں کو تمہاری مدت سے پڑھتا ہوں ہنستا ہوں اور روتا ہوں۔ سید ضمیرؔ صاحب ضمیرؔ،

تم اکثر امور میں میرے ہم طالع و ہم درد ہو۔ دونوں ناوکِ بیداد کے زخم خوردہ، فراوانی بے ذوقی وکور چشمی سے نالاں۔ راہ سخن سے بھڑاس نکالنے والے۔ فرق یہ کہ میں بے ہنری و ہیچ مدانی میں صاحبِ کمال، تم اپنے فن پہ حاوی! اپنی بے بضاعتی کا گلہ نہیں کرتا، فن سخنوری کے شناوروں کی ہم سخنی و ہم زبانی بھی معمولی شے نہیں!

ہاں بھائی تم مجھ سے شکایت کرتے ہوگے کہ تعارف نامہ تمہاری تصنیف کا نہ چھاپا۔ نہ اس کے پہنچنے کی رسید دی۔ اجمال اس کا یہ ہے کہ کم و بیش دو برس ہوئے محبیّ ظریف الملک فخر بدلہ سنجاں کرنل شفیق الرحمٰن صاحب ایک بار لاہور آئے۔ کلبۂ احزان پر کارِ عالی شان میں تشریف لائے اور پہروں انبساط و اختلاط کی باتیں کرتے رہے۔ جاتے ہوئے آپ کی کتاب "مافی الضمیر" کا مسودہ حوالے کر گئے کہ آپ نے ان کو دیباچہ نگاری کے لئے دیا تھا۔ ظریف الملک چاہتے تھے کہ دیباچہ مل کر لکھا جائے اور مشترکہ ناموں سے انطباع ہو۔ اب سبد صاحب، فقیر ایک ہی کاہل، فسادِ معدہ کے عوارض میں ایک مدت سے مبتلا ہوں۔ لکھنا پڑھنا یک قلم موقوف ہے۔ کسی کام کا نہیں، نہ حواس بجا، نہ حافظہ قائم۔ دیباچہ کے کام کو کل پہ ٹالتا رہا۔ مسودہ میز کی دراز میں پڑا رہا، اور اب تک میرے پاس بطور تمہاری نشانی کے محفوظ ہے۔ ظریف الملک جب دوبارہ کارسرکار پر لاہور آئے تو میں نے اپنی شرمساری کے مٹانے کو تغافل کا موجب اپنی علالت کو ٹھہرایا۔ وہ کہنے لگے فکر نہ کرو، وہ کتاب غالباً چھپ چکی ہے۔ مافی الضمیر اس کا نام ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے مہتمم مطبع منشی الطاف حسن قریشی نے چھاپی ہے۔ یہ سُن کر ایک بوجھ میرے جی سے اُترا۔ جان میں جان آئی۔ خیر تم اس قصہ پارینہ کو بھول چکے ہوگے۔ مسودہ کی تم کو کیا حاجت؟ یہ میرا حرزِ جاں ہے۔

زہے نہار ہم تم مل بیٹھیں اور باتیں ہوں۔ مرجع لطائف حضرت محمد خاں کو فقیر کی بندگی۔ کوئی اور صاحب آپ کے پاس بیٹھے ہوں تو ان کی خدمت میں سلام و نیاز

کہہ دیں۔

خضر۔ مرقومہ ۹ رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء

عالی جناب مفتی محمود وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کے نام

اپنے پیر و مرشد مفتی الملک، احترام الدولہ کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں اور حیران ہوں کہ میرے کس قصور پر آپ نے درویش کے آپ کی عمل داری میں داخل ہونے پر پابندی لگادی۔ مجھ کو تسلیم ہے کہ نہ آپ نے اور نہ گورنر صوبہ سرحد جناب ارباب سکندر خاں صاحب بہادر نے فقیر کے بارے میں بالتخصیص اس طرح کا حکم صادر فرمایا۔ کوئی وجہ بھی آپ کی مجھ پر خفا ہونے کی نہیں پاتا۔ ہماری آپ کی بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ حضرت کی صورت عز و شرف البتہ کئی بار ملک کے اخبارات و رسائل میں سرمۂ بصر بنی۔ میں آپ کا صورت شناس گویا ہوں۔ آپ نے میرا نام تک نہیں سنا۔ خلاصہ اس عبارتِ مہمل سے یہ ہے کہ آپ کی سرکار نے منبر پر چڑھتے ہی دلکیہ کی خرید و فروخت، اس کا پینا خلافِ قانون قرار دیا۔ اب شہر پشاور کے حدود میں کوئی شراب رکھ نہیں سکتا، پی نہیں سکتا۔ پارسیوں کی دکانوں پر مہریں لگ گئیں، گانجے اور چرس کے کاروبار کو کمال فروغ ہوا۔ ان کو فروخت کرنے والے مہاجنوں کی عید ہوئی۔ وہ حضرت کو دعائیں کیونکر نہ دیں گانجے اور چرس کو آپ بند کر سکتے نہیں۔ مذہب اسلام میں شراب حرام ہے۔ قیاس کرتا ہوں کہ گانجے اور چرس کے خلاف صریحی حکم کہیں قرآن و حدیث میں نہیں آیا۔ اس واسطے یہ حلال، جائز، کھلے بندوں فروخت ہوتی ہے۔ میرا معمول ہے کہ شام کو ایک آدھ بوتل بیئر کی بلا ناغہ پیتا ہوں۔ گرد و پیش کا غبار اس سے دُھل جاتا ہے۔ فضا کی بے رونقی دور ہوتی ہے۔ اب حضرت ہیں صوبہ سرحد میں جانے سے رہا۔ وہاں بیئر کیوں کر حاصل کروں گا۔ کیونکر تشنگی بجھاؤں گا۔ گانجے

چرس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ طبع نفاست پسند آڑے آتی ہے۔ القصہ مختصر میرا آپ کی سلطنت کا رخ کرنا بعید از قیاس ہوا۔ گو کہ آپ نے ختماً مجھ کو آنے سے نہیں روکا۔

اپنے پر یہ فرض جانتا ہوں کہ حقیقتِ حال آپ پر واضح کر دوں۔ قبلہ! الپشا در میں بیئر اب بھی دستیاب ہوتی ہے۔ بھاؤ البتہ چڑھ گیا ہے۔ ساڑھے سات روپے کی بوتل پندرہ روپے میں ملتی ہے۔ الامان، الحفیظ!

حضرت آپ یہ حکم لگا کر خدائے عز و جل کے روبرو سرخرو ہو گئے۔ حلقۂ مومنین کامل کی تحسین و تہنیت کے سزاوار قرار پائے۔ جنت میں آپ کے لئے بر لبِ رودِ کوثر ایک قصر محفوظ ہوا۔ تشنہ کام پھر بھی، لیکن، کہیں نہ کہیں سے مہنگے داموں ہی سہی دستیاب کر لیتے ہیں۔ آپ کا قصور نہیں کہ آپ نے اپنے نزدیک جو کام کرنے کا تھا کر دیا۔

احترام الملک قبلہ و کعبہ مفتی صاحب۔ کان کھول کر سنیئے گا۔ ننگِ اسلاف خضر کہتا ہے کہ وہ شئے جس کو علماء فضلاء دین اُم الخبائث کا نام دیتے ہیں۔ ام الخبائث البتہ نہیں۔ ام الخبائث دراصل جہالت ہے اور جہالت بھی تدریسی علوم و فنون سے ناآشنائی کو نہیں کہتے۔ اس قلمرو میں محققین و مجتہدین کا ایک بڑا فرقہ اصلاً جاہل المجہول اشخاص پر مشتمل ہے۔ فکر سلیم سے یہ فرقہ متمتع نہیں۔ جذبہ محبتِ انسانی اور روشِ بندہ نوازی سے بہرہ مند نہیں۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے اشخاص ہیں؟ ہوا کریں۔ تفسیروں میں ہندی کی چندی نکالنے میں ماہر وہ فاضل ضرور ہوں گے مگر محض ملائے مکتبی ہیں آنکھوں سے اندھے کانوں سے بہرے، مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے، خلقت کی دلسوزی کا دم بھرنے، شاہد سخن کے جلوے سے تیرگی قلب کو دور کرنے کا ان کو ملکہ نہیں۔ ان حضرات کی مفسدہ پردازیوں اور کرشمہ سازیوں سے اس ملک پر پے بہ پے آفاتِ ناگہانی کے حملے ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ بنظرِ انصاف دیکھیے۔ اس ملک میں کئی صاحبانِ کمال پیدا ہوئے اُن میں سے دو میرزا اسد اللہ خاں غالب اور سعادت حسن منٹو ایسے تھے کہ سب اہلِ نظر

خوبانِ روزگار ہیں ان کا شمار کرتے ہیں۔ ایک نثر و نظم کا بادشاہ تھا، دوسرا نثر اردو کی قصہ گوئی کا خاتم۔ ان کے سخن کو موت نہیں آئے گی۔ دونوں شراب پیتے تھے وہ بھی قرض کی۔ دُخترِ رز کے شیدائی ہونے کے باوجود وسیع المشرب۔ دانا نیک اور سچے آدمی تھے۔ ان کی نظر بلند تھی آپ کے مجتہدین صلاحیت ذہنی میں، آدابِ انسانی میں اُن کی گرد نہیں پاتے پر سچ مانیے گا اس سلطنت مسلمین میں جو تھوڑی بہت روشنی جھلک مارتی ہے وہ اُن کے اور ان جیسے دوسرے سخنوروں کی بدولت ہے۔ کیا خرافات بکتا ہوں۔ اہلِ احتساب کو دردمندی اور روشن طبع سے علاقہ؟

خضر نے دل میں خیال باندھا کہ احترام الملک مفتی صاحب نے صوبہ سرحد میں خلفائے راشدین کے زمانے کی سلطنت قائم کی۔ گورنر بہادر اور وزیر اکبر و اصغر چٹائیوں پر اجلاس فرمائیں گے۔ عوام الناس کی بسوں میں دورے کریں گے۔ اب اخباروں، رسالوں میں چرچے سراسر دوسرے ہیں کہ جن کو پڑھ کر بدگمانی کا احتمال ہوتا ہے واللہ باللہ میں باور کرتا ہوں تو کافر مروں۔ ایک تو کسی نے یہ خبر اڑائی کہ آپ کی سواری کے واسطے ڈیڑھ لاکھ کا موٹر قفقاز جرمن سے درآمد ہوا۔ اس کی تردید بطریق غلو ہوئی یعنی ڈیڑھ لاکھ کا موٹر نہیں خریدا گیا۔ حضرت! اس سے کتنی رقم کم کا خریدا گیا۔ سوچتا ہوں بس بھی ایک نہ ایک ضرور آپ کی حکومت راشدہ کے تحویل میں ہوگی۔ دوسری خبر یہ تھی کہ آپ کی سرکار نے ہر وزیر کبیر کو بیس ہزار روپیہ برائے تزئین و آرائش محل سرا دینا منظور کیا۔ اس افواہ کی تردید تا حال آپ نے نہیں کی بھول گئے ہوں گے۔ اس مرضِ نسیاں کے ہم دونوں مارے ہیں۔

عالی مقام ارباب سکندر خلیل خاں کو سلام نیاز۔ ولی خاں صاحب کی خدمت میں بندگی بصد ہزار اشتیاق۔ ہر دو اصحاب پھلیں پھولیں۔ زیادہ حد ادب ــــ

طالبِ التفات خضر

اپنی بیٹی سارہ بی بی کے نام ــــــ

اپنے بابل کے گوشۂ جگر کے صدقے، اس کی بلائیں اپنے سر!

لو بیٹے سارہ! ہم نے تمہیں خط لکھا۔ دن میں ایک پہر باقی ہے۔ کوتوالی کے پاس گھنٹہ گھر نے دو بجائے ہیں۔ تمہارے بابا برقی شمع دان کی روشنی کے سامنے میز پہ جھکے اپنے بیٹے کو یاد کرتے ہیں۔ کل صبح دن چڑھے خط کو ڈاک میں ڈالیں گے۔ بیٹے بیرنگ نہیں۔ تم پیسے کہاں سے دو گی۔ وہ پیسے جو میں نے تمہیں جاتے وقت دیئے تھے وہ تو تم خرچ کر چکی ہو گی۔ میرا خط تم ابھی تو نہیں پڑھ سکو گی۔ اپنی ماں سے کہنا وہ تمہیں پڑھ کر سُنا دیں گی۔ بیٹے ہم نے قول اپنا پورا کیا نا؟ تم جب جانے لگیں تو مجھ سے کہا "بابا آپ وعدہ کریں آپ مجھے کراچی میں خط لکھیں گے اور صرف میرے نام منصور کو نہیں، ہارون کو نہیں" ہم نے کہا "ہاں بیٹا"، تم بولیں "بابا، آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے ہیں۔ سچ کہہ رہے ہیں نا؟" کتنی اپنے بابا کی محبت کے معاملہ میں حاسد ہو۔ کسی دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرتیں۔ یوں تو اُن کے پیچھے دیوانی ہوئی پھرتی ہو، میں ہارون کو گود اٹھا لوں یا منصور سے چار باتیں کر لوں، یہ تم کو گوارا نہیں۔ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ روٹھ جاتی ہو۔ بابا خضر ازل کی ہٹیلی، ضدی، چڑچڑی، اپنی لاڈو سارہ کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں مناتے پھرتے ہیں۔ کتنی مشکل سے تم منتی ہو، بیٹے!

جس روز تم اور تمہارے بھائیوں کو کراچی جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہونا تھا، تم گردن میں درد کا بہانہ کر کے بیمار پڑ گئیں۔ میں دفتر سے لوٹا تو دیکھا کہ آپ چپ چاپ گلے کو کراہتی، پلنگ پہ لیٹی ہو۔ تمہاری ماں سرہانے بیٹھی، متوش، تمہاری خاطرداری کرتی ہے۔ وہ بولی نونو کو بڑی تکلیف ہو گئی ہے، ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میں نے کہا ابھی جاتا ہوں۔ اتنے میں تم بھلی چنگی ہو گئیں۔ چہک چہک کے باتیں کرنے لگیں۔ کہاں کا درد اور کہاں کی ڈھالی

تمہاری ماں تمہیں اب تک سمجھی نہیں۔ اب اس نے کہا "نونو، تم سچ مچ بیمار تھیں یا بابا سے دور جانے پر اداس تھیں" تم نے ہاں میں سر ہلایا اور ٹکر ٹکر مجھے تکنے لگیں۔ اس دن تو تمہارا جانا ملتوی ہوا تمہارے چہرے پہ رونق آگئی۔ دوسرے دن پھر وہی قصہ! گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے پہلے تم نے رو رو کر براحال کر لیا۔ میں نے تمہیں دم دلاسے دیئے "نونو بیٹے آپ کراچی پہنچیں گی، اس سے چار روز بعد میں بھی آجاؤں گا۔ خالہ کے گھر میں خوب کھیلنا، خوش ہونا۔ راستے میں کلثوم آپا کے ہاں اترو گی، وہ تمہیں خوب پیار کرتی ہیں" بارے تمہارے آنسو تھمے۔ میں نے ڈوبتے دل سے کہا "بیٹے، دل مضبوط کرو، تم میرے بہادر بیٹے ہو۔ اب تو نہیں روؤ گے" تم نے ہاں میں سر ہلایا۔ موٹر میں تم پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔ اور اسٹیشن پہنچنے تک خاموش نہ ہوئیں۔ ہم سب تمہاری خاطر پریشان ہوئے۔ تمہاری ماں کہتی تھی۔ نونو بالکل ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ بابا کے پیچھے دیوانی ہوئی ہے۔ میں نے تم سب کو گاڑی میں سوار کیا۔ تم نے پھر بابا، بابا کی رٹ لگائی اور رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں گاڑی چلنے میں دیر ہو گئی۔ تم پلیٹ فارم پر اتر آئیں، تمہاری ماں نے پوچھا تو تم نے کہا "میں اپنے بابا کے پاس رہوں گا۔ میں تمہیں گود میں لئے پھرا۔ یہ دکھاوہ دکھا۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ میں نے تمہیں جلدی سے گاڑی میں بٹھایا گاڑی چلی تو تم اپنی ماں کو لے کر دروازے میں آن کر کھڑی ہوئیں۔ آنسوؤں کو روکے، دل پر ضبط کئے، مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہنے لگیں۔ تمہارا بابا گاڑی کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کچھ دور بھاگا اور پھر گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ گاڑی کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظر آتی رہی۔ پھر اس کی ٹانگیں آب ہوئیں۔ ایک بنچ کا سہارا لیا اور ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ کر بچے کی مانند رونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد تمہارے بابا اٹھے اور گویا خواب میں تمہارا موٹر چلاتے سونے گھر میں لوٹے۔ ہائے کوئی خاموشی سی خاموشی تھی۔ یقین نہ آیا کہ تم اس گھر میں چلتی پھرتی نہیں ہو۔ ویرانی روح کا مطلب مجھ پر معلوم ہوا۔

تب سے دل پر بے کلی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہے۔ جگر کے ٹکڑے! اس وقت کا سوچتا ہوں جب گاڑی مجھے افتاں وخیزاں تمہارے پاس پہنچائے گی۔ تم باباکو لینے پلیٹ فارم پر آئی ہو گی منصور اور ہارون تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تم مجھے دیکھ کر کھل اٹھو گی اور کہو گی "بابا ہارون کہتا تھا بابا نہیں آرہے۔ میں نے کہا بابا ضرور آئیں گے۔ بابا میں آپ کے لئے بڑا اداس تھا۔" میں تمہیں گود میں اٹھا لیتا ہوں اور تمہارے منہ کو چومتا ہوں۔ پھر جلد اتار دیتا ہوں۔ چھوٹا ہارون میرے پیار کا منتظر ہے، اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر ہم اسٹیشن سے باہر جاتے ہیں، خوش و مطمئن، جیسے کل متاع دنیا کی ہمیں حاصل ہو گئی ہو۔

پیارے بیٹے نونو! اب تمہارے بابا تنہا ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں۔ صبح اٹھتا ہوں، پھر تو ساتھ بستر پر تم سوئی دکھائی نہیں دیتیں۔ جاگنے پر کوئی نہیں پوچھتا۔ "بابا آج اتوار ہے آپ کو چھٹی ہے!" میرے کہنے پر کہ آج چھٹی نہیں، دفتر جاؤں گا کسی کا منہ روکھا نہیں ہوتا۔ دفتر جانے کے لئے جب موٹر میں بیٹھتا ہوں تو کوئی اپنے بھائی ہارون کی انگلی پکڑے گیراج میں بھاگا نہیں آتا اور یہ نہیں کہتا "بابا ــــ اگر ــــ اگر ــــ اگر ــــ آپ کو دیر نہ ہو گئی ہو تو کیا آپ، ہم کو موٹر کا چکر لگوا لائیں گے۔ میں کبھی جھنجلا کر کہہ بیٹھتا ہوں "نہیں بیٹے، آج دفتر کو دیر ہو گئی ہے"، اور پھر تمہارا محزون چہرہ دیکھ کر اپنی بے حسی پر پچھتاتا ہوں اپنی سخت دلی پر سخت نادم! "اچھا آ جاؤ"، تم دونوں آ بیٹھتے ہو۔ ہارون اگلی نشست پر کھڑا ہو جاتا ہے، تم پیچھے پھیل کے بیٹھ جاتی ہو اور ہم مارکیٹ تک کی سیر کرتے ہیں۔ وہاں تم کرچ کرچ والی گولیاں ضرور لیتی ہو، گو مجھے دفتر جانے کے لئے دیر ہو رہی ہوتی ہے۔

یہی روز کا معمول تھا۔ تم بچوں کو گھر چھوڑ کر میں دفتر جاتا۔ جب آتا تم میری راہ تک رہی ہوتیں۔ تمہاری اور ہارون کی طرف سے گیراج میں رسم استقبال عمل میں آتی۔ بلائیں لی جاتیں اور بلائیں دی جاتیں۔ گو کہ تم کھانا کھا چکی ہوتیں، بابا کے ساتھ میز پر آ بیٹھتیں

اور اس کے ہاتھ سے دو تین لقمے اور کھاتیں۔ ساتھ چہڑ چہڑ دنیا جہان کی باتیں بابا کا دل بہلانے کو کرتی جاتیں۔ ماں بعد تمہارے ساتھ لوڈو کھیلنا بھی معمول تھا۔ کبھی تم ضد کر بیٹھتیں۔ بابا آپ مجھے محمد علی اور زیبا کی فلم دکھانے لے چلیں۔" ہٹ کی کتنی پکی ہو، تم بیٹے لولو، اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہو کبھی وعدہ لیتی ہو "آج شام آپ نہیں ہوں گے، بابا۔ ہاں جی بابا صاحب' کیلے کے نواب صاحب۔ دوستوں دوستوں کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ کل بھی میری کہانی رہ گئی۔" بابا بے چارے کیا کریں۔ جب سے تم عمرِ شعور کو آئی ہو انہیں باندھ رکھا ہے ہلنے نہیں دیتیں۔ تمہیں کبھی مجبوراً چھوڑ کر وہ غریب جائے تو خود کو مجرم محسوس کرے اور ہاں بیٹے، یہ بابا کے لئے 'کیلے کے نواب صاحب' کا لقب تم نے کہاں سے سیکھا۔ تمہاری دیکھا دیکھی چھوٹا ہارون بھی پیار سے مجھے بابا صاحب کیلے کے نواب صاحب کہنے لگا ہے۔

اب رات کو لکھنے بیٹھتا ہوں تو کوئی چھوٹی لڑکی میری بغل سے لگ کر یہ نہیں کہتی "بابا بس آپ کو تو لکھنے کی پڑی ہے۔ بابا، آج کہانی کا پروگرام ہے یا نہیں؟۔ میں کہتا ہوں وہ پیارے شکرے فنسٹ والی کہانی نہ سنیں۔" "بیٹے آپ مجھے کام کر لینے دیا کریں۔ دیکھو، بابا تمہارے کو کچھ کام بھی کرنا ہوتا ہے۔" "اچھا بابا، میں سونے جاتا ہوں، مل لیں۔" میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔ ہم دونوں بستر میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں تم ایک کہانی سنتی ہو۔" بابا! میں کہتا ہوں ایک اور نہ سُن لیں۔ تھوڑی ڈراؤنی ہو۔ وہ دی پینزل والی۔" میں وہ سناتا ہوں اور چھوٹی لڑکی کو نیند آنے لگتی ہے۔ وہ کہانیاں سن کر باہر سونے کے لئے چلی جاتی ہے "بس بابا، اب آپ اپنا کام کر لیں،" اس لڑکی کو اپنی ماں کی گودی میں جھولے بغیر نیند نہیں آتی جب اس کی آنکھیں نیند سے مُندنے لگتی ہیں تو باہر سے آواز لگا کر کہتی ہے۔" بابا جی، میں اب سونے لگا ہوں۔ مجھے آ کر مل جائیں،" بابا اپنا قلم رکھ کر فوراً حکم کی تعمیل کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں' اور اس لاڈو لڑکی کو پیار کر کے پھر اپنی میز پر آ بیٹھتے ہیں۔

دفتر میں اور گھر میں ہماری ننھی پری کی صورت آنکھوں میں تیرتی ہے۔ اب یہ الفاظ لکھتا ہوں تو تخیل کہتا ہے۔ آپ ہمارے پہلو میں کھڑی ہیں اور بابا کو قلم سیاہی کی دوات میں ڈبوتے اور کاغذی مورتیں بناتے تکتی ہیں۔ مڑکر دیکھا اور بی بی ہری گم۔ جب تم یہاں تھیں میں تم کو جادو کے کھیل دکھاتا تھا۔ اب جادو تم نے سیکھا۔ ابھی یہاں ابھی غائب دل لبھانے والی باتیں تمہاری کانوں میں ہر لحظہ سنائی دیتی ہیں "بابا میرے خیال میں تربیک آئی ہے۔ . . . "بیٹیا، ترکیب کہو" تربیک آئی ہے۔ بابا آپ سگریٹ چھوڑنا چاہتے ہیں تو ایسا کریں کہ سگریٹ کا پیکٹ میں اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا کروں گا۔ ہاں جی۔ آپ کو ایک سگریٹ چائے کے بعد دوں گا، ایک کھانے کے بعد، ایک شام کی چائے کے بعد، ایک رات کو۔ اور نہیں دوں گا"۔ . . . "بابا آپ کو ناگ منی کی کہانی سناؤں، ایک ہوتا ہے وحید مراد . . . "۔ . . "بابا آنٹی ثریا مجھے محمد علی سے ملانے لے گئی تھیں۔ بابا محمد علی گنجا ہے۔ میں نے کہا: میں وہ انجن والا گانا سنوں گا۔ محمد علی نے کہا: بیٹے وہ تو ریکارڈ ہوتا ہے۔ میں تو نہیں گاتا۔ . . اس نے میرے لئے کوکاکولا منگوایا۔ میں نے محمد علی سے کہا: آپ کا شکریہ جی میں تو بینز پیوں گا . . . "بابا، ایک بات کی میں بڑی فکر کرتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں: بیٹیا میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ پھر آپ بہت بوڑھے ہو جائیں گے۔ پھر مر جائیں گے۔ بابا اس سے میں بہت اداس ہو جاتا ہوں۔ بابا مرنا کیا ہوتا ہے۔ آدمی مرکر کیا کرتے ہیں"۔ ہائے میرے بیٹے سارہ! یہ مرنے جینے کی باتیں تمہیں کیونکر معلوم ہوئیں۔ مجھے بھی یہ خیال ستاتا ہے میں مر جاؤں گا میری سارہ تنہا کیا کرے گی۔ کون اس کے ناز نخرے اٹھائے گا۔ کون اُسے پیالے شکرے فنسٹ اور بابا یاگا جادوگرنی کی کہانی سنائے گا۔ کون میز پہ بیٹھ کر بجلی کے شمعدان تلے آنکھیں کاغذ سے چپکا کر نقاشی الفاظ کی کرے گا۔ کون پہلو میں زبردستی گھس کر بابا کا پروگرام پوچھے گا۔ نہیں نہیں بیٹے نونو، تم اداس نہ ہو۔ بابا تمہارے ایک دن مر ہی سگے۔ مرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ چپ چاپ، بے حس و حرکت زیرِ زمین

جاسوتے ہیں۔ دکھلائی نہیں دیتے۔ کھاتے کچھ نہیں، بولتے چالتے کچھ نہیں۔ ویسے موجود رہتے ہیں، اپنے بیٹوں اور چاہنے والوں کے سینوں اور دلوں میں۔ رات کو چپکے سے زمین کے نیچے سے اٹھ کر اوپر آتے ہیں اور جب ان کے جگر گوشے محوِ خواب ہوتے ہیں تو ان کے سرہانے کھڑے ہو کر ان کی پیشانی چومتے ہیں۔ ان کو ہر دم دعا دیا کرتے ہیں۔ آفاتِ دینوی میں ان کی نگہبانی کرتے ہیں۔ میری جان! کچھ ڈر دل میں نہ لاؤ۔ تمہارے بابا ہر دم، ہمیشہ تمہارے آس پاس ہوں گے اب وعدہ کرو یوں ملول نہ رہا کرو گی دیکھو سارہ یہ بات اچھی نہیں تمہیں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا، مگر بلا لیا گیا تو کچھ نہ کر سکوں گا۔ تم بھی مجھے روک نہ سکو گی۔ میرا وعدہ ہے کہ سوتے میں تمہیں دیکھنے ہر رات کو بلا ناغہ آؤں گا۔

میری پری کو نئے کپڑے پہننے کا کتنا شوق ہے۔ بابا میں عندلیب بنوں گا۔ میں دلہن بنا ہوں۔ ماتھے پر ٹیکا، ہاتھوں میں چوڑیاں، جھلمل جھلمل کرتا جالی دار کپڑے کا غرارہ، قمیص۔ اپنے بوڑھے خفقانی باپ کو معاف کرو۔ ایک دن کہہ بیٹھا "نو نو، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا"، تم روٹھ ہی تو گئیں اور ایک دو گھنٹے روٹھی رہیں۔ پھر خود ہی جا کر نیلے فراک والا سوٹ پہن آئیں۔ تم جانتی ہو وہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے "یہی پہنا کرو"، تم دمک اٹھیں اور اچھل کر میری گود میں آگئیں اور میرے کندھوں پر چڑھ بیٹھیں —— اوہ، تم اپنے بابا کو کتنا چھیڑتی ہو۔ کتنی گستاخیاں کرتی ہوں۔ کتنی بے ادبیاں، بابا کے گرد آس پاس کسی نہ کسی بہانے منڈلاتی رہتی ہو اور کنکھیوں سے دیکھتی جاتی ہو۔ بابا کی بھی ایک آنکھ اپنی کتاب پر ہوتی ہے۔ دوسری سارہ بی بی پر۔ میں صدقے جاؤں بیٹے۔ عمر کی کتنی مدت تنہائی کا زہر تلخ چکھا۔ میرے اللہ نے مجھ پر عنایت کی، منصور آیا۔ چھ سال بعد تم آئیں۔ پھر چھوٹا ہارون۔ اتنی نعمتیں مجھے ملیں۔ مجھ سا خوش نصیب کوئی انسان نہ ہوگا۔ اپنی علالت کی عمر دگی میں ایک گونہ سرخوشی میرا معمول بنی۔

ہاں، اپنا لڈو تو تم یہاں بھول گئیں۔ ہارون میاں کا ہیلی کاپٹر۔ منصور میاں کا نیا کیمرہ

بھی یہاں رہ گیا۔ میں نے سب چیزیں سنبھال رکھی ہیں۔ آتے ہوئے ساتھ لیتا آؤں گا۔
تمہاری ماں یہ نہ سمجھیں کہ میرے پاس روٹی پکانے والا کوئی نہیں اس واسطے تکلیف میں ہوں۔ مائی بھاگاں کا لڑکا تنور سے روٹی لا دیتا ہے۔ دودھ گرم کر دیتا ہے۔ تھوڑی بہت جھاڑ پونچھ کمرے کی کر جاتا ہے۔

ہارون سلمہ اللہ تعالےٰ کو بہت پیار اور اشتیاقِ دیدار۔ یہ جیتے رہیں، اپنے بابا کے واسطے قابلِ فخر بنیں، ٹرینیں چلائیں۔ ہیلی کاپٹر اڑائیں۔

بابا کی طرف سے اپنے بھائی منصور کو گلے لگانا۔ اب تو نہیں تنگ کرتا تم کو۔ بیٹے آج اتوار کا روز ہے، آئندہ جمعہ کو گاڑی میں سوار ہوتا ہوں اور تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ خط میرے کے مضمون کا مطلب کسی جگہ سمجھ میں نہ آئے تو اپنی ماں سے پوچھ لینا۔

تمہارا نوکر بابا

شان الحق حقی کے نام

اجی چاند میاں، میرا سلام لیجیے۔ مرشبیہہ آپ کے بچپن کی ایک رسالہ بنام "گلدستۂ نگارش" کے ورقِ پوشش پر نظر افروز ہوئی۔ ماشاء اللہ چشم بددور، تب خوب گل گوتھنے تھے۔ بھرا گول چہرہ، سر پر کلاہِ پاغستانی، بند گلے کی شیروانی گلے میں چنبیلی گلاب کا گندھا ہوا ہار۔ تمہاری مورت سے مجھ کو اپنا زمانہ بچپن یاد آیا، کہ میں بھی عین مین تم سا تھا۔۔۔ ہا، ہا، اب ہم تم دونوں کھانگڑ ہوگئے یا ور نہیں آتا کہ وہ گنا ہ قد، خشمگیں شخص، جو پوشاکِ انگلستان میں آلہ مائیکروفون پر ایک اور مندرجہ تصویر میں کھڑا ہے اسی چاند میاں کا پنجاہ و ہفت سالہ بہروپ ہے۔ مونچھیں چوہے کی کترسی ہوئی گالوں میں چیونٹی کے انڈے۔ سر خضاب کی برکت سے البتہ سیاہ۔ اللہ اللہ رفتارِ عمرِ رواں رو کے رُکتی نہیں۔

جب میں گزشتہ سرمائیں کراچی میں تھا میرے ایک کرم فرمانے یہ مذکورہ رسالہ مجھ کو عنایت کی دیا۔ حضرت تمہاری بی بی سلمیٰ صاحبہ کی تمہارے ساتھ الفت وارادتِ قلبی کا میں قائل ہوا۔ تم اس طالع بیدار کے شکرگزار نہ ہو تو کیونکر، تمہاری ستائش میں اردو زبان کے کل شناوروں کی تحریریں یک جا کر دی ہیں۔ سفید دبیز کاغذ پہ ستائیس سطر سے آٹھ جزو کی کتاب، تمہاری خلوت وجلوت کی عکسی شبیہوں سے مزین موجب فرحتِ دل ہوئی۔ آرائش و تزئین بھی اس کی خوب ہے۔ مطبع ایجوکیشنل کراچی کے مہتمم نے اس سارے کام کی کتنی اجرت آپ سے لی۔ ایک درجن بینکوں، سگرٹوں، ملوں، ایئرلائنوں اور کتب خانوں کے اشتہارات سے کتنی رقم وصول ہوئی۔ قیاس کرتا ہوں کہ کتاب آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو مفت پڑی چنانچہ آپ نے عوام الناس میں مفت تقسیم کی۔ کُل عالم نے جانا کہ کوئی صاحب شان الحق حقی قلمروئے پاکستان میں رہتے ہیں۔ صدر الصدور ٹیلی ویژن کارپوریشن اور معتمدِ اکبر ترقی اردو بورڈ کے ہیں۔ اس کے ساتھ شیر بیشہ نثر ونظم اردو وسنسکرت ہیں حضرت میں نے یہ رسالہ بغور دیکھا۔ سچ سچ صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ اردو بھاشا ہر دو بولوں کے لغت دانوں اور قاعدہ دانوں میں حضرت کے والد اور نیولین قلمروئے سخن، محتسبِ طہارتِ زبان مولانا ماہر القادری مدظلہ کے ماسوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ اپنے والد کے مرنے کے بعد ان کی دستارِ علم وفضل آپ کو ورثے میں ملی۔ آپ نے وہ پہنی نہیں، تو اس میں حرج کچھ نہیں۔ یہ بھی منکشف ہوا کہ اردو زبان دلی کے معدودے چند گھرانوں کی لونڈی ہے۔ انہی گھرانوں کے نام لیوا جو ہجرت کر کے اس مملکتِ خداداد میں آن مقیم ہوئے، راز دان صرف ونحو اردو کے ہیں۔ باقی سخنور کیا عمل داری پنجاب کے، کیا... نظامت دکن کے، لچر اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔

یہ رسالہ بے بہا گویا آپ کے مجموعہ مضامین نثر "نکتہ راز" کا تعارف نامہ ہے۔ اعتراف میں آپ نے رسالہ کی مندرجات کی جامع اپنی بی بی سلمیٰ بیگم کی تہنیت میں بجا طور لکھا

ہے: اس کو چھاپ کر انہوں نے گویا اپنے آپ پر اور خود آپ پر احسان کیا ہے حضرت مسیح بانو فقیر حضر کی نظر میں تمہاری آبرو بڑھی۔ وہ اب آپ کو مسندِ عز و جاہ پر جانشین مشاہدہ کر کے اور بی بی سلمیٰ بیگم کو آپ کی جلیس و ہمراز جان کر دونوں کی جناب میں کورنش بجا لاتا ہے۔ ما بعد اس مضمون کے اردو زبان کے نکتہ سنجوں نے آپ کی نثر و نظم میں گلفشانی کی تحسین میں خوب مضامین گوناگوں رقم کئے ہیں۔ جناب کے مجموعہ کلام "زنار پیراہن" کی اشاعت پر جو درجنوں تبصرے پے بہ پے اس ملک کے متعدد اخباروں اور رسالوں میں کبھی چھپے، ان کے اقتباسات کا الگ باب قائم کرنا سلمیٰ بیگم کی خوش ذوقی کی دلیل ہے۔ قبلہ، توقیع اہلِ نظر کا حاصل ہونا آسان نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کل جہان کے رسائل اردو میں ان نگارشات کے مسلسل جگہ پانے میں کچھ آپ کی اپنی کاوش بھی ہو گی۔ مدیران بالعموم ہر کس و ناکس سے یوں فیاضی نہیں برتتے۔ سلمیٰ بیگم کی دور اندیشی اور آپ کی خود شناسی کی داد کیوں نہ دوں کہ انہوں نے جو کچھ بھی آپ کے بارے میں چھپا، جہاں چھپا احتیاط و التزام سے محفوظ کر لیا۔ میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر کوئی اوراق ان کے علاوہ آپ کے فضائل سے متعلقہ عجلت میں رہ گئے ہیں تو وہ بھی ایک علیحدہ گلدستہ خاص کی شکل میں بھیجیں۔ باب بعنوان "چند ادیبوں کے خطوط" بھی سرمۂ منفعتِ نظر ہے۔ فقیر کو خواہ مخواہ وہم ہوا کہ ان خطوط کے خلافِ طبع فقرے محذوف ہو کر نقطے بنے۔ اللہ اللہ۔ کیسے کیسے اربابِ سخن سنج آپ کی طرزِ نگارش پر مرمٹے۔ خاتم قصہ گویان حضرت نیاز فتح پوری فخر الشعراء حضرت شبیر حسین جوش سابق رئیس ملیح آباد کے، مشتاق یوسفی صاحب سب یہاں موجود۔ تمہاری نثر و نظم کی پاکیزگی کے سب قائل! اچھا کیا جو آپ نے ان کے سرٹیفکیٹ چھاپے۔ اور تو اور حضرت کی دلداری، شرافتِ ذاتی نے نقوش کے محمد طفیل صاحب لاہوری کو بھی موہ لیا۔ وہ بھی گرداب داغنے سے چوک گئے۔ نشانہ غلط پڑا یا آپ کی صدر الصدوری کے رعب سے ہمت نہ ہوئی آپ کو برا کہنے کی۔ ورنہ وہ سگے باپ کو خاطر میں نہیں لاتے۔

حضرت آپ کی زوجہ بیگم حقی کا اپنا مضمون بعنوان "وہ اور اُن کی شاعری"، کیا مزے کا ہے
ایسی مداح صدقے ہونے والی بی بی خدا ہر ایک کو دے۔ زمانہ بچپن سے چاند میاں کے ساتھ
کھیلی کودی ہیں اور اس واسطے اُن کے گنوں کی واقف کار۔ حیرت ہے کہ آپ کی بی بی کے
نزدیک آپ کی شاعری کا ڈھنگ ابھی تک دلکش ہے، آپ کی سیرت دل آویز۔ بھائی
خوش بختی تمہاری پر رشک آیا۔ آپ کے بھلکڑپن کے جو قصے انہوں نے لکھے ہیں۔ اگر سچ ہیں
تو برا مر جائے عبرت ہے۔ تمہاری ہماری عمر میں مرضِ نسیان نمود کرتا ہے اور تمہارا
قصور کچھ نہیں جو یہ حرکتیں کرتے ہو۔ ہمارے محمد خالد خان المتخلص خضر علیہ السلام بھی کبھی
عینک لگا کر بھول جاتے ہیں اور اس کی تلاش میں سارے گھر میں اودھم مچا دیتے ہیں۔
دونوں لڑکوں کی شامت آتی ہے ایک بار یہ بھول گئے کہ موٹر گاڑی پٹرول پر چلتی ہے
چنانچہ دو گھنٹے چوک گھنٹہ گھر میں کھڑے رہے کریں تو کیا۔ نہ جائے ماندن۔ نہ پائے رفتن۔
تمہاری شل جوتے تو نہیں البتہ موزے مختلف رنگوں کے چڑھا کر دفتر چلے جاتے ہیں۔ ہاں
حضرت۔ مجھ پر یہ بھی معلوم ہوا کہ تم کو مصوری و نقاشی سے بھی لگاؤ ہے۔ بی بی آپ کی
لکھتی ہے کہ ایک دفعہ بخار جو چڑھا مصوری کرنے کا تو اسٹول پر چڑھ بیٹھے۔ پانچ چھ
راتیں جاگ کر مصوری کرتے کاٹیں۔ اچھے خاصے منظر تیار کیے۔ مگر البتہ بعد میں ہفتوں سیدھی
نہ ہوئی بستر سے لگ گئے۔ بات میری پلے باندھو۔ شوقِ فنِ مصوری میں بُرائی کوئی نہیں۔
ہاتھ منہ کو نیلے پیلے۔ زعفرانی چمپئی رنگوں سے رنگ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس
شوق کو کیفیتِ جنوں تک لے جانے میں قباحت یوں ہے کہ کمر سیدھی نہیں ہوتی۔ آئندہ
احتیاط کیجئے گا۔

آپ کی منتخبات از کلام نثری و شعری کہ اس رسالے میں درج ہیں فقیر کے مطالعہ طائر
میں آئیں۔ صاحب خوب طرز ہے۔ اچھا طرز ہے۔ کیا پاکیزہ زبان ہے۔ رودِ کوثر ہے۔ میں
کہتا ہوں۔ مولانا ماہر القادری کو چھوڑ کے کوئی دوسرا اتنی اچھی شستہ و رفتہ اردو اس قلمرو

یں لکھ نہیں سکتا۔ اللہ اللہ دلی نام کا شہر ملک ہندوستان میں رہ گیا۔ وہاں سے کراچی کو ہجرت کرنے والے لوگ دلی کی زبان کو مستند، اچھلے کہتے چلتے ہیں۔ اہلِ پنجاب اس کو مانتے نہیں، نہ مانیں۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ اردو زبان اب یہاں کہاں؟ آپ اور مولانا ماہر القادری اور چند دوسرے اصحاب کے مرے پیچھے اس ریاست میں اردو صحیح بولنے اور لکھنے والا کوئی نہ رہے گا۔ زبان ناخالص مخلوط ہو جائے گی۔ روزِ حشر کا طلوع ہو گا۔ اس زمانے کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تمہارے منظوم کلام میں جو نظم تم نے حضرت فلک رفعت، پری جمال ملکہ معظمہ کنعان و مصر قلوپطرہ صاحبہ کے آخری لمحات پر کہی ہے وہ فقیر حضر کو بالتخصیص پسند آئی۔ واہ! کیا سحر سازی کی ہے اور کس پائے کی سخن پردازی ہے۔ افعی کے روبرو اور اس موذی کو ڈسنے پر آمادہ کرنے کی خاطر ملکہ مذکورہ کی منظوم تقریر آرائی و خوش کلامی کس لطف سے ادا ہوئی۔ ہر چند کہ افعی ڈسنے میں دیر کرتا ہے اور اس کام میں متامل ہے۔ لیکن ملکہ مصر کی سحر بیانی اور ادائے ناز و نیاز کے سامنے اس کی دال نہیں گلتی۔ بے خود ہو کر ملکہ مصر کا نادیدہ والہ و شیدا ہوا۔ کاش اس زمانے میں عالمِ موجودات میں اس کا گزر ہوتا اور یہ ناچیز ملکہ حسن کی غلامی میں مور پنکھ جھلنے کے منصب پر مامور ہوتا۔ اجی شان الحق حقی صاحب۔ تم نے نظم لکھی۔ مجھے شوقِ دیدارِ ملکہ مصر بے اختیار رہا۔ ہائے! بولئے،

کلامِ نثر تمہارا، از راہِ داستان طرازی و تمثیل نگاری اچھی خیال آرائی ہے۔ قوت متخیلہ سے تمہارا ذہن عاری نہیں۔ حضرت مادہ تاریخ نکالنے میں تمہارا ہمسر آج تک پیدا نہ ہوا۔ اس تاریخ گوئی میں خود کو آپ کا ہمسر نہیں پاتا۔ ہر وقوعہ معمولی و غیر معمولی پر جھٹ مادہ تاریخ اختراع کرنے کے درپے ہوئے۔ تیزی و براقیِ ذہن اس کو کہتے ہیں۔ معاہدہ تاشقند و سقوط مشرقی پاکستان جو آپ کی اس تاریخ گوئی کی زد میں آئے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ آپ نے تو اپنے مضامین حقی (بعنوان "نکتہ راز") کے انطباع اور تعمیر مکان مسکونہ خود کے وقوعوں کو بھی مادہ تاریخ نکالے بغیر نہیں چھوڑا۔ شاباش! اس فن میں

نہیں ید بیضا ہے۔

صفحہ پچانوے میں ضیاء الدین احمد برنی صاحب سے روایت کردہ لطیفہ جو آپ کی بی بی نے درج کر دیا ہے وہ آپ کے خلاف جاتا ہے۔ اسے پڑھ کر کیونکر جناب کے حساد بغلیں نہیں بجائیں گے۔ حضرت مولوی عبدالحق بابائے زبانِ اردو نے کیا شوخ قطعہ آپ کی توصیف میں لکھا اور اپنے شاگرد رشید مشفق خواجہ صاحب کو بطریق مشورہ بھیجا۔

قطعہ

تو نے حق کو خوب گانٹھا ہے اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے
دیکھنے میں وہ پھول ہے لیکن درحقیقت وہ سیہہ کا کانٹا ہے

سیہہ ایک جانور خار پشت ہوتا ہے۔ آپ نے سیہہ غالباً دیکھا نہیں۔ ورنہ بیتِ آخر کو اپنی تہنیت میں متصور نہ کرتے معصومیت پر قربان جایئے۔ قبلہ قطعہ کو یوں مشتہر کر کے آپ نے ہمیشہ کی جگ ہنسائی اور بدنامی مول لے لی۔ کلنگ کا ٹیکہ ماتھے پر لگوایا اب یہ بیت آپ کے پیچھے پیچھے عالمِ برزخ تک جائے گا مفر مولوی صاحب کے رکھے نام سے ممکن نہیں۔

گستاخی پر محمول نہ کیجئے تو یہ فلک زدہ خضر آپ سے پوچھتا ہے کہ بابائے زبانِ اُردو کے خطوط آپ کے قبلہ و کعبہ مولوی احتشام الحق کے نام جو اس رسالے میں چھاپے اس سے غرض و غایت کیا ہے ـــ مولوی صاحب آپ کے والد کی صلاحیت و قواعد دانی کے معترف تھے۔ لیکن ان خطوط کا اس رسالہ گلدستۂ نگارش، سے کیا تعلق ؟ مولوی صاحب کا طرزِ عبارت مجھ کو بھاتا ہے۔ اس لئے یہ خطوط اول تا آخر پڑھے۔ خوب حظ اٹھایا۔ سبحان اللہ! مولوی صاحب کو کیسا تعلقِ قلبی تمہارے والد سے اور تم سے تھا تعدادِ خطوط اس امر پر دلیلِ مسلم ہے۔ کسی خط میں شوخ دلی، رابطۂ بے تکلفانہ کا اظہار نہیں۔ مولوی صاحب کی ساری خط و کتابت میں ماسوا امورِ تدوینِ لغت یا معاوضے کے چیکوں کے کسی اور بات کا

مذکور نہیں۔ ہنسی مذاق نہیں۔ چھیڑ چھاڑ نہیں۔ اِدھر اُدھر کی خرافات محض نہیں۔ آپ کے
نام جو خطوط مولوی صاحب نے لکھے وہ بھی خشک محض کاروباری ان خطوط کو شامل کرنے
کی غایت بالآخر مجھ پر کھلی مقصود آپ کی بی بی کا ان کو چھاپنے سے یہ تھا کہ عوام الناس
احتشام الدین صاحب کو کلہم، بلا شرکتِ غیرے اردو لغات کبیر کا مدوّن و مرتب جانیں۔
گویا مولوی عبدالحق معاوضہ لے کر تے تھے اور احتشام الدین دلی میں پڑے لغات کی
تدوین میں جان مارتے تھے جھٹ قیاس کرتا ہے کہ مولوی ممدوح نے جو لغات کے کام کا کچھ حصہ
جناب کے والد بزرگ کو سونپا تو خواہ مخواہ خود کو کانٹوں میں الجھایا۔ ساری عمر کا دردِ سر
مول لے بیٹھے۔ اپنی تحقیری شاہد احمد مرحوم سے شمالی دلّی والوں میں کرائی۔ یہ داغ مولوی صاحب
کی جبین سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ دھبہ کمینگی اور احتشام الدین صاحب کو حقِ تدوین سے محروم
کرنے کا مولوی صاحب پر دائم ہوا۔ اغلباً موافق رضائے الٰہی ہے۔ واہ جناب مولوی
عبدالحق بے چارے سے آپ سخت ناخوش ہیں ان کو کھلے منہ برا بھی نہیں کہتے ہو۔ پر تمہارے
سینے پر بغض و عناد کا سانپ پھنکارتا ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے۔ ایک خط کے آخر میں
ایک ورق مولوی احتشام الدین حقی کا مرقومہ درج ہے۔ عبارت دستخطی نقل ایک درخواست
کی ہے جو انہوں نے کسی ادارہ تحقیقی میں بسلسلہ ملازمت گزرانی۔ اس کو دیکھا ہنسی ضبط نہ
ہوئی۔ منجملہ اور اوصاف کے ایک وصف ان کا ظاہر ہوا کہ مولوی حقی اپنی تعریف و توصیف میں
کسرِ نفسی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اپنی بڑائی چھاتی پر مکہ مار کر بیان کرتے ہیں، برسرِعام، برملا
دوں کی لینے میں ان کو قطعی عار نہیں۔ ہو بھی کیوں؟ آخر کو اصل دلّی والے تھے۔ ناک چڑھی
رہتی تھی۔ اہلِ دلّی اس لحاظ سے دوسرے خطوں کے باشندوں سے ممیز ہوتے اس درخواست
میں دعوے کرتے ہیں مختلف فنونِ مادی و ذہنی کی ہزارہا کتابوں کے پڑھنے کا۔ کو رادو کو
پاتال تک کھنگالنے کا۔ عبورِ قواعد صرف و نحو میں ہندوستان بھر میں ماسوا ڈاکٹر مولوی
عبدالحق کے کسی کو اپنا شریک و سہیم نہیں مانتے اور مولوی عبدالحق غریب کو بھی اس واسطے

کہ وہ حقی کی مصنفہ لغات کے اوراق کی نظرِ ثانی فرما دیتے تھے۔ اُن کی مندرجہ درخواست کی عبارت سے دلشاد ہو گیا۔

آخری دو جزو مذکورہ رسالہ کے صاحبانِ انگلستان عالی شان کی زبان میں ہیں۔ میں نے وہ بھی دیکھے کیونکہ زبانِ انگلش سے تھوڑی شُد بد رکھتا ہوں یہ مشتمل ہیں نقادان سخن کی تمہاری تصنیفات کے بارے میں آراء پر۔ انگلش جاننے والے ان کے مطالعہ سے حظ اٹھائیں گے عالی جناب سفیر الدولہ میاں ارشد حسین صاحب ہلالِ قائد اعظم۔ پاکستان فارن سروس نے اپنے مندرجہ رقعے میں جو آپ کی مثنوی کوچ کا ترانہ، قدیم وجدید کا نعوِ شاعری کا ماہِ تمام کہا، کچھ غلط نہیں کہا۔ ہر چند کہ یہ مثنوی میری نظر سے گزری نہیں۔ میاں ممدوح کا اس انداز میں تمہاری سخن گستری کی داد دینا خود ان کی اپنی شرافتِ ذاتی کی دلیل ہے سنیئے حضرت۔ یہ تراجم بزبانِ ولایت آپ کی نظموں کے کن صاحب نے کئے ہیں۔ ان پر یہ ظلم آپ نے کیوں کیا۔ ایک جزو اس قیمتی رسالے کا اشتہارات کے لئے وقف ہوا۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں نے جناب کی قدر دانی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ آدم جی صاحب ابھی زندہ ہیں یا انتقال فرما گئے۔ فقیر ان کا بندہ فرمان پذیر ہمیشہ سے رہا۔

الغرض یہ رسالہ بے مثال دل سے پسند آیا۔ تمہاری بی بی نے حق اپنی زوجیت کا بطریقِ احسن انجام کو پہنچایا۔ انشاء اللہ جیتے جی تمہاری حیات مدام حسنی ہوئی۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحہ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظورِ نظر اولی الابصار رہے گا۔ آؤ حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ صاحب، ہم حضرت چاند میاں کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔

معلمِ اردو ماہر صرف و نحو جناب ماہر القادری صاحب، حکیم ادب اختر حسین رائے پوری صاحب، جمیلین جالبی و نقوی صاحبان اور کل اخوان الصفا پاکیزہ ٹھیٹھ دلی کی بولی لکھنے بولنے والوں کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچانے میں توقف نہ کیجئے گا۔

تم سلامت رہو قیامت تک!

عاصی۔ خضرِ خرقہ پوش ــــــ سہ شنبہ۔ ۵۔ جمادی الآخر ۱۳۹۲ھ

کمانڈر سیّد انور کے نام ـــــــ

سیّد صاحب۔ دیکھئے شکوہ نہ دیجئے گا کہ کراچی سے جانے سے پہلے آپ سے مل کر نہیں گیا۔ کوئی ایک پہر دن چڑھے فقیر اور ہمارے رونق الدولہ جناب کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ یہ کہنے کا انداز ہے۔ حقیقت میں ہم نے چڑھائی کی۔ مدعا یہ تھا کہ گاڑی کے وقت روانگی تلک تمہارے دیوان خانے میں بیٹھ کر کافی تلخ کے جرعے نوش کریں گے۔ تشغلِ شطرنج ہوگا۔ انبساط و اختلاط کی باتیں ہوں گی۔ آپ کی بیٹی اور ہماری بھتیجی نے، ہم کو دیدیچے میں سے تاکا اور بتایا کہ آپ کہیں باہر نکل گئے ہیں۔ سچ کہتا ہوں بڑی مایوسی ہوئی ہم نے گمان کیا کہ آس پڑوس میں کسی دوست کے ہاں شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھے ہو گے اور جلد نہیں لوٹو گے۔ دو گھنٹے ابھی گاڑی میں تھے وہ عرصہ اہلِ خطا کے طعام خانے موسوم بہ کینٹین (چائینز ریسٹوران) میں بیٹھ کر کاٹا۔

دیکھو بھائی اب کے کراچی میں جو تم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اور داستان طرازِ یکتا کو قریب سے دیکھا تو گویا کراچی میرے لئے شہرِ چراغاں ہوا۔ فقیر آپکے سحر نگارش کا ایک مدت سے شیدائی تھا۔ سوچتا تھا یہ میاں انور کتنے خوش بخت ہیں بحرِ ذخار میں جہاز کی ناخدائی کرتے ہیں۔ فارغ وقت میں خانہ جہاز میں قصہ کہانی کی تصنیف سے جی بہلاتے ہیں۔ صاحب مانیئے گا۔ اپنے ایامِ طفولیت میں، میں بھی ملاح بلکہ سمندری قزاق بننے کی تمنا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بستر پر لیٹ کر صاحبانِ انگلستان کپتان فریڈرک مریات اور بلینٹائن کی کتب مدرسہ کے کتب خانے سے چرا کر پڑھتا تھا۔ یہ خواب قزاقِ بحری بننے کا شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ حسرت باقی ہے یہ نہیں کہتا کہ جہاز پر سوار نہیں ہوا اور سیرِ سمندر نہیں کی۔ البتہ اپنی کم ہمتی سے رہا بری آدمی ہی یعنی سراسر دو پایہ خشکی۔ تم نے سمندر کو خوب چھانا پھٹکا۔ کیونکر نہ کہوں تم پر مجھ کو رشک نہیں آتا نہ صرف ملاحی تم نے کی بلکہ فسانہ اردو

بس اسلوب نگارش انوکھا و دل پذیر وضع کیا۔ ماننے گا میں آپ کی قصہ گوئی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا دل سے قائل ہوں۔ چند ماہ گزرے میاں طفیل کے مطبع میں چھپے ایک رسالے 'نقوش' میں تمہاری حکایت دل آویز "مقدس مریم" دیکھی۔ سبحان اللہ خوب طلسم اس کے ہر ورق پر اُٹھایا ہے۔

کراچی میں ایک ملاقات کے دوران میں نے حضرت سے پوچھا کہ آج کل کیا کچھ لکھتے ہو۔ آپ نے بتایا کہ سمندر کے بارے میں ایک ناول مفصّل طبیعت کو سیر کرنے والا، آپ کے ذہن میں ڈھلا ہے۔ اس کو ضرور دیکھے گا۔ نثر اردو میں سمندر سے متعلقہ داستان کسی نے آگے لکھی نہیں۔ صاحب پولینڈ اپنے ہم پیشہ حضرت جوزف کانرڈ رحمتہ اللہ علیہ کے طرز پر کوئی فسانہ بحر بناؤ تو انشاء اللہ وہ نقش صفحہ روزگار پر یادگار ہوگا۔

صاحب وہ واقعہ جو مجھ کو اس بالا خانے سے بلانے پر تم کو پیش آیا۔ اس کے لئے میں شرمسار ہوں۔ تم جو جوکھوں میں پڑے خفّت اُٹھائی تو اس میں قصور دراصل رونق الدولہ کا ہے۔ میں وہاں کہاں ہوتا، اور آپ کو وہاں جانے کی حاجت؟ فقیر وقت موعودہ پر تمہاری حویلی کے کوچے کے پھیرے کرتا تھا۔

دل کہتا ہے، ہم اور تم اور رونق الدولہ حضرت کاظم شاہ صاحب پھر تمہارے دیوان خانے میں یکجا ہوتے ہیں۔ پھر شطرنج کی بازی دھری ہے اور تم تھکتے نہیں میدان سے ہٹتے نہیں۔ خضر۔ دعا کرو لمحہ سکون و مسرت پھر ایک بار آجائے۔

جناب غلام عباس داستان گو آپ کے مدّمقابل شطرنج کی بساط پر بیٹھے ہوں تو ان کو میرا سلام کہیے گا۔ اپنی بی بی ہماری مہمان نواز کشادہ دل بہن کی خدمت میں پیار بھتیجوں کو پیار۔ خدا ان کا طالع بلند کرے۔ گھر کی جنت قائم رکھے۔

گم گشتۂ منزل خضر

مرقومہ۔ ۱۵/اگست ۱۹۷۲ء

الطاف حسن قریشی مدیرِ اعلیٰ "زندگی" کے نام

میاں گزشتہ گرما میں ایک مکتوب تمہیں بتوسط اپنے جلیس و ہمرازِ خاص سید محمد کاظم سباق، میں نے بھیجا۔ اس کا جواب تا حال نہیں آیا۔ تم پی گئے، چپ سادھنے میں عافیت جانی۔ دیکھیے صاحب۔ خط کا جواب نہ دینا اشراف کا شیوہ نہیں۔ فقیر حضر سے کدورتِ دلی رکھتے ہو آخر کیوں؟ میں تو آپ کا بندۂ فرمان پذیر، غلامِ بے دام و بے لگام ہوں۔ مانا کہ تم ملک و مال اور جاہ و جلال سے بہرہ مند ہو اور یہ آشفتہ نوا مفلسِ بے نوا گدلے بے حیا ہے لیکن یہ امر وجہ محرومیٔ التفات ہونا نہیں چاہیے تھا۔ آپ تو مساواتِ نوعِ انسان کے داعی ہیں۔ آدمی آدمی میں فرق نہیں کرتے۔ حضرت آپ کو غلط فہمی ہوئی اگر آپ نے میرے خط کو کشکول گمان کیا، میرا خط کہیں ردی میں پڑا ہو تو مکرر دیکھیے گا۔ کب میں نے آپ سے ہنڈوی طلب کی؟

الحمدللہ! آپ کے برادرِ اکبر حکیم اعجاز حسن قریشی کے مطبع کا اخبار ہفت روزہ "زندگی" ایک مدت کے توقف کے بعد پھر سرِ بصر ہوا۔ سنتا ہوں سرکارِ وقت نے اسے بند کر دیا تھا۔ اس واسطے کہ آپ نے حاکمِ اکبر عالی جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ہر اچھے کام کو ہدفِ ملامت بنانے کی ٹھانی۔ طعن و تشنیع بلکہ دشنام طرازی سے باز نہیں آئے۔ ریاست کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہوئے۔ سگانِ محمد مصطفیٰؐ قدسی صفات جناب شورش کاشمیری اور حضرت عبدالمجید نظامی نے اس کارِ خیر میں آپ کی مقدور بھر معاونت کی۔ اسوۂ محمدی کا صحیح نمونہ پیش کیا۔ اجی قبلہ الطاف حسن قریشی صاحب، حسد سے بھٹو کو برا کہنے والے، نظریۂ پاکستان کے پہرے دار بلکہ اجارہ دار، نہ دل میں مہر و کرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ آزادیٔ قلم کے خوب گُل کھلاتے ہو۔ آپ اور آپ کے اخوان الصفا نے بھٹو تو بھٹو ان کی بی بی و اہل و عیال کو بھی معاف نہ کیا۔ غصہ یہ کہ سلطنت مومنین و رمز شناسانِ شریعت کے

ہاتھ نہ آئی۔ اہلِ کفر و یہود اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے والے دیکھتے دیکھتے تخت و تاج لے اڑے۔ ہائے ہائے وائے وائے۔ سفارت و وزارت کے مناصبِ جلیلہ جو تمہارے اور تمہارے متشرع و متقطع اصحاب کا حقِ جائز تھے اوروں میں بٹ گئے۔ بس نہیں کہتا تمہارا رنج بلا وجہ ہے، مگر صاحب ماتم داری اور شکوہ و شیون کے بھی کچھ آداب ہیں۔ اشراف گالیاں دیتے ہیں، سینہ پیٹتے ہیں مگر ایک طریقے سے۔ قبلہ یہ فن ہر ایک کو نہیں آتا۔ جگی بازی سے خود اپنا دہن بگڑ تا ہے۔ زید و بکر و عمر کا کچھ نہیں جاتا۔ مانا لشکرِ شوکتِ اسلام کو شکست ہوئی مقدس دو رمانِ حضرت ابوالاعلیٰ مودودی۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں۔ نواب ممتانہ محمد دولتانہ فرمانروائے لنڈن اور دیگر اہلِ اسلام کے خواب سلطنت پر قابض ہونے کے خاک ہوئے۔ سنیئے قبلہ حضرت مجید نظامی نے اپنے مربی و محسن عالی جناب دولتانہ کو ایک ورقِ اخبار میں بایں امر اکسایا کہ نظریہ پاکستان کی پاسبانی کی خاطر شہر آشوب لاہور کے کوچوں میں جاروب کشی کریں۔ وہ نہیں مانے۔ جھاڑو نہیں خریدی۔ چپکے سے لیلائے سفارت کو سینے سے لگایا اور لندن میں جا بیٹھے۔

القصہ مختصر۔ کیونکر نہ کہوں کہ اس رسالہ اہلِ اسلام "زندگی" کی حیاتِ نو پر مجھ کو خوشی نہ ہوئی۔ سخن گستری کی وہی سج دھج نیشِ عقرب لیئے ہوئے فقرے خرافت ولغو کا پلندہ، ہر عنوان مضمون کا اعلان کنندہ ہے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے۔ میاں جی، سانپ نکل گیا کب تک لکیر پیٹو گے۔ فقیر معروض ہے۔ باز آ جاؤ۔ رونے دھونے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ایک مشورہ اس ضمن میں آپ کو دیتا ہوں۔ بوجہ مطابقتِ مواد آپ کے رسالے کا نام "زندگی" موزوں متصور کرتا ہوں۔ "جنازہ" بھی بڑا نہیں ——— پر ہم وزن اسم موجود کا نہیں۔ ان دونوں ناموں میں سے ایک انتخاب فرمایئے گا، تو آپ حسنِ ذوق کا ثبوت بہم پہنچایئے گا۔ اب عوام الناس اس نام کے بارے میں وسوسے میں ہیں۔ اس پرچے میں کراچی کے مناظرِ غارت گری کا سر عنوان "آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا" خوب جامع ہے۔

بے مطلب نہیں لیکن حضرت خفا نہ ہو جیے گا، جو یہ پوچھوں کہ یہ آگ گھر میں لگائی کس نے
تھی اور مدعا اس سے کیا تھا۔ حاشا وکلا حضرت کی طرف اشارہ کرتا ہوں تو جہنم میرا نشیمن بنے۔
پھر آپ لاہور میں بیٹھے ہیں۔ وہاں سے کراچی کے املاک وسامان کو ندرِ آتش کرنا بعید از قیاس ہے
ایک ورق پر دانشوروں کی گفتگو نقل کرتے ہوئے "ایک اعلانِ تاشقند۔ ایک اعلان شملہ اللہ تعالیٰ
کے ساتھ۔ ایک سرینڈر اللہ تعالےٰ کے سامنے" یہ کند ذہن مفہوم اس نقل کا سمجھ نہ پایا۔ گمان
کرتا ہوں کہ دانشور اس ریاست کے اعلانِ شملہ کو پسپائی اور اہلِ ہنود کے سامنے قبولِ طاعت
خیال کرتے ہیں۔ سبحان اللہ حضرت یہ دانشور لوگ کون ہیں؟ ابنِ آدم ہیں یا ملائکہ اطہار میں سے
وہ صفحہ اٹھا جس پر یہ مضمون مندرج ہے۔ ہاں ایک دانشور تو تم خود ہو۔ دوسرے ہمارے قاضی القضاۃ
آفتابِ توحید جناب بدیع الزمان کیکاؤس تیسرے خاتم الوکلاء محمد انور صاحب لاہوری،
چوتھے ماشاء اللہ خاندانِ ہاشم کے چشم وچراغ کوئی لڑکے ہیں مضمون میں نے پڑھا نہیں۔
عرصہ زندگانی قلیل ہے۔ سب رطب ویابس جو چھپتا ہے کون اسے پڑھے مفت میں بینائی
کا ضیاع کرے۔ ہاں تو ان دانشوروں کے نزدیک اس مردِ فاسق ذوالفقار علی بھٹو نے
اہلِ ہنود کی رانی کے روبرو گھٹنے ٹیکے مومنین ومومنات عالم کی تذلیل کی۔ واہ! ان روشن
خیال دانشوروں کی نہج فکر، کج فہمی کا جواب نہیں۔ کیا آپ کی اور آپ کے بھائیوں کی ہوسِ
ملک گیری وخونریزی ابھی باقی ہے؟ قیاس کرتا ہوں کہ اہلِ اسلام کا جی ابھی خون خرابے۔
قتل وغارت سے بھرا نہیں اور اس وقت تک بھر نہیں سکتا جب تک کہ ملک میں گدھے
کے ہل نہ پھر جائیں یا جب تک موجودہ حاکم اعلےٰ بھٹو بعد معزولی تختہ دار پر نہ چڑھ جائے۔
مشرقی خطے میں تباہی عظیم ہوئی۔ تب باغیوں کے سرغنہ دیش بندھو مجیب کی تم نے پیٹھ ٹھونکی
اس کی فتح مندی پر چراغ گھی کے جلائے اس واسطے کہ اس کی جیت میں تمہیں بھٹو کی ہزیمت
میں یقین ہوا۔ اس کے پہلے دورِ حکومت میں ہزارہا اہلِ اسلام خطہ بہار کے ذبح ہوئے
فوج نے بغاوت کو کچلا لیکن کس قیمت پر؟ لاکھوں جانیں گئیں۔ بنگلہ میں جان ومال وناموس و

مکان و مکین و آسمان و زمین۔ سب آثارِ ہستی لٹ گئے۔ کوچے کوچے۔ قریہ قریہ موت ناچی۔
فوراً بعد باغیوں نے افواج ہنود کی معاونت سے ساتھ محصور افواجِ اسلام پر حملہ کیا۔ اس
قتلِ عام میں موت ارزاں ہوئی۔ ہزاروں مر گئے۔ ہماری سپاہ کے رسد کے راستے بند ہوئے
اور اس کے کمانڈر نیازی صاحب نے ہنود کے سپہ سالار اروڑا جیت سنگھ کے آگے ہتھیار
ڈال دیئے۔ حضرت کمانڈر بے چارا کرتا بھی کیا۔ کوئی فوج! دنیا کے کسی ملک کی، پیٹ بھرے
بغیر اور بے کمک لڑ نہیں سکتی۔ حضرت اور قاضی القضاۃ جمع الجمع والا صفات کیکاؤس سے
سچے مومن ہی بے تیغ لڑ سکتے ہیں۔ قبلہ یہ اچھا موقع تھا آپ کے لئے اپنے جوہر دکھانے
اور مرتبۂ شہادت پانے کا۔ یہ جو آپ قلم کے جہاد میں زور مارتے ہیں اچھا کرتے ہیں۔
اس میں جان و مال پر آنچ نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ گھر سے جیل۔ جیل سے گھر۔ جیل کے کمرے
میں بھی قالین۔ چاندنی۔ گاؤ تکیئے۔ پیک دان۔ غرض کل سامانِ راحت مہیا کرتے ہیں۔
خاطر مدارات پوری ہوتی ہے۔ سرکار سے صفائی ہو جانے پر جیل سے رہا ہوئے۔ حواریوں کی
طرف سے درِ زنداں پر رسم استقبال عمل میں آئی۔ پھولوں کے گجرے، زانو تک لٹکتے پہنے۔
حلیہ مبارک کی عکسی تصویریں کھینچی گئیں۔ عوام الناس کی جانب سے "شمع فروزانِ وحدت، منبع
حریت، کا خطاب ملا۔ غرض اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

ہاں تو میں جناب سے اس قیامت کا ذکر کر رہا تھا جو مشرقی خطے پر ٹوٹی۔ وہ اب کٹا۔
ملک کا ایک عضو دوسرے اعضا سے الگ ہوا۔ اب سنو غربی خطے کا حال، یہاں بھی افواجِ
اسلام پسپا ہوئیں۔ لشکرِ ہنود کے پاس گولہ بارود کی افراط تھی۔ اس خطے کا پانچ ہزار مربع
میل علاقہ غنیم کے تسلط میں آیا۔ حضرت جہان نوردی کا شوق تو آپ کو ہے، ہی کبھی موٹر کار
میں بیٹھ کر سیالکوٹ کے آگے تشریف لے جایئے گا۔ ہزارہا لوگ لٹے پٹے بدحال۔
بھوکے، وہاں چلچلاتی دھوپ میں آسمان تلے پڑے ہیں۔ چھوٹے بچے ننگ دھڑنگ بھیک
مانگتے ہیں۔ ان سے پوچھیے جنگ کی ہولناکی کیا ہوتی ہے؟ دانشور کیونکر جانیں گے۔

محل سرا کے ٹھنڈے دیوان خانے میں بیٹھ کر کل جہان کے لتے لینا شغلِ مکروہ ہے رسبد کہوں؟ مولانا کہوں؟ جو بھی کہلاتے ہو خوش رہو۔ میرے قریشی صاحب ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔ جو کام بھٹو کرتا ہے۔ تم اور تمہارے ہم خیال اس میں کیڑے ڈالنے پر تُلے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو سے اگر آپ کو خدا واسطے کی عداوت ہے۔ تو کیوں اس سے بسبیل رسالہ التجا نہیں کرتے کہ تخت و تاج سے الگ ہو بیٹھیں۔ سلطنت آپ کو یا آپ کے برادر اکبر کو سونپ دیں۔ آپ کے رسالہ کے مضامین کے سرسری مطالعہ سے یقین ہوا کہ آپ جیسے دانشوروں کے پاس قلمرو ئے پاکستان کے کل مسائل کا حل موجود ہے۔ آپ کو حکومت ملنے کی دیر ہے۔ ملک ہندوستان ہیں قید ہمارے سپاہی پل بھر میں لوٹ آئیں گے۔ عملداری سندھ میں زبان کا تنازعہ چٹکی میں سلجھ جائے گا۔ بھوک، ننگ اور بے کاری کے بھوت بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انہارِ شیر و انگبیں چار سو بہنے لگیں گی۔ گندم کا نرخ اتنا گر جائے گا کہ لوگ اناج کی بجائے پھل کھائیں گے۔ مہارانی اندرا گاندھی اس ریاست کے حاکمِ اکبر کو سال بسال خراج ادا کرے گی۔ مجیب الرحمٰن سر میں خاک ڈالے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے خلیفہ مسلمین کے دربار میں مجرا عرض کرے گا۔ میری جان سچ کہو۔ تم اور تمہارے جیسوں کے اذہان میں یہ زعم کیونکر پیدا ہوا۔ اپنے عقلِ کل ہونے کا؟ کونسا طلسمِ مشکل کشا تمہاری تحویل میں ہے؟

دیکھو صاحب عالمِ کون و مکان دو ہیں۔ ایک ظاہری یعنی موجودہ، دوسرا جو ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ طبق سات ہیں اور بعض چودہ کہتے ہیں۔ تم پر سب روشن۔ مجھ کو یاد آیا انتخاباتِ عامہ سے کچھ مدت پہلے آپ نے اپنے اخبار میں اس کے ہونے والے نتائج کا ایک مفصل تجزیہ چھاپا۔ سب نے داد دی۔ گورے کالے نے حضرت کی ستارہ شناسی کا سکّہ مانا۔ مجھ پر بھی وار چلا۔ جب نتیجہ نکلا تو اس کو آپ کے فرمودہ قیافے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ آپ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ اس واسطے کہ فنِ ستارہ شناسی بہت

مشکل۔ بہت دقیق فن ہے۔ ماسوا میرے اس کو اس ملک میں کوئی نہیں جانتا۔ بروج کے نقش میں پھنس کے اور سارا معاملہ پٹ۔ عین غین ہوئی۔ یاد پڑتا ہے چھ نشتیں آپ نے بھٹو صاحب کی جماعت کو عطا کی تھیں۔ مولانا نہ صاحب کی جماعت پیش پیش تھی۔ نتائج نکلے۔ آپ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تیور پھر بھی نہ بدلے۔ یہی کہتے رہے، دھاندلی مچی ورنہ ہمارا تجربہ سو فیصدی درست ہے۔ آپ کا معرکۃ الآرا یادگار زمانہ "سقوطِ مشرقی پاکستان" کا مضمون بھی فقیر نے دیکھا۔ ہر واقعہ کی کڑی سے کڑی ملائی اور لاہور سے نکلے بغیر آفاتِ احاطہ بنگال کا آنکھوں دیکھا احوال قلم بند کر دیا۔ سابق حاکم اکبر جرنیل عالی شان آغا محمد یحییٰ خان کے اپنے کمانڈروں اور اربابِ سیاست کے ساتھ خفیہ مکالمات آپ نے من و عن بطرزِ سوال و جواب درج کر دیئے جیسے جب وہ باتیں ہوتی تھیں تم خود وہاں پردے کے پیچھے کھڑے تھے اس مضمون پر تمہیں بڑی ناموری ملی۔ فقیر جس مجلس میں جاتا تمہاری دیدہ بینا کا چرچا سنتا۔ حق یہ ہے کہ "ٹائم" کے اسٹورٹ الساپ کو آپ نے مات کیا۔ فضیلتِ علوم غیبی میں تمہارا نظیر نہیں۔ قبلہ گستاخی پر محمول نہ کیجئے گا۔ میں قیاس کرتا ہوں کہ آغا صاحب آپ سے ہر مسئلہ پر مشورت لیتے تھے اور غالباً معزولی سے پہلے اپنے سارے ٹیپ ریکارڈ اور خفیہ مراسلات آپ کو عنایت کر گئے تھے۔ ممدوح خدا جانے آج کل کہاں مسکون ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ پاس ہوتے تو ان سے پوچھ لیتا۔

کوئی صاحب انشورنس کے ایجنٹ ہیں ملتان میں چوہدری سعد اللہ یا اسد اللہ خان، ان کا نام سعد یا اسدان کا تخلص ہے۔ میری ان کی یہاں صورت شناسی ہوئی۔ اب ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ کبھی وہ آجاتے ہیں۔ کبھی میں ان کے ہاں چلا جاتا ہوں وہ جناب کے مداحوں میں سے ہیں اور آپ کی صلاحیتوں کے معترف۔ گذشتہ دوشنبہ ان سے ملا تو آپ کا ذکر خیر چلا۔ ان سے آپ کے اخبار "جسارت" کی روئداد معلوم ہوئی۔ یعنی اس کے نکالنے کے لئے آپ کی دوڑ دھوپ۔ مختلف اہلِ اسلام مہاجنوں سے رقوم کی فراہمی

مطبع کا تصرف۔ افسوس اخبار نہ چلا۔ مہاراجہ مولراج کے زمانے سے ملتان کے باشندے مسائل و شعائر اسلامی سے ہٹے ہوئے ہیں۔ کبوتر بازی کو اخبار و کتب بینی پر فوقیت دیتے ہیں۔ میں نہیں کہتا یہ برا ہے کبوتر اڑانا بے پر کی اڑانے سے بہرحال بہتر مشغولیت ہے کسر و ضرر اس میں کچھ نہیں۔ آپ کو طوعاً کرہاً، جسارت بند کرنا پڑا۔ سعد یا اسد صاحب کی اس بات کو باور نہیں کر پاتا کہ مہاجنوں، ساہوکاروں کے ہزاروں لاکھوں کے قرضے آپ ہضم کر گئے۔ وہ بیٹھے روتے ہیں۔ اخبار کے عملے اور کاتبوں کی کئی ماہ کی تنخواہیں اب تک ادا نہیں ہوئیں۔ وہ الگ روتے ہیں اور لاہور سے آنے والی گاڑیاں دیکھتے ہیں، اخبار بند ہونے کے بعد مطبع ایک صاحب ح ـــــ کہ اس کے اصل مالک و منصرم تھے چلاتے رہے آپ کو اس کا یوں بیٹھنا اور گلچھرے اڑانا پسند نہ آیا۔ قانون کی گتھیاں میں جانتا نہیں۔ بقول اسد یا سعد صاحب آپ نے اپنے برادرِ اکبر اعجاز حسن قریشی مدظلہ، پر عدالت میں مطبع کی کمپنی پر قرضہ کی وصولی کی نالش کر دی نتیجہ اس کا یہ کہ مطبع کا سرکاری نیلام ہوا۔ مشینیں بک گئیں۔ وہ صاحب اصل مالک مطبع کے اپنے وسیلہ رزق سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایسا دھچکا اہلِ اسلام کے ہاتھوں لگا کہ دماغ میں فتور آگیا اب کسی کو جانتے نہیں پہچانتے نہیں۔ جلال میں آتے ہیں تو اینٹ پتھر اٹھا اٹھا کر سڑک پر دھرتے ہیں۔ اس مقصد سے کہ ٹریفک رک جائے۔ اگر آپ میری تسلی، خاطر اور تسکین دل کے لئے حقیقت واقعی سے مجھ کو اطلاع دیں گے تو اس میں فلاح آپ کی ہوگی، نہ میری۔ خدا کو حاظر ناظر جان کر سچ سچ کہیئے گا، کیا واقع میں الطاف حسن قریشی مدعی نے اعجاز حسن قریشی مدعا علیہ پر بابت قرض مطبع کے استغاثہ دائر کیا اور کیوں؟

قبلہ ایک زمانے میں اکابر سے آپ کی ملاقاتوں کا بڑا شہرہ تھا۔ وزراء وامرائے ریاست میں شاید ہی کوئی طالع بخت ہدفِ مشقِ سخن ہونے سے بچا ہو۔ بیرونِ ملک کے ملوک و شرفا بھی جناب کی دست برد سے مامون نہ رہے۔ ترکی کے ڈیمرل صاحب اور

عصمت انونو صاحب سے لے کر آپ نے ارضِ عربیہ مقدسہ کے والی شاہ فیصل تک سے ملاقاتیں کر ڈالیں، خوب اختلاط و انبساط کی باتیں کرتے ہو لیکن اکثر بے مطلب اور اوٹ پٹانگ خود نمائی کا عجب ڈھنگ ڈھونڈا ہے۔ یاد رہے آپ نے تا حال ملکہ معظمہ الزبتھ دوئم (الزبتھ اول مدت ہوئی ان کا انتقال ہو گیا) اور ملکِ حبشہ کے شاہنشاہ حضرت ہیل سلاسی سے ملاقات نہیں کی۔ فقیر خضر کے پاس بھی تم نہیں پہنچے۔

کافی ہرزہ سرائی کر لی۔ کاغذ بٹ گیا۔ سیاہی سوکھ گئی۔ تم سے باتیں کرنے سے دل نہیں بھرا۔ فقیر اب دو آم کھائے گا اور پھر بستر پر لیٹ کر نیند کو آواز دے گا۔ آئے گی نہیں۔ آپ اپنا کام باستقامت جاری رکھیے گا۔ ہر کس و ناکس کے پُرزے اڑائیے۔ آپ کے ضو فشاں قلم نے ملک کے نصف حصے سے ظلمتِ کفر کو مٹایا۔ اب نصف ملک رہ گیا ہے۔ دیکھیے حضرت یہ کام بھی تمام ہونا ضروری ہے۔ ادھورا نہ رہے ——

والسلام

خضر بے ننگ و نام۔ ۱۸ جولائی ۱۹۷۲ء

ڈاکٹر حنیف فوق کے نام ——

کیوں یار کیا کہتے ہو۔ اس ریاست کے خطۂ غربی کی آب و ہوا ہمارے فوق میاں کو راس آئی۔؟ کراچی کے جامع العلوم کی کرسی مبارک۔ دیرینہ دوستوں کا ملنا مبارک۔ افکار کے شاہ نشینِ ادارت پر منشی صہبا لکھنوی کی جلیسی مبارک۔

ڈاکٹر حضرت۔ چیرب (CHERUB) ایک لفظ لغتِ انگلستانی کا ہے۔ اردو لغت میں "چیرب" کا مترادف لفظ کوئی نہیں۔ مولوی عبد الحق کے انگلش سے اردو لغت میں "چیرب" کے معنی "پردار معصوم بچہ" بتائے گئے ہیں۔ جب میں پہلی بار تم سے

منشی صہبا کے دولت کدہ پر ملا۔ تو معاً "جبرب"، کا تصوّر میرے ذہن میں آیا۔ کھلتا ہوا نومولود بچے کا گول چہرہ۔ پیشانی پہ خمِ زلف۔ بوٹا سا قد و قامت اور عضو عضو میں شادمانی و بشاشت کی لو۔ خیال باندھا کہ ابھی اڑتے ہو اور بازو تمہارے گویا پر ہیں۔ فقیر کے ایک استفسار جاہلانہ پر تم نے فرمایا:

"قربان جائیے آپ کی معصومیت پر"

اس ادائے بے تکلّفانہ پر میں قربان ہوا۔ مہربانی و شوخی کے کلمات تمہارے اب یاد آتے ہیں۔ کبھی خدا مجھ کو پھر وہاں تمہارے شہر میں لائے گا تو دوبارہ قندِ تکلّم کا مزہ آئے گا۔ بھائی بشر کے کئی جنم ہوتے ہیں۔ میرا ایک جنم اس شام کو صہبا کے گھر میں ہوا۔ رونق الدولہ نے تمہارے اوصاف شائستہ کو خوب بجایا اور وہ یوں کہ ترنگ نشۂ لیکر' QUOR اے میں ہمارے اور مولوی محمد کاظم لاہوری اور خاتم الظرافت مشتاق احمد یوسفی اور کل صاحبان کے جو منشی صہبا کی عیادت و مزاج پرسی کو اکٹھے ہوئے تھے لتّے لے ڈالے۔ تم سے البتہ لحاظ برتا یا تم غالباً دیر میں پہنچے اور یہ تماشا دیکھا نہیں۔

اس خاک دانِ تیرہ و تار میں علومِ دنیوی کے ڈاکٹروں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک ڈاکٹر وزیر آغا۔ دوسرے ڈاکٹر وحید قریشی اور تیسرے آپ۔ یہ نہیں کہتا کہ ان ہر سہ میں کون زیادہ جی کو لگا۔ کس واسطے کہ دوسرے دو حسد کریں گے اور اس ہیچمداں پر خفا ہوں گے۔ تم پر البتہ پیار آیا۔ ربطِ بے تکلّفانہ صرف تم سے ہوا۔ کام کے آدمی تم نکلے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے دو کام کے نہیں حضرت۔ بندہ جاہل ان پڑھ ہے۔ ڈاکٹروں کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا خود کو اہل نہیں پاتا۔ باتیں اکثر ان کی سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ تم سے جو ہمارا میل جول بڑھا تو وہ رونق الدولہ کی سفارش پر۔ شوقِ شطرنج نے ہم کو یکجا کیا۔

چلبلے لا اُبالی و خوش دل تم خود ہو اتنی ہی تمہاری نگارش نقد و سنجیدہ ہے۔ یہ بات

میرے لئے موجبِ حیرت ہے۔ تم ہو اصلاً انقلابی آدمی۔ صاحب کس چکر میں پڑے ہو۔ چاہتے ہو لوگ اس ریاست کے اوہام سے نکلیں۔ اہلِ مغرب کی ریشہ دوانی کو پہچانیں۔ اچھا خیال ہے ناممکن اس کو نہیں کہتا۔ پر میاں اس ریاست میں وہ جو زمانہ حال ہے۔ اہلِ یورپ کا ماضی پارینہ ہے۔ اتنی جلدی حالات کیوں کر بدلیں گے؟ اللہ اللہ کیا کرو۔ اور فسانہ وفسوں کہا کرو حیاتِ انسانی غالیچۂ اصفہانی کے مانند بے معنی ہے۔ غمِ فردا فضول چیز ہے۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ نہ کسی کو رؤو۔ اور نہ کسی کی فاتحہ دلواؤ۔ جو عیشِ صحبتِ یار اور شغلِ ذہنی کا اس کلبۂ احزان میں میسر ہے وہ سمیٹو اور اپنی راہ لو۔ آگے کچھ نہیں اور یہ حقیقت ہے۔ اسد اللہ خاں غالبؔ فرماتے ہیں۔ شعر

مجھ کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

انشاء اللہ تعالےٰ مجھ کو اس سرما میں اپنے شہر میں دیکھیے گا۔ کیونکر دیکھیے گا۔ فقیر بے مقدور محتاج ہے۔ ریل کا کرایہ کیسے جڑے گا۔ رونق الدولہ کے موٹر کا ڈھنچر بھی سولجر بازار میں ایک کباڑیے کی دکان پر ٹائر ٹیوب کے بغیر پڑا ہے۔ کیونکر آپ کو جامع سے لایا جائے گا؟ رسمِ طعام کینٹین کے چینی بھٹیار خانے میں کیسے عمل میں آئے؟ لو ٹائیٹ بیکری نان بائی کی خطائیاں کیسے اکھٹے مل کر کھائیں گے۔

دیکھو فوق صاحب زمانہ اور کیا کیا دکھاتا ہے؟ ـــ اللہ، اللہ، اللہ ـــ

فقیر خضر ـــ ہفتہ ۷ راکتوبر ۱۹۷۲ء

مولانا منظور حسین المتخلص ماہرالقادری کے نام ـــ

مشفقی مکرمی مولوی منظور حسین صاحب نور اللہ قلبہ بالاسرار وعلینہ بالانوار

حضرت ایک مدت سے آپ کے نادیدہ پرستاروں میں خود کو شمار کرتا ہوں۔ کوئی پچیس برس ہوتے ہیں، آپ کے حلیۂ مبارک کی ایک جھلک کراچی کے ایک مہاجن کے دفتر میں پائی۔ فقیر اس کا تنخواہ دار گماشتہ تھا۔ تم غالباً کسی کارِ خیر کے لئے چندہ لینے آئے تھے۔ تب بے مروت و بے ریش اور بے حد چلتے پرزے آدمی تھے۔ اب سنتا ہوں۔ داڑھی رکھتے ہو اور حج پر کئی بار ہو آئے ہو۔ گویا الحاج بالاستقلال و بالاصرار ہو۔ تمہارا انٹرنیشنل مطبع کے چھاپے کا رسالہ موسوم بہ "فاران"، تمہارے عشقِ رسول اور تبلیغِ دین شرع محمدی میں استغراق پر دلیل ہے۔ فقیر کی نظر سے اس کے مضامین، بلشتر آپ کے اپنے لکھے ہوئے گزرتے رہتے ہیں کتب فروش سے خرید لیتا ہوں کس واسطے کہ ہماری نظر میں کے عنوان کے مضمون میں زیرِ تبصرہ کتب کی غلطی ہائے صرف و نحو اردو درج کر دیتے ہو اور ان کے مطالب سے کوئی سروکار تم کو نہیں ہوتا۔ اچھا ڈھنگ تبصرہ و تنقید کا وضع کیا ہے۔ ماہر القادری یا قادر الماہری ہونا اس کو کہتے ہیں۔ کئی مصنفین و مؤلفین کی محنت اس اصلاحِ بے محابا سے اکارت ہوئی۔ اور وہ مزید کچھ لکھنے کے نااہل ہوئے۔ بالتخصیص اقبال لاہوری فیض احمد فیض اور اہلِ پنجاب کے دوسرے سخنوروں کو کبھی بخشتے نہیں۔ حضرت میں قائل ہوا کہ اہلِ پنجاب پُرلچ، اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ اردو زبان میں مشقِ سخن سے کنارہ کریں۔ تو گویا اس پر احسان کریں۔ روزمرہ صاف دلی کے کوٹھے بازار کا، علم قواعدِ نحو، پنجاب والے بےچارے جانیں تو کیونکر؟ — آئندہ ان لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا کلامِ نظم و نثر بہ مشورت آپ لکھیں۔ یعنی اپنے رسالوں کو مطبع میں دینے سے پہلے آپ سے اصلاح لے لیا کریں۔ میں نے مانا کہ اردو زبان کے صحیح لکھنے اور بولنے پہ مدار ہے اس کرۂ ارضی کے اپنی جگہ پر قیام کا، ورنہ آفت ٹوٹ پڑے گی۔

پچھلے ماہ جون میں فقیر کراچی گیا۔ ہمارے جگری یار رونق الدولہ کی دختر روشن اختر کی شادی تھی۔ انہوں نے ایک دن میرے سامنے آپ کا اور جدن بائی کا معاملہ بیان کیا کہ

جب وہ کلکتہ میں ایک فلم کمپنی میں نوکر تھی۔ تمہارا اس کے ہاں اکثر آنا جانا تھا۔ ان میں تم میں پہروں اختلاط ہوتے تھے۔ وہاں ایک ڈومنی ستم پیشہ نرگس نام تھی۔ تمہارا اس بے درد پر دل آیا اور تم نے اس کی تعریف کے اشعار باندھے۔ اس نے تم سے التفات نہیں کیا اور تم انگاروں پر لوٹتے تھے۔ حضرت! شرمانے کا پشیمان ہونے کا مقام نہیں۔ ابتدائے شباب میں یہ بیتا سب اہلِ دل پر ہو گزرتی ہے۔ زخمِ عشق کھاتے ہیں اور لگاتے ہیں۔ اس عمر میں جو پیری میں اپنے تقویٰ وفیضِ روحانی کے واسطے مشہور ہوتے ہیں زہد و ورع سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ تقاضائے بشری ہے۔ میری سنو! ـــــ ایک وہ زمانہ مجھ پر آیا تھا۔ کہ مس سلوچنا اور مس مادھوری اور مس کجن کی یاد میں بستر پر پڑا تڑپتا تھا اور دنیا کی کل چیزوں سے جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ کوئی فلم ان ماہ وشوں کی ایسی نہ تھی جو میں نے تین چار بار نہ دیکھی ہو۔ میرا کمرہ حویلی کے ایک کونے میں تھا اور میں پہر دن ڈھلے چراغ گل کر دیتا۔ اپنے لحاف کے نیچے کتابوں کی تہیں جما کر، تاکہ والد یا کوئی اور آئے تو ان کو میرے سوتے ہوئے ہونے کا گمان ہو، میں چپکے سے کنڈی کھول باہر نکل جاتا اور دروازے کو اسی طرح بھیڑ دیتا۔ ایک نیم شب مس مادھوری کو دل میں بسائے فلم سے لوٹا تو دروازے کی کنڈی کو اندر سے بند پایا۔ میں ڈرا کہ میرا فریب گھر والوں کو معلوم ہوا۔ اور پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ جاڑے کا موسم۔ سردی کی شدت۔ ساری رات باہر ایک کوٹھے میں پڑی چارپائی پر ٹھٹھرتے گزری۔ مس مادھوری کو یکسر بھولا۔ صبح ہوئی تو دیوار پھاند آنگن کے راستے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سب محوِ خواب تھے۔ حضرت میرا ڈر پکڑے جانے اور راز کے افشا ہونے کا فضول، فقط میرے پیارے برادرِ اصغر نے جو میرے کمرے میں سوتا تھا چٹخنی میرے گئے پیچھے لگا دی تھی اور اس کو میرا غائب ہونا معلوم نہ تھا۔ ہا! ہا! ہا!۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ طرفین میں قطع تعلق ہوا۔ بوجہ اس کے کہ وہ تینوں ڈومنیاں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور مجھ کو، ہجومِ آلامِ جسمانی و روحانی نے اس طور گھیرا کہ جذباتِ عاشقی و

زندگی سرد ہو چکے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ تم اس معاملے میں ہمارے ہم درد ہو۔ دونوں سے یہ کوچہ چھٹ گیا اور خدا ہم دونوں کو بخشے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔

سچ کہیے گا وہ ادائیں اب بھی یاد تو آتی ہوں گی اور سانپ کلیجے پر پھرتا ہوگا۔ بادی النظر میں تو پریوں کی تسخیر سے تائب ہوئے اور داڑھی رکھ حج سے مشرف ہو کر رسالہ "معرفت" فاران، نکال کر اہل اللہ ہوئے مقرب بارگاہ کبریا بن گئے۔ البتہ یہ بات ہے کہ اپنی وضع دوسروں کے رسائل میں خوردہ گیری و عیب جوئی کی آپ نے نہیں بدلی۔ شاباش۔ اس وضع کو نہ چھوڑیئے گا۔ آپ جو اصلاح کل سخنوروں کے کلام پر دیتے ہیں۔ اسی کی بدولت زبانِ اردو کا وجود اس بھنگڑ خانہ میں قائم دائم ہے۔ چشم بد دور طبیعت ہمارے مولانا صاحب کی نہایت عالی اور مناسب اس فن کے ہے۔

ایک زمانہ میں آپ لاہور کے ایک رسالہ موسوم بہ "مست قلندر" میں قصائص حسن و عشق لکھتے تھے۔ تب میں بھی "مست قلندر" پڑھا کرتا تھا اور گمان کرتا ہوں کہ یہ قصائص میری نظر سے ضرور گزرے ہوں گے۔ اب نسیان کی شدت سے اور بوجہ اس دوران میں بسیار رطب و یابس پڑھنے کے، ان قصائص کا مزہ اور مدعا بھول گیا۔ ایک مہتمم مطبع ملتان کے دوست میرے پاس ہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کم و بیش چوبیس رسائل آپ کے تصنیف کردہ، نظم و نثر اردو میں چھپ چکے ہیں۔ واقعی "قادر الکلامی" اس کو کہتے ہیں۔ فقیر کے صرف کلام نثر کے تین رسائل انطباع ہوئے۔ فن شعر سے بیگانہ محض ہوں۔ اور برعکس آپ کے، یک رنگ ہوا۔ آپ کی لکھی داستان بعنوان "جب میں جوان تھی"، اور "محبت بھرے خطوط"، کا رسالہ اور قصائص و حکایت کے مجموعہ ہائے گراں بہا کے نسخے اگر وہاں کسی کتب فروش کے پاس موجود ہوں تو مول لے کر بسبیل پارسل ارسال کیجیے گا۔ بیرنگ پارسل یعنی ٹکٹ لگائے بغیر ڈاک خانہ والے نہیں لیتے۔ پارسل کے پہنچنے پر دعا دوں گا۔

حضرت کی جہان نوردی بالتخصیص افریقہ نوردی سنی۔ نواب سر جیرڈ بریٹن بہادر اور شفاء الملک

حکیم سعید صاحب دہلوی ہمدرد دواخانہ والے اور منشی شیر محمد المتخلص ابنِ انشا صاحب کے پابیہ کے سیاحانِ جہاں کے جرگے میں شامل ہوئے۔ جب میں نے یہ خبر پہلے پہل ایک شخص سے سنی تو قیاس کیا کہ مشرقی افریقہ شیر اور گینڈے سے شکار کی خاطر جاتے ہو یا کسی حسینہ حبش کو دامِ مناکحت میں گرفتار کرنے کا عزم بالجزم باندھا ہے۔ اصل حال اب مجھ پر باز ہوا اور معلوم ہوا کہ آپ مشرقی افریقہ میں پہنچے تھے اہلِ افریقہ کو دعوتِ اسلام دینے کے ارادہ سے تاکہ تعداد مسلمین میں اضافہ ہو حضرت کتنے افریقی مردم خدا آپ کی تبلیغِ پُرفصیح کے طلسم سے مسلمان ہوئے؟ پانچ۔ چھ۔ بارہ۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے براعظم افریقہ کے مختلف مقامات پر اردو زبان میں تقاریر کیں اور جنوب کے ایک شہر موسوم بہ ڈربن، میں زبان اردو کی تدریس کا مدرسہ بنایا۔ کوئی دن ہی جاتے ہیں کہ سیاہ فام حبشی اس براعظم ظلمت نشان کے فرفر اردو بولنے لگیں گے۔ ماشاءاللہ وہاں مشاعرے بھی پڑھے۔ اہلِ افریقہ کے کون کون اردو کے شاعر نامور ہیں؟ فقیر نے ان کا کلام نہیں پڑھا۔ ان کا نام نہیں سنا۔ ایک بات اور مشہور ہے۔ وہ یہ کہ ہر سال اخیر گرما میں جا پہنچتے ہو اور تمہارے لوٹتے ہی اوائل سرما میں حضرت خاتم العلماء المتبحرین نکاح الدولہ مولوی احتشام الحق تھانوی بستر باندھ کر ادھر کا رخ کرتے ہیں ستم ربیع کاٹ کر آتے ہو۔ وہ خریف کی یافت بٹورتے ہیں۔ آپ کے مولد و وطن کیسر کلاں ضلع بلند شہر کا نام آپ کے کارناموں کے طفیل اونچا ہوا۔ وہاں کے اشخاص کسی باہر کے آدمی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور آپ کا شمار بھی کراچی میں اس ڈھنگ پر ہے۔

ہاں حضرت ایک اور بات —— اردو زبان کے مشہور پنجابی شاعر حضرت استاد امام دین گجراتی ایل۔ ایل۔ جی کا نام آپ نے سُن رکھا ہے؟ ان کا مجموعہ کلام موسوم بہ بانگِ دہل، کا نقش ثانی حال ہی میں لاہور کے ایک مہتمم مطبع نے چھاپا ہے۔ اردو پر یوں احسان کیا ہے کہ یہ کتاب بازار میں نایاب تھی۔ اپنے طرز میں ان کا ثانی اس قلمرو میں پیدا نہیں ہوا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اب کے آئندہ دفاران کے شمارے میں اس پیمبر شاعری کے

دیوان کو زیرِ غور رکھیئے اور اس کے کلام کی اصلاح میں محنت فرمایئے۔ یہ کام کرنے کا ہے۔ اور ایک کام فقیر سے تعلق رکھتا ہے۔ لو سنو۔ مادہ تاریخ میری وفات کا لکھ بھیجئے گا۔ علمِ نجوم سے منکشف ہوا کہ ۱۹۹۲ء میں صرف بہتر برس اس زندان میں گزار کر یہاں سے جاؤں گا۔ حضرت کو شاید پہلے بلا لیں۔ پھر مادہ اور کون شخص صحیح روز مرہ میں نکالے گا؟

امیدوار ہوں آپ اس ننگِ اسلاف کے مرقومہ مدحت نامہ سے خفا نہیں ہوں گے خوش رہو۔ شاد رہو۔ ملتان میں حضرت کا آنا ہو تو دیدار سے نہال کیجئے گا اور اس نیاز نامے میں جو اغلاط محاورۂ زبان کی آپ کو دل نشین ہوں۔ ان سے مجھ کو بواپسی ڈاک مطلع کر دیجئے گا۔

کپڑے کے کارخانے کے مالک محمد فاروق صاحب اور دیگر اصحاب کو جو آپ کے رسالہ "فاران" میں اپنے اشتہار دیتے ہیں۔ میرا سلام نیاز ——

بندۂ قادری خضر

ابوالاثر حفیظ جالندھری کے نام ——

کیوں خان صاحب ہنوز جیے چلے جاتے ہو۔ یہ نہیں کہتا کہ اب قصۂ زندگانی کو طول نہ دو۔ لیکن العاص حسّاد طبع ابھی سے آپ کو اموات میں شمار کرتے ہیں۔ کس واسطے کہ کلام میں تمہارے اثر نہیں رہا۔ رہے تو کیسے قافیہ پیمائی کا ملکہ جو پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے باقی ضرور ہے مگر شعر کے لئے دل چاہیئے۔ دماغ چاہیئے۔ میں یہ کہتا ہوں تو دیدے پھوٹیں، آپ کے حسّاد یہ برملا کہتے چلے جاتے ہیں۔ وہ قوت البتہ آپ میں نہیں اور ولولہ شباب کی جگہ ہوسِ شباب نے لے لی۔ فقیر خضر کہتا ہے کہ ولولہ نہ سہی۔ ہوس ہی سہی۔ تابِ اختلاط شعر کہنے کے لئے ضرور نہیں۔ رال کا ٹپکنا ہی کافی

ہے۔ دل تو ہمارے ابوالاثر کا جوان ہے۔ نوّے برس کی عمر کو پہنچو تو پھر بھی ابھی تو

بس جوان ہوں، کی تکرار تم کو پھبے گی۔

لو ہنسی ہوچکی! سچ بات یہ ہے کہ تمہاری خوش بختی وطویل العمری میں کلام نہیں۔ آپ کے ہم عصر اور جگری دوست یکے بعد دیگرے رخصت ہوئے۔ اور باقی جو بچے ہیں رختِ سفر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ دس سال کا عرصہ ہوا ظریف الملک وکیل الدولہ احمد شاہ بخاری المتخلص پطرس نے نیویارک میں انتقال کیا۔ پھر شانِ صحافت مولانا عبدالمجید سالک اور صاحبِ فکاہات چراغ حسن صاحب حسرت نے کوچ کیا۔ ہری چند اختر گئے۔ چند ماہ ہوتے ہیں کہ شاہِ تمثیل سید امتیاز علی تاج کو ایک ظالم نے ان کی محل سرا کی چھت پر گراپ مار او رانہوں نے جان جانِ آفرین کو سپرد کی۔ آپ کے مربی ومحسن رکن الدولہ نصرت الملک، صادق دوست نواب صادق محمد خان عباسی خامس نے شہر لندن میں رحلت فرمائی۔ تم تو کیوں ان کے جنازے پہ گئے ہوگے اور کیوں ان کو روتے ہوگے۔ اللہ اللہ ایک زمانہ تھا کہ نواب کے دربار میں تمہاری طرف سے قصیدہ ہائے گراں بار نذر ہوتے تھے اور وہ قدر افزائی کرتے تھے۔ ان کی نظروں سے گرے اور ریاست سے بھاگے تو اپنی محسن کشی اور غیبت گوئی کی بدولت۔ نواب کا قصور اس میں کچھ نہ تھا۔ ان کے مرنے پر ایک مرثیہ بھی تم سے لکھا نہ گیا۔ خیر یہ قصہ دوسرا ہے کہنے کا مطلب محض یہ ہے کہ سب کو ایک ایک کرکے مار ڈالا اور خود ابھی رخشِ حیات پہ جمے بیٹھے ہو۔ باگیں قابو میں ہیں اور جام ومینا نظروں کے سامنے۔ وہ اضطراری عاشقی و ہوسناکی کی کیفیت جو لحہ تولد سے آپ پر طاری تھی۔ جوں کی توں قائم ودائم ہے بلکہ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ روبہ ترقی ومعراج ہے۔ واہ خاکِ پاکِ جالندھر! تیری مٹی سے جس خاکی کا خمیر اٹھا۔ وہ فرہادِ دوروسیو ہوا۔ فلکِ سخن کا نیرّ عالم تاب بنا۔ اور دشتِ زمزمہ پردازی کا لکشمن وہنومان!

صاحب! میں ایک مدت سے آپ کو جاننے والا اور آپ کا مدّاح ہوں۔ سن

شعور سے تمہاری نظمیں بچوں کے ایک رسالے "پھول" میں پڑھتا تھا۔ تاریخ ہند منظوم اور قصہ نثر عمر عیار کتنی ہی بار ایام مکتب میں پڑھے اور ان کا مزہ اب تک بھولا نہیں۔ ان کے مطالعے سے فقیر کو شعر و سخن کا چسکا پڑا اور یہ شوق جان لیوا ہے۔ سروش ایزدی اور صلاحیت خلقی کے بغیر شاہد زیبائے سخن کی تمنائے حصول اور اس وادی پُر خار و حیرت افزا میں سخت کوشی ایسی درد ناک کوئی شے نہیں۔ بہتیرے مجھ جیسے جستجوئے منزل میں کھپ گئے کچھ پا نہ سکے۔ ہاں میں تیرہ چودہ برس کا تھا۔ تم بہاولپور نواب بہادر کے دربار میں طالع آزمائی کو آئے۔ ان کے وزیر حضوری سے ملے اور نواب کی ملازمت اور ان کی بارگاہ میں باریابی انہی وزیر کے ذریعے سے تم کو حاصل ہوئی۔ غالباً مصاحبوں میں نام لکھا گیا۔ میرا باپ سرکار بہاولپور میں افسر آبادی تھا۔ اور تم ہمارے ہاں اکثر آتے تھے۔ خوب زبان آور و چالاک تھے۔ میرا باپ آپ کا بڑا یار تھا۔ کوئی جذبہ لطیف مشترک تم میں اُن میں تھا۔ دیوان خانے کی ایک مجلس میں ایک دن میں بھی بیٹھا تھا۔ آپ نے والد سے کہا "اختر! تم یہ سن کر حیران ہو گے اور میں بھی اگلے روز یہ جان کر متعجب ہوا کہ اردو زبان میں مختصر افسانہ نویسی۔ یعنی اہل یورپ کی شارٹ اسٹوری کی صنف کا بانی و موجد میں ہوں۔" ہر چند کہ میں اُن دنوں شارٹ اسٹوری کے معنی پوری طرح نہیں جانتا تھا۔ تمہارا یہ دعویٰ مجھ کو کچھ اوچھا سا لگا۔ لاف زنی اس طور کی دل کو بھاتی نہیں۔ تم نے جو یہ کہا تو کچھ غلط و غیر معمولی شیخی نہیں بگھاری۔ اہل سخن اکثر کے باب میں یہ قاعدہ کلیہ قائم ہوا کہ خودستائی اور اپنی آپ قدردانی بھری بزم میں کرنے سے ان کو عار نہیں آتی۔ یوں جی خوش کر لیتے ہیں۔

خان صاحب! وہ زمانہ تھا جب آپ کی تصنیف "شاہنامہ اسلام" کی دھوم تھی۔ اور جناب فردوسیٔ اسلام کہلاتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا یہ شاہنامہ بار بار چھپا۔ جابجا پہنچا۔ اور آپ کے ریاست میں آنے کی ایک غایت یہ بھی تھی کہ اسے نصاب درسی میں داخل کیا جائے۔ فقیر متعجب ہے کہ یہ تصنیف جو مقبول عام تھی۔ اب کباڑیوں کے ہاں بھی ڈھونڈے

سے نہیں ملتی۔ اتنی جلدی اس کا نام و نشان مٹ گیا اور کوئی اسے یاد نہیں کرتا۔ ہیہات آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ــ حضرت یہ وجہ افسوس ہو تو کیوں؟ــ بیشتر شاہکار ہائے ادب جن کی شہرت شروع میں عام ہو گئی۔ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد خاک ہوئے اور ان کا کلام دل و ذہن سے محو ہوا۔ آپ نے بھی اتنے ہزار اشعار جو سیرتِ نبوی اور تاریخ اسلام کے لکھ مارے تو وہ صرف اپنے ملکۂ نظم گوئی کے زور پر۔ مغز۔ اُن میں نہیں حسین خیال سے وہ معرّا! اور اسلام سے آپ کو علاقہ! زہد و ورع میں تم کو جاں کشی کرتے بھی نہ پایا۔ مصلےٰ اور تسبیح سے لاتعلق سدا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان واجباتِ دین میں غیر ضروری انہماک صوفیائے کرام کی روش کے منافی ہے۔

آپ کے پاؤں جو سرزمین بہاولپور سے اکھڑے تو پھر نہ لوٹے۔ نواب بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ آپ نے ایسا گزرانا کہ وہ ناراض ہو گئے۔ مشہور یہ ہے کہ آپ نے محفل جلوت میں اپنی نظم مثنوی موسوم بہ ابھی تو میں جوان ہوں، لہک کر سنائی۔ ایک حاسد مصاحب نے نواب کے کان میں پھونکا اور ان کو گمان گزرا کہ ابوالاثر نے میرے دربار کا نقشہ بیان کیا ہے۔ ایک نقل کے مطابق نواب ڈنڈا اٹھا کر آپ کو مارنے کو دوڑے۔ وزیر حضوری نے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ بہر حال آپ بہاولپور سے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور عمل داری صوبہ پنجاب کے شہر لاہور میں پناہ لی۔ ایک رسالہ ہفتہ وار کارزار، والیانِ ریاست، راجوں مہاراجوں کی عیش کوشیوں اور شاہانہ کشور کشائیوں کے بارے میں جاری کیا۔ وہ میرے باپ کے پاس آتا تھا۔ میں اس کی تاک میں رہتا تھا اور اپنے والد کے کتب خانے سے جا کر چوری چھپے اس کے مضامین کی سیر کرتا تھا۔ خوب مزے لیتا۔ تم بھی مصلحِ وقت اور معلمِ اخلاق کا روپ دھار کر اپنی عبارت میں لگی لپٹی نہ رکھتے۔ رجحلۂ عروسی میں، دردو درمان کے مدارج کی حکایت اول تا آخر بیان کرتے۔ ایک دن یہ رسالہ پڑھتا پکڑا گیا۔ والد نے جھٹ میرے ہاتھ سے چھینا اور تنبیہ کی کہ

خبردار پھر اس کو ہاتھ نہ لگانا۔ یہ تمہارے پڑھنے کا نہیں، میں نہیں جانتا تمہارا یہ کاروبار چمکا۔ یا اس میں گھاٹا پڑا۔ بہرحال کچھ مدت کے بعد ہی "کارزار" بند ہو گیا اور تم نے عریانی اور بے حیائی کے خلاف اپنے جنگ و جدال سے توبہ کر لی۔

انگریزی عمل داری میں خان صاحب سے خان بہادر تم ہوئے اور حاکمانِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کا ڈھب کوئی تم سے سیکھے۔ پاکستان وجود میں آیا اور تم نے نئے زعما کو شیشے میں اتارا۔ زمانے کے فساد کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ کئی نواب گورنر جنرل بہادر آئے اور گئے۔ تمہاری حیثیت بطور ریاست کے ملک الشعراء کے مسلم رہی اور وہ رزقِ ناؤنوش جو مقوی جسم اور مفرح روح ہے آپ پر کبھی مسدود نہیں ہوا۔ جیسے جہاز کو اپنی مینڈ نگاہ سارس کو اپنی مچھلی، مومن کو حور و قصور کا تصور مسافتِ بعیدہ سے پیشِ نظر رہتا ہے اسی طور تمہاری نگاہ حصولِ جاہ و منصب سے ہٹتی نہیں۔ پنشن و وظیفہ کا ہاتھ آنا مع فنِ نظم گوئی، اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ حضرت جب اس ریاستِ اسلامی کا ترانہ ملی بنانے کا موقع آیا تو کیوں کر حاکمِ اکبر کی نگاہِ قدر شناس آپ کو چھوڑ کر کسی اور پر پڑتی۔ آپ نے اہلِ مغرب کی طرح بیہ دھن پر خوب ترانہ بہ عبارتِ فارسی آمیختہ بہ عربی چست کیا۔ سب نے واہ واہ کی۔ اہلِ پارس نے خصوصاً اس کی تہنیت کی اور پیام بھیجا کہ ہمارا ترانہ پہلے سے موجود ہے۔ آپ کا ترانہ آپ کو مبارک۔ پانچ ہزار روپیہ مع خلعت اصلی تم کو اس کام کا ملا اور پنشن مستقل ہوئی۔ جب تک یہ ملک صفحۂ ہستی پر قائم ہے۔ تمہارا ترانہ بائیسکوپ گھروں میں عوام و خواص کھڑے ہو کر سنتے رہیں گے۔

آپ کو یاد نہیں ہوگا جب آپ لاہور میں "کارزار" نکالتے تھے فقیر اپنے باپ کے ہمراہ لاہور گیا اور ریلوے روڈ پر شمس العلماء مولوی ممتاز علی مرحوم کے مکتبہ دارالاشاعت پنجاب کے پاس ملاقات ہوئی۔ میرے باپ سے آپ کی انبساط و اختلاط کی باتیں ہوئیں۔ میں تب چودہ پندرہ برس کا ہوں گا۔ کیسی فرحت بخش باتیں تھیں۔ مہاراجہ بھپندر سنگھ والی پٹیالہ

اور نواب رام پور کے درباروں میں حسن و عشق کی گرمی اور رنگینوں کی داستانیں تم سے سُنیں۔ نواب رام پور نے تم سے فرمایا:

"ابوالاثر صاحب۔ ہوس کی سیری تب ہو کہ دو دھیا چاندنی میں برلبِ حوض یک صد ماہ وشانِ عریاں، لباسِ فطرت میں فراہم ہوں اور ہم تم اور مصاحبینِ خاص ان سے آنکھ مچولی کھیلیں۔"

جب تم نے یہ فرمودۂ شاہ نقل کیا تو دیدوں تمہارے میں عجب چمک تھی اور رال ٹپکتی تھی۔ میں نے گمان کیا کہ رام پور کے نواب بہادر خود تم ہو اور عالمِ تخیل میں نازنینانِ رنگین ادا سے موجِ وصل لوٹتے ہو اور اُن کی بلائیں لیتے ہو۔

سن یاد نہیں۔ کبھی سنا کہ تم انگلستان کسی طریق سے جا پہنچے اور ایک فرنگن ستم پیشہ کو مار کر گھر میں ڈالا۔ سر عبد القادر بیرسٹر نے غالباً اس بدبخت بی بی کا بمطابق شرع محمدی تم سے نکاح پڑھایا اور تم اس کو بیاہ کر وطن لوٹے۔ حضرت یہ اہلِ نصاریٰ کی بھٹیارن کی کون سی ادا آپ کو دل نشین ہوئی جب کہ خود بقول آپ کے مصرع

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

یہ بیل منڈھے چڑھی نہیں۔ وہ تمہاری شعر و شاعری کو کیا سمجھتی۔ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم، آخر تانا بنتے بنتے جی اچاٹ ہو گیا اور تمہیں اللہ کو سونپ کر جہاز میں سوار ہو گئی۔

دس سال کچھ اوپر کا عرصہ ہوتا ہے۔ میں اور میرے ایک جوان شیریں بیان، تیز ہوش دوست، ضیاء الحق چوہدری نام، تم کو کراچی میں ملے۔ ان دنوں آپ ایک سرکاری رسالہ 'سرزمین پاکستان' کے نگرانِ اعلےٰ تھے اور پادشاہانِ پاکستان نے آپ کو اور چند بے مقصد و بے کار نوجوانوں کو نان و نفقہ کی رسید بہم پہنچانے کو یہ ڈھنگ نکالا تھا۔ رسالہ کے دفتر میں محرر ٹانگیں میزوں پر پسار کر بیٹھے تھے اور لاف و گزاف

مارتے تھے۔ اشتیاقِ دیدار تمہارے حجرے میں کشاں کشاں لے گیا اور تم نے دروازہ کھلتے ہی شیشۂ نابِ انگوری بوکھلا کر میز کی دراز میں چھپایا۔ گیلے ہونٹوں کو کوٹ کی آستین سے پونچھا، باہوش ہو بیٹھے۔ میرے والد مرحوم کی باتیں خوب لطف و سرخوشی سے کیں۔ لہک لہک کر، منہ بنا کر، اور اُن کے بارے میں ”اختر میرا یار تھا“، تمہارا کہنا ہمارے دل کو بھایا۔ کیوں کر کہوں تم پر مجھ کو پیار نہیں آیا۔

یہ میری تم سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد نہایت مہر و محبت کے باوجود تم سے ملنا نہ ہوا۔ حکایاتِ فیروزمندی تمہاری پڑھتا ہوں اور خوش ہو لیتا ہوں۔ تم تو یک صد و سی سال جینے کا عزم باندھے ہو۔ میں اب تھک ہار گیا۔ اعضاء میں قوت نہ رہی۔ غدودوں کے ٹیکے خرید کر نے لگوانے کا مقدور نہیں۔ بس اب چراغِ سحری ہوں اور اس کا کلبۂ احزان میں حکمِ رہائی کا انتظار کرتا ہوں۔

قیاس میں ہم تم پھر اکٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارے طور و انداز وہی جوانی کے ہیں اور گمان کرتا ہوں کہ تمہاری باتوں میں شبِ زفاف کی معطّر سیج کے پھولوں کی پھر بو آئے گی۔ اور شاید اس میں ہلی جلی کافور کی ماتمی کی بھبک بھی ہو گی۔ ہا ہا!۔ پیری میں جوانی کا ولولہ قائم رکھنے پر کیوں تلے ہو۔ اس سے کیا حاصل؟۔ علی علی کیا کرو اور شاد و باہوش جیا کرو!۔

کیوں حضرت جان گئے اس خط کا راقم کون دیوانہ ہے؟ —

جواب کا طالب، خضر

چوہدری اکرام اللہ کے نام —

میری جان اکرام اللہ خان!۔

آج منگل کا دن ہے نومبر کی اٹھائیس تاریخ۔ ایک پہر دن چڑھے پلنگ سے سو کر اٹھا۔

آنگن میں دھوپ سینکی اور سگرٹ پیا۔ سنیے صاحب! جاڑے کی دھوپ بھی کیا نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ بدن کی ٹیسوں اور ذہن کی کدورتوں کے لئے تریاق ہے۔

شب گذشتہ کی تمہاری باتیں یاد آتی ہیں۔ جب تم مجھ کو بارہ بجے شب اپنے موٹر میں میرے گھر چھوڑنے آئے تو کیا کیا موتی تمہاری زبانِ مرتعش سے نہ جھڑے۔ میں نے وہ سکبا کر چن لئے۔ بچے کا سا بھولپن تب تمہارے چہرے پر تھا اور مجھ کو تم پر بڑا پیار آیا۔ اپنے زخموں کی پٹیاں کس معصومیت سے کھولتے جاتے تھے۔ تم کو تو وہ باتیں کہاں یاد ہوں گی کہ تم مدہوش تھے۔ توبہ، توبہ! مدہوش کیسے! اصل با ہوش تھے۔ ایسی مدہوشی خدا ہر ایک کو دے۔

تم نے کہا —— خالد خان خضر آیئے ہم دونوں ہردوار کو نکل چلیں، میں سنیاس لینے کا خواہاں ہوں۔ میں اپنے دنیاکے مرتبے کو بھٹی خانگی زندگی اور اس موٹر سے دق آچکا ہوں۔ مجھ کو اس جھوٹ سے نفرت ہے۔ خضر صاحب! یہ سب جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ ہے۔ میں ان چیزوں کو نہیں چاہتا۔ ان کو لے جاؤ مجھے لے جاؤ۔

واہ واہ۔ اکرام اللہ خان —— آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ ایک مدت کے بعد حق بات، راست بات ایک صاحبِ روشن ضمیر۔ ملتان کے فیلسوفِ دیوانہ سے میں نے سنی یہ چوہدری صاحب، ایک زمانہ تھا۔ فقیر خضر کی ایک مہایوگی سوامی پراوانند اسے کتابت تھی۔ اس کے ہمراہ کیلاش پربت اور جھیل مانسرور جانے کا قصد پکا کیا تھا۔ کسی وجہ سے ڈول نہ بندھا اور اس میں کسر میری طرف سے نہ تھی۔ سوامی کے اس سال کی یاترا میں کوئی امر مانع ہوا۔ بات اگلے برس پر پڑی اور اس طرح تساہل کی نذر ہوئی یعنی میں نہ جاسکا۔ ایک بار چلا جاتا تو یقین کیجئے گا لوٹنے کا نام نہ لیتا۔ کیلاش پربت کے دامن کوہ میں ایک خانقاہ ہے اور سوامی پراوانند جی نے اس کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ اس کے بیراگیوں کے ٹولے میں شامل ہو جاتا۔ آپ کی دنیا لئے ہوا و ہوس میری بابت کوئی خبر نہ پاتی بھائی

ایک دفعہ ہردوار میں پہنچا تھا ایک عزیز، معقول دنیا کے اونچ نیچ جاننے والے مجھ کو سمجھا بجھا کر پکڑ دھکڑ کر لے آئے۔ چند سال بعد بیڑی اور ہتھکڑی کو جیل خانے میں چھوڑ پھر بھاگا۔ بندرگاہ جنوب کالی کٹ سے جزائر لکا دیپ تک پہنچنے کا عزم مصمم باندھے تھا۔ وہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ افسوس! صد افسوس۔ باری تعالےٰ کو اس محبوس قیدی کا زنداں سے فرار منظور نہ تھا۔ جب بھی دنیا کے غولوں کی آنکھ چرا کر بھاگا۔ پکڑا گیا اور حوالات میں ڈال دیا گیا۔ طبیعت میں یک گونہ کیفیت بے قراری و اضطراب اب بھی باقی ہے۔ لیکن چوہدری صاحب اب، اعضا میں وہ سکت نہیں۔ ذہن میں وہ جولانی نہیں کہ سلاسل تڑانے کا سوچ بھی سکوں۔ اس زندگانی کی صورت دلدل کی سی ہے۔ کہ جتنا اس میں ہاتھ پاؤں نکلنے کے لئے مارو اتنا ہی اور دھنستے جاؤ۔

اور وہ اپنے سفر حیات کا سب سے اندوہناک واقعہ جو تم نے سنایا۔ اس سے میں نے راز تمہاری روح کے کرب کا پایا۔ لو سنو۔ اپنی زبان سے سنو، تم نے کہا:

"خضر یہ میری زندگی کا انتہائی حسرت انگیز وقوعہ ہے خضر صاحب میں نے ایک بھینس کو دیکھا، ایک آنکھ زخمی اور اس پر مکھیاں چمٹی ہوئی۔ ٹانگ سے لنگڑی، شدتِ پیاس سے جیب گز بھر منہ سے نکلی ہوئی، چند قصاب اس کو بوچڑ خانے کی سمت ہنکائے جاتے تھے۔ آپ کبھی صبح دم چونگی والی سڑک پر گزریں تو آپ کو یہ منظر مریل مویشیوں کے بوچڑ خانے کی سمت ہنکائے جانے کا اکثر دیکھنے میں آئے گا۔ اچھا خاصہ مجمع ہوتا ہے اور وہ لوگ آوازیں لگاتے، لاٹھی چلاتے ان نزار بے زبانوں کو سوئے مقتل لے جاتے ہیں۔ اوہ! اوہ —— میں اس پر ہول تماشے کو بھول نہیں سکتا۔ اس کا تصور بعض وقت مجھ کو راتوں کو جگائے رکھتا ہے۔ خضر صاحب زندگی کا تقدس کہاں ہے۔ آدمی اور جانور کے جسم میں روح متحرک ایک ہے

اور کل تخلیقاتِ عالم آدمی، چوپایہ چرند پرند میں احساسِ حیلت کی تو مشعل واحد سے فروزاں ہے۔ دنیا کے بڑے ادیان میں سے بدھ مت میرے دل کو لگتا ہے۔ کسی جاندار کی جان نہ لو۔ گوتم بدھ بڑا عظیم آدمی تھا۔ وہ اس جھوٹ اور فریب کے جنجال سے نکل کر جنگلوں میں ازلی سچائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑ کے پیڑ کے نیچے برسوں کے گیان کے بعد اس کو حصولِ نروان ہوا۔ اور زندگی کا رازِ حقیقی اس پر آشکارا ہوا۔ آدمی اپنے کو کچھ ہی سمجھے۔ وہ کائناتِ ایزدی میں چیونٹی سے بڑھ کر بے وقعت ہے۔ مجھ کو اپنی گزشتہ زندگی ضیاعِ مقصد لگتی ہے۔ خضر میں آغازِ شباب میں آگہی پاتا تو باور کیجئے گا۔ میں کبھی شادی نہ کرتا۔ بال بچوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑتا۔ بتایئے اگر یہ بچے میرے مثانہ سے تڑپتے ہوئے نہ نکلتے اور یہ انسانی پتلے نہ بن پلتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔ کروڑوں، اربوں، انفاس حشراتِ ارض کے مثل اس خاک دان پر رینگ رہے ہیں۔ خضر صاحب۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا نہیں چاہتا۔ ان کو مجھ سے دور ہٹا لیجئے۔ میرا انشورنس کا کاروبار، میرا موٹر، میری کوٹھی، میری بیوی بچے مانندِ ناویہ زندان کے مجھ کو نرغے میں لئے ہوئے ہیں۔ ہم سب جزیرے ہیں۔ ہم سب اپنے اپنے خول میں جیتے ہیں اور ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے مابین کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ اس کو کیوں نہ کہوں۔۔"

بہت سی باتیں اسی قسم کی تم نے کیں۔ میں نے چاہا تم بولتے جاؤ میں سنتا جاؤں حالِ دل کے بیان سے لوگ یہاں ڈرتے ہیں۔ خفقانی اور مراقی کون کہلانا چاہے گا۔ اپنے مرضِ سرطان سے مرنے کی پیش گوئی جو آپ نے کی۔ اس سے اغلباً فقیر کو ڈرانا مقصود ہوگا۔ میں اپنے کشفِ نجوم سے کہتا ہوں کہ یہ اندیشہ آپ کا محض واہمہ ہے اور حضرتِ ایزدی

نے ابھی کارہائے خطیر آپ سے کرانے ہیں۔ بالعدان کی تکمیل کے صدوسی سال کی عمر
میں تمہاری رہائی کی صورت ہو تو ہو۔ اس سے پہلے ممکن نہیں۔ ڈھکوسلے سے نہیں
کہتا۔ علم نجوم کے عبور میں میرا ہم قوم اس وقت سارے کشورِ ہندوستان میں نہیں۔
الحمدللہ — آپ کی داستانوں کے مجموعہ کی کتاب موسوم بہ ’جنگلی‘ چھپی اور
بازار میں آئی۔ انطباعِ کتابِ اوّلین بہ صد ہزار مسرت و نشاط آپ کو اور کل دوستوں کو
مبارک ہو۔ آپ کے احباب خوش نہیں۔ حاسد جلتے ہیں۔ یہ کتاب آپ کے توسط سے
نظر افروز ہوئی اور ہنوز اس کی سیر کرتا ہوں۔ ہائے کیا افسانے لکھے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھتا
ہوں اور وجد کرتا ہوں۔ ان قصوں کی حقیقت جو میری نظر میں ہے وہ آپ کو معروض
کروں تو سمجھو گے کہ از راہ تملّق و خوشامد ایسا کہتا ہوں۔ چوہدری کہوں، خان کہوں، جانِ خضر
کہوں۔ مبداءِ فیاض کا تم پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ تمہارا صحیح اور طبع سلیم ہے۔ فنِ فسانہ طرازی کے
ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لائے ہو۔ میرا خداوندِ نعمت سعادت حسن منٹو ان
قصوں کو دیکھتا تو اس کی روح نہال ہو جاتی — یہ مانیے یہ عطیہ خاص من جانب اللہ ہے
محنت پژوہی و جگر کادی و شب بیداری سے یہ ملکہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ کئی کم نصیب،
عنایت الٰہی سے محروم، حصولِ کمال کی آرزو میں پراگندہ و تباہ ہو گئے اور کاوشِ جگر ان کی
ضائع ہوئی۔ ’اُتم چند‘ اور ’ٹیل‘، اور ’جنگلی‘، کس کس داستان کا نام لوں۔ ساری نگارشات
کمیاب۔ لعلِ سپید، نایاب ہیں۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔ مشق بڑھاییے اور سرحد کمال پر
اپنے فن کو پہنچاییے۔ میں آپ کی رسائی ذہن۔ قوتِ علم۔ جذبہ دردمند نوازی سے قوی امید
رکھتا ہوں کہ عنقریب ہمینگوے اور ما ہم کے رتبہ کو پہنچو گے اور میرے اور تمام دوستوں
کے لیے فخر اور دشمنوں کے لئے علتِ حسد ہو گے۔

ہاں صاحب۔ سچ کہتا ہوں اپنے یارِ دلی اکرام اللہ خاں صاحب کی صحبت میں میں
نے وہ مزا اٹھایا جو بشر کو ایک ہمدرد ہم طالع سے مل کر ہی ہوتا ہے۔ چشم بد دور۔ حسنِ

صورت مرے یار کا وہ کہ دیکھتے ہی پہلی نظر میں حسنِ خلق و لطفِ طبع اس کو نظر آئے۔ حسنِ سیرت وہ کہ ہر ایک کا دل خوش ہو۔ بھائی میں کیوں نہ چاہوں گا کہ اکثر تم سے ملاقات ہوا اور باہم حرف و حکایت کے مزے لوٹیں۔ اکرام اللہ خاں۔ تم جانتے ہو۔ فقیر نے بوجوہ ایک مدت سے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر رکھا ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ تم متعدد بار غریب خانے پر تشریف نہیں لائے ہوگے۔ میں نے سمجھا ہوگا کوئی قرض خواہ، تھانیدار وغیرہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور کہلا بھیجا ہوگا کہ گھر پہ موجود نہیں۔

ہائے ہائے فقیر کی حرارتِ غریزی کو زوال ہے؛ ہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی نے ناطقہ بند کیا۔ عزیزوں سے میری ناچاقی اور رشتے داروں سے ناخوشی، جوتی بیزار، اور گھر بار سے بیزاری، ان امور نے مرضِ جگر متورّم کو قوی کیا۔ جسم بے روح متحرک ہوں۔ اب پا بہ رکاب ہوں اور ملکِ عدم کو نہیں۔ ایک شاگرد کو لکھ رکھا ہے کہ کوہ و صحرا کی کسی خانقاہ کی مجاوری خالی پڑی ہو تو اطلاع یابی کرے۔ ادھر سے اطلاع آنے پر سامانِ سفر کروں گا۔ ایک بکس اور دو جوڑے کپڑوں کے میرے پاس ہیں مشایعت کو ریل کے اسٹیشن پر آنے کی زحمت ضرور کیجئے گا۔ جملہ احباب بھی بمع مالاہائے چنبیلی پہنچیں تو قباحت اس میں نہیں۔

حضرت مسعود اشعر صاحب کی خدمت میں فقیر خضر کا سلام کہہ دیجئے۔ ماشا اللہ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں اور ان ہمہ خوبیوں کے باوجود یاروں کے یار اور ان کی محفلوں کی رونق۔ چوہدری محمد رمضان صاحب، سید فرخ مراد صاحب، شیخ اعجاز الدین صاحب عطا، محمد افضل صاحب لطیفہ گو۔ شیخ عزیز الحق صاحب کو فقیر کا سلام نیاز پہنچایئے ——— پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے!

خضر گوشہ نشین

مرقومہ اتوار ۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء

محمد شاہ رنگیلے کے نام

واہ میاں رنگیلے آٹھ پہر شراب پینے والے۔ رقص و سرود پر شیفتہ جنگ و جدل کے بکھیڑے سے دور بھاگنے والے۔ کیا نام تاریخ عالم میں پیدا کر گئے۔ عیش کوشی میں سند بنے اور بعد میں آنے والے شاہان و سرداران عالی مقدار کے لئے شمع ہدایت فروزاں کر گئے۔ بخضر کے آپ زمانہ مکتب سے مخدوم و ممدوح رہے اور اس نے اپنے عرصہ حیات میں متعدد بار حضور کی خدمت میں مجرے غائبانہ کئے اور سکے گزرانے۔ دید کو البتہ آنکھیں ترستی ہیں۔ کیونکہ تم عالم برزخ میں پہنچے، میں ابھی اس زندانِ آب و گل میں محبوس، حکم رہائی کا منتظر۔ آداب القاب کی بے تکلفی کو بُرا نہ ملنیے گا اور گستاخی پر محمول نہ فرمایئے گا۔ صاحب آپ پر ہم کو پیار آیا اور خود بخود طبیعت شوخی کو مائل ہوئی۔ حیران ہوں کیونکہ یہ باتیں الفت و اختلاط کی آپ تک پہنچاؤں گا۔ ایک شخص بہاولپور کے رئیسوں میں، ریاض الرحمٰن نام میرے دوست ہیں۔ ان کے پاس ایک آلہ ہے 'پلانچٹ' جو اہلِ فرنگ نے ارواح کو پیام پہنچانے اور ان سے ہمکلامی کرنے کے واسطے ایجاد کیا ہے۔ یہ خط لکھ کر ان سے کہوں گا کہ راؤ جی بسیل 'پلانچٹ' اس کا مضمون محمد شاہ کو پہنچا دو۔ وہ مجھ سے انکار نہیں کریں گے۔ خدا کرے یہ 'پلانچٹ' ان کا اور ایک اور آلہ اوقاتِ زمانہ کو آگے پیچھے کرنے کا۔ یہ دونوں ثابت و صحیح ہوں، پھپھوندنے ان کو نہ چاٹا ہو۔

پہر دن چڑھے کا وقت ہے۔ کاغذ قلم دوات لے کر اسٹول، چوبی پر چڑھا بیٹھا ہوں کافی کا پیالہ داہنی کہنی کے پاس میز پر دھرا ہے۔ ایک جرعہ اس میں سے پیتا ہوں، ایک کش سگریٹ کا لیتا ہوں ایک آدھ سطر قرطاس پر رقم کرتا ہوں۔ یہ اہتمام نہ کروں تو اس پیرانہ سالی میں ذہن ماؤف رہتا ہے کچھ لکھ نہیں سکتا۔ جس زمانے میں تم دلی میں تخت طاؤس پر اجلاس کرتے تھے اس زمانہ میں کافی اور سگریٹ کا رواج نہ تھا۔ ان کو

بنانے والے بھی اہلِ فرنگ ہیں۔ اُس وقت معزّزین جرعہ جرعہ شراب پیتے تھے اور مرصع
و پچوان بدخشانی گڑ گڑاتے تھے۔ میں نے مانا کہ شراب کے بغیر تم سے گفتگوئے نشاط انگیز ہو
نہیں سکتی پر حضر غریب نادار اس سیال آتشیں کو فراہم کرے۔ تو کیونکر۔ بیئر البتہ سب
سے سستی ولایتی قوام کی شراب ہوتی ہے . . . .

بیئر کی ایک بوتل پارسی ساڑھے سات، آٹھ روپے میں دیتے ہیں۔ اور صوبہ شمال میں
جہاں فقہائے اسلام کی عمل داری ہے۔ محکمہ محصول سرکاری کے کارپرداز پندرہ سولہ روپے
سے کم فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ الامان، الحفیظ، ظلم! ظلم! حضرت یہ ذکر شراب
کا مجھ کو کرنا نہ چاہیئے تھا۔ ہرچند کہ عالمِ برزخ میں منکر نکیر نے کوڑے مار کر آپ کو صوفی صافی
بنا دیا ہوگا اور وہاں دستیاب بھی بھلا کہاں سے ہوتی ہو گی۔ میں خیال باندھتا ہوں کہ
اس کے ذکر سے آپ کی پیاس بھڑک اٹھی ہے۔ العطش العطش پکارتے ہو۔

بھائی رنگیلے، لو ایک اور بات سنو پہلے اس سے کہ ذہن سے اترے، تم کو اس
سے گونہ خوشی ہو گی۔ آپ کا ایک ہم لقب کہو، ہم کنیت کہو صوبہ پنجاب کے شہر لاہور
میں رہتا ہے یہ رنگیلا بے چارا بادشاہ نہیں۔ عمائدین سلطنت میں نہیں، خالی خولی ناٹک کا
مسخرا ہے اور منہ بگاڑ کر، حرکات مضحکہ خیز کر کر لوگوں کو ہنساتا ہے۔ آپ باور کیجئے گا۔
جس مقام پر اس کا ناٹک ہو۔ عوام الناس کیا مرد کیا عورت بھوق جوق اس کے دیکھنے کو
پہنچ جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ اس کی جو شہرت اور ناموری ہوئی۔ اس سے تمہاری نیک نامی
بھی زبان زد خاص وعام ہوئی ہے۔ ورنہ لوگ آپ کو بھولے جاتے تھے۔ یہ رنگیلا تو تھا
آپ کا ہم لقب۔ رنگیلے بہت سے دوسرے۔ حضرت کی روش پر چلنے والے، شراب و
کباب سے کام رکھنے والے، گویا مریدانِ حقیقی آپ کے اس مملکت میں ہر سمت پھیلے ہیں۔
ان رؤسا کے عیش و عشرت کے قصے کیا کیا نہیں لکھے جاتے۔ کچھ جھوٹ کچھ سچ۔ وہ جو چاہتے
ہیں سو کرتے ہیں۔ حضرت کا نام مٹنے نہیں دیتے۔ قیام سلطنت کے وقت سے حضور کا اِمن

قبا مضبوطی و ثابت قدمی سے پکڑے ہیں۔ آپ کی غمگساری میں محنت کرتے نہیں تھکتے۔
آپ کو غیر نہیں جانتے۔

چند روز ہوئے آپ کی مدحت میں ایک رسالہ تاریخ و سیر کا نظر سے گزرا۔ اس کے
محرر نے اس میں لکھا کہ جب نادر شاہ افغانی نے ملک ہندوستان پر چڑھائی کی اور
حملے کا غل عام ہوا۔ آپ اور آپ کے ہوا خواہوں کے کان پہ جوں تک نہ رینگی۔ مینا و
جام سجا کر بیٹھے رہے۔ تردد اتنا ضرور کیا کہ لشکر کے ہفت ہزاری وہ ہزاری سپہ سالار اپنی
اپنی محل سراؤں کی چھت پر چڑھ جاتے۔ نیچے اتر کر آپ کی خدمت میں معروض ہوتے
کہ قزلباشوں کے حملے کی خبر غلط، محض افترا، کیونکہ افواج غنیم کا نام نشان نہیں۔ جب
آدھی سلطنت جاتی رہی۔ تب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بلکہ ناچ رنگ کی محفلوں کی رونق
دوبالا ہوئی۔ بھائی رنگیلے میاں اپنے مسلک میں پامردی خوب دکھائی۔ لغزش نہ آئی۔
تمہارے استقلال کا جواب نہیں۔ کوئی آئے کوئی جائے آپ کی بلا سے۔ آپ نے اپنے
کام سے کام رکھا۔ دلی لٹ گئی۔ شہر میں مردمان بسیار تہ تیغ ہوگئے۔ آپ نادر شاہ صاحب
کو حلوا گلقند کھلاتے رہے۔ وہ حضرت جاتے ہوئے تخت طاؤس بھی لے گئے۔ آپ کی بلا
سے۔ آپ نے غمزدگی کو اپنے سے دور کیا اور تیغ اصفہان کے اوجھل ہوتے ہی اپنا پرانا
شغل پھر سے شروع کیا۔ وضعداری نبھانا اس کو کہتے ہیں۔ میں جواب آپ کی یاد دہانی کراتا
ہوں تو اس واسطے کہ بہ حسب حال ایں زمانہ ہے۔ حضرت آپ پر معلوم ہو، تخت طاؤس
اب دلی کے لال قلعے میں پھر لوٹا دیا گیا اور ملک بھارت کی نہارانی اندرا اس پہ بیٹھ کر عقل و
تدبیر سے حکومت چلاتی ہیں۔ ملال کچھ دل میں نہ لاؤ۔ خدا آپ کی روح صالح و پاک کو
خوش رکھے۔ حضرت نادر شاہ درانی کی روح آپ کے قرب میں رہتی ہو تو اس کی خدمت
میں فقیر کا مجرا عرض کر دیجئے گا۔ کوئی سوغات یہاں سے بھیجنے کی نہیں۔ حلوہ گلقند عطاروں
کی دکانوں میں سونے کے بھاؤ ہوا — جواب ببیل پلا پچٹ، جلد مرحمت ہو تو دل

کی کلی کھل جائے ـــــ

مرید باصفا۔ خالد خان خٹک

قدرت اللہ شہاب کے نام ـــــ

اے شہاب صاحب، سنتا ہوں ہم سے روٹھ کر تم بلادِ اہلِ فرنگ میں چلے گئے
جہاں رہو خوش رہو۔ آباد رہو۔

بھائی قسمت نے تمہارا خوب ساتھ دیا۔ ایک داستان تمہاری لاہور کے مطبع
جابہ بد میں انطباع شدہ بعنوان "یا خدا" فقیر نے طالب علمی کے ایام میں دیکھی تھی۔ اچھی
تصنیف ہے۔ غالباً اصل واقعہ کو قصہ کے پیرائے میں ایچ پیچ کے بغیر بیان کر دیا۔ بہت
سی چیزیں تمہاری تصنیف کردہ نظر سے بعد میں گزریں اور موجبِ نشاط و انبساط
قلب ہوئیں۔

دنیا میں کامراں فرحاں ہوئے۔ قفقازِ پاکستان کے جلیل منصبوں پر فائز ہوئے۔
پیش گاہِ وزارت ملی سرکار کے مقرب خاص ہوئے ان کا طالع عقرب میں تھا۔ وہ دس
سال تک جئے۔ یعنی وہ اب تک جیتے ہیں لیکن سلطنت دوسروں کے ہاتھ گئی۔ آپ
بھی ایسے بددل ہوئے کہ اس مملکت سے کنارہ کر لیا۔

کچھ بتاؤ ولایت میں تمہارے اشغال کیا ہیں؟ معاش کی صورت کیا ہے؟ پنشن کی
تو سرکار سے توثیق ہو چکی ہوگی۔

یہاں کا حال وہی ہے جو تمہاری سکتری کے زمانہ میں تھا۔ ملاؤں اور غیر ملاؤں میں
جوتی بیزار، شریف الاصل ذلیل و خوار۔ ارذل اشخاص کی گڈی چڑھی ہوئی۔ سرکار کے
شعبوں میں عمال کام سے جی چرانے والے، حریص، خلقت خدا کی دوہائی کوئی نہیں سنتا

حاکم اعلیٰ بیدار منش، انصاف پرور، راست نیت ہے۔ اس نے سعی بلیغ حالاتِ زمانہ کی درستی اور جمہور کی حکومت کے قیام کے بارے میں کی۔ وہ سب مٹ گئی۔ مہنگائی نے مجھ سے سفید پوشوں تک کو گوشہ نشیں بنا دیا۔ پٹرول چھ روپیہ گیلن حقیر سے حقیر نشے ضرورت کی بازار سے خرید دتو دکاندار کھال ادھیڑ لیتے ہیں۔ چائے کا یہ حال ہے کہ اناج کے بھاؤ ملتا ہے۔ سنتے ہیں آئندہ قریب میں ذوالفقار علی بھٹو کو اختیار مل جائے گا۔ وہ بھی بیتاب ہیں۔ پر حالات کا سدھرنا عقل و تدبیر کے حیطہ سے باہر ہے رضائے الٰہی کے سامنے انسان کی سب کوشش فضول و لاحاصل ہے۔ تخت نشیں ہو بھی گئے تو ماسوا بدنامی و رسوائی کے کیا دھرا ہے۔ آج جو لوگ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ کل کو وہی ان کی قمیص کا گریبان پکڑیں گے۔ صاحب یہ دنیا کا دستور ہے۔

بے چارہ حبیب اشعر، دلی کی نشانی، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا نواسا ایک ماہ ہوا گزر گیا۔ غالباً تم اس سے کبھی نہیں ملے۔ بڑا مرنجاں مرنج، وضعدار اور طرحدار انسان تھا۔ اردو زبان میں اس کی تحریر سحر انگیز ٹکسالی تھی۔ خلیل جبران لبنانی کی کتابوں کے ترجمے اس پیرایہ میں کئے کہ اصل کو شرمایا۔ چار چھوٹے بچے ہیں، ایک بیوہ۔ تمہیں اس ضمن میں لکھتا ہوں اگرچہ تم پاکستان کی انجمن مصنفین سے الگ ہو چکے ہو ان کے معاملات میں تھوڑا بہت رسوخ اب بھی تمہارا باقی ہوگا۔ انجمن سے کچھ ماہانہ بیوہ اور بچوں کا مقرر کرا دو تو وہ کارِ خیر ہوگا۔ وہ دعائیں دیں گے اور تمہاری سرخروئی دونوں جہان میں مسلم ہوگی۔

صاحب تم چھپے رستم نکلے۔ کل پنج شنبہ کو یہ فقیر مسہل میں تھا۔ ڈاک کے ہرکارے امام دین غمگین نے ایک پارسل رجسٹری لا کر دیا۔ کھولا تو اس میں ایک مجلہ بعنوان "کتاب" پایا کہ لاہور سے انطباع زیر نگرانی نور چیتنی قاسم محمود ہوتا ہے۔ وہ تمہارا از رہِ مروت پرچہ بھیجتا ہے۔ ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک عنوان پر چونکا۔ کوئی صاحب ہیں ممتاز مفتی۔ غالباً تمہارے جلنے والوں بلکہ یاران غار میں سے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں ایک

مضمونِ طویل و فصیح رقم کیا ہے۔ اسے پڑھا تو یہ بھید کھلا کہ ماشاء اللہ تم عارفِ کامل ہو، ولایت تمہاری تحویل میں ہے۔ یہ خوب لطیفہ ہے۔ ولایت تمہیں ملی اور تم ولایت میں پہنچے۔ جھوٹ کہوں تو روسیاہ ہوں مجھے پہلے بھی قیاس تمہارے ولی ہونے کا تھا۔ مذکورہ مضمون پڑھ کر یقین پختہ ہو گیا۔ نیاز معتقدانہ قبول کیجئے گا۔ آپ سے بیعت کا اشتیاق روز افزوں ہے۔ وطن کو لوٹنے میں شتابی کرو۔ تم سے ذکر کرتا ہوں، ایک زمانہ مجھ پر آیا کہ کمشنری بہاولپور کے علاقے میں قطب کا منصب بمعہ کشکول و عصا اس فقیر کو عطا کیا گیا۔ جہاں جاتا مریدانِ باوصفا جلو میں ہوتے اور قدم قدم پر ہونکارے بھرتے۔ کیا بتاؤں یہ دولت مجھ سے چھن گئی۔ ہائے ہائے۔ وائے وائے!

خط کی ایک نقل عالی جناب ممتاز مفتی کو بھجوا دو تو مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر کرم نوازی ہوگی۔ بی بی کرسٹائن کیلر سے سر راہے ملاقات ہو تو ان کی خدمت میں میرا سلام شوق کہنا کہ ایک مشتاقِ دید تمہارا احاطہ پنجاب میں بیٹھا اپنے نوشتے کا ماتم کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے نام ——

جانِ برادر!

ٹیلیفون پر تم نے بتایا کہ تم نے مجھے یاد کیا یعنی ایک مکتوب مجھے بھیجا۔ وہ مجھے نہیں ملا۔ آئندہ قاعدہ اختیار کرو خطوں کو بیرنگ بھیجنے کا۔ ڈاک خانہ والے تعرض نہیں کرتے، خط مکتوب الیہ کو پہنچ جاتا ہے اور تلف نہیں ہوتا۔

ڈاک کا ہرکارہ امام دین غمگین ملتانی مجھے جانتا ہے۔ میرے گھر کا پتہ اسے معلوم ہے۔ پوسٹ ماسٹر ملتان بھی میرا صورت آشنا ہے بایں وجوہ خط کے نہ پہنچنے پر

انگشت بدنداں ہوں۔

میری روئداد پیچھے۔ پہلے ایک لطیفہ سنو۔

کل کوئی پہر بھر دن ڈھلے میں اپنی حویلی کے صحن میں ڈنڑ پیلتا تھا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جلدی سے قمیص پہن باہر گیا۔ ڈاک کا ہرکارہ غمگین تھا با چھیں چری ہوئی۔ اس نے ایک خط دیا اور ساتھ کہا "صاحب مبارک ہو، منہ میٹھا کراؤ"۔ میں نے کہا۔ "کس چیز کی مبارک امام دین صاحب"، اس نے سرنامے کی طرف اشارہ کیا "تمہاری ترقی ہوگئی۔ چیف انجنیئر ہو گئے"۔ میں نے غور سے دیکھا میرے منصب کا نام "تکنیکی افسر دفتر چیف انجنیئر" ہے۔ فرستادہ نے "تکنیکی افسر دفتر" کے الفاظ حذف کر دیئے تھے۔ میں نے امام دین سے اس سقم کی وضاحت کی۔ وہ قدرے قائل تو ہوا پر ایک روپیہ مٹھائی کا لے کر ٹلا۔

لو اب میری سرگزشت سنو!

مہتمم اعلیٰ واپڈا نے میرے تبادلہ کی منسوخی کی درخواست پر قلم پھیرا۔ چار و نا چار بقچہ باندھا۔ بارہ جون کو ڈاک گاڑی میں بیٹھ کر ملتان چلا آیا۔ تین دن گلڈ ہوٹل میں ٹھہرا کہ یہاں کی مشہور سرائے ہے۔ بھٹیارے نے مسافروں کے آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے۔ سات روپیہ یومیہ کمرے کا کرایہ لیتے ہیں۔ ایک دوپہر ڈھلے بلاناغہ آب سرد فرنج کا ایک جگ میں ملازم لاتا ہے۔ اس کے دام نہیں لیتے بالائی منزل پر بیت الخلا ایک نہیں تین مگر آلہ آب روانی کام نہیں کرتا۔ اور مہتر کا یہاں دستور نہیں۔ عزیزی محب حمید الدین کو کہ رشتے میں میرے عم زادہ ہیں میرے آنے کا پتہ چلا۔ شکوہ کیا کہ کسی کو آنے کا بتایا نہیں اور گھر کے موجود ہوتے سرائے میں اترے ہو۔ از راہ مروت اپنی حویلی میں لے گئے۔ ان کی حویلی قدیم عالی شان کوچہ احمد شاہ ابدالی میں واقع ہے۔ پورچ کے آستانہ پر حویلی کا اسم محمد عالم منزل اور سنہ تعمیر کندہ ہے۔ تب سے ان کے ہاں پڑا ہوں

دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے اور گاہے گاہے سرِ شام کوہستان مری کی کشید تلخ بیئر کی بوتل۔ خدا اس فقیر کا انجام بخیر کرے۔ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا۔ دفتر میری اقامت گاہ سے چار کوس ہے۔ موٹر گاڑی اس فقیر کی ایک کرم فرما لاہور سے لے آئے ہیں۔ وہ خراب رہتی ہے اور نت نئے عوارض میکانکی میں مبتلا۔ بیشتر تین پہیوں کی مشینی شکرم میں آتا جاتا ہوں۔ دفتر میں کام کچھ زیادہ نہیں۔ عملہ کے دفتری سائلوں سے بقدر ان کی توفیق کے نذرانہ لے کر ان کی تسلی تشفی کر دیتے ہیں۔ مجھے خطوط کے وسیلے سے احباب سے باتیں کرنے کا کافی وقت مل جاتا ہے۔ ولایت کے داستان گوئے سحر طراز سر والٹر اسکاٹ کے دیو رہے ناولوں کی مکمل جلدیں محب حمید الدین کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ تاریخ انطباع ۱۹۰۰ء گویا ہفتاد و یک سال پہلے کی چھپی۔ کاغذ دبیز و اعلیٰ مگر بوجہ عمر رسیدہ ہونے کے ہاتھوں میں بھر بھرا جاتا ہے۔ میں نے دیو رہے ناول پہلے کبھی نہیں پڑھے تھے۔ اب دفتر میں بیٹھا ایک ایک کر کے پڑھتا جاتا ہوں۔ عمر نے دو تین ماہ مزید فاقت کی تو والٹر اسکاٹ کی داستانوں کی پچیس جلدیں ختم ہو جائیں گی۔

ایک واقعہ سنو!

دس پندرہ روز پہلے یہاں ہفتہ ٹریفک منایا گیا۔ صورت یہ تھی کہ گھنٹہ گھر کے چوک میں ایک مجسٹریٹ اور دو تھانیدار مونڈھے بچھا کر بیٹھے ہیں۔ ہر موٹر گاڑی اور مشینی شکرم کو روکتے ہیں اور جس کے چلانے والے کے پاس لائسنس، کاغذاتِ رجسٹری وغیرہ ہر طور مکمل نہیں پاتے اس کو موقع پر یک صد روپیہ جرمانہ کرتے ہیں اور جو جرمانہ ادا نہ کر سکے۔ اس کی موٹر گاڑی، شکرم ایک طرف کھڑی کر دیتے ہیں کہ جرمانہ کی رقم لے کر آؤ اور اس کو واگزار کراؤ۔ خزانہ سرکار میں اس وقت روپے کی بڑی قلت ہے، چنانچہ کار پردازانِ حکومت نے یہ طریقہ اس کے بھرنے کا نکالا ہے ——— کسی نے مطلع نہ کیا کہ گھنٹہ گھر میں مورچہ لگا ہے۔ دفتر سے آتے تھانیدار نے ٹوکا لائسنس، کاغذات رجسٹری پیش کرنے

کا حکم دیا۔ تم تو جانتے ہو ان تکلفات سے کبھی سروکار نہیں رکھا۔ میں چکرا یا۔ حوالات سامنے دکھائی دینے لگی۔ پھر حواس کو مجتمع کیا۔ بیس روپے جیب سے نکالے۔ اوروں کی آنکھ بچا کر چپکے سے تھانیدار کی مٹھی میں تھمائے۔ نہایت معقولیت پسند، نیک سیرت شخص تھا۔ اُس نے جانے دیا۔

عزت تو بچ گئی پر اب جب موٹر گاڑی میں نکلتا ہوں، دل دھڑکتا ہے۔

میری جان۔ تم کیا سمجھتے ہو میرا رُواں رُواں تمہارے احسانات سے گرانبار ہے۔ تم سراپا مہر و وفا ہو۔ تم یہاں کبھی آؤ تو دل کی کلی کھلے۔

آگے بھی کہا ہے۔ پھر کہتا ہوں کہ اس پرچے میں جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا گیا محض جھک بازی، افترا پردازی ہے۔ نظم و نثر تمہاری اردو زبان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ بھائی، اہلِ کمال کے ساتھ ازل سے یوں ہوا ہے کہ حاسد چھچھورے، ذہن کے بودے ان کے درپے ہوئے وہ لوگ چاہے خفیف الحرکتی پر اُتریں۔ تمہارے ظرف کا تقاضا ہے کہ خاموشی اختیار کرو۔

اب دفتر سے اُٹھتا ہوں۔ پہرہ دار دفتر کا قفل ہاتھ میں لے کر میرے جانے کا منتظر ہے۔ راستے میں یہ خط بیرنگ لفافے میں ملفوف کر کر لیٹر بکس میں ڈالوں گا۔

موحد صاحب کو دعا پہنچے۔ اسلم ملک صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔ میاں نعمان کو دعا۔ جیتے رہیں۔ تمہارے دفتری اختر صاحب اب کیسے ہیں اور کہاں ہیں؟ اب بھی واہمہ تخیل میں اپنے طیارے کو فضا میں قلابازیاں لگواتے ہوں گے؟

محمد کاظم کے نام ـــــ

او میاں سید زادے، امان ہائیم، قفقازہ جرمنی کے رہنے والے!

دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمہارا گنگا جمنی لفافہ میں ملفوف خط ولایت سے لایا۔ بادل پژمردگی اور رنجوری سے چھٹے، صاحب جی اُٹھا دل نے کہا، خفر آشفتہ نوا! اُٹھ ہرکارے کی بلائیں لے لے۔ لفافے سے نظر اُٹھاتا ہوں تو وہ غائب!

خط کھولا تو اس میں تمہارے حال کے مسکن کے گلی کوچوں کے تصویری کارڈ اور تمہاری کلاس کے رنگین فوٹو نکلے۔ بھئی تم نے میرا کہا یاد رکھا۔ صادق القول آدمی ہو۔ شبیہ مبارک نظر افروز ہوئی۔ بے ریش دیر ووت مغل بچے لگتے ہو۔ بتانِ افرنگ تم پر مرتی ہوں گی۔ داڑھی منڈوا کر بڑی مردی و مردانگی تم نے دکھائی۔ میں نہ کہتا تھا کہ میرا یار کاظم داڑھی مونچھ پر استرا پھر لے تو حسینانِ جہاں کو شرمائے۔ تم پر رشک البتہ مجھ کو یوں نہ آیا کہ جب میں مکتب میں پڑھتا تھا اور سولہ سترہ برس کے سن میں تھا تو میرا رنگ کھلتا بنفشئی تھا، بال گھنے گھنگھریالے تھے اور قدر دان لوگ دیدہ و دل کو فرش راہ کرتے تھے۔ بازار میں بن ٹھن کر نکلتا تو کوٹھوں سے نازنینانِ پردہ نشین اُٹھ اُٹھ کر جھانکتیں اور ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ قدم قدم پر مداحوں کے طائفے، کہ میرے نکلنے کے منتظر ہوتے، تحسین و ستائش کے جملے کہتے۔ اے بیندادے! اس وقت تم ہم کو دیکھتے! مجھ سے تمہاری ملاقات جب ہوئی کہ میں وہ پہلے کا ساخضر کب تھا، وہ ایک زمانہ تھا میری جان، اب تو تم مجھے زندوں میں نہ جانو، سر آدھا بالوں سے محروم آدھا بگلے کی طرح سپید، گال پچکے ہوئے اور رنگت سیاہ۔ دائیں اور بائیں جانب کی ڈاڑھیں نکلی ہوئی۔ خیر چھوڑو اس ہرزہ سرائی کو!

یہ تم نے کیا لکھا کہ اپنے بڑھنے سے تم نے فیض نہ اُٹھایا اور برسوں کی مشق ترجمے اور نثر نگاری نے تمہارے تخیل کو کند کر دیا۔ میں نہیں مانتا۔ بیجا تملق و خاطر داری کو نہیں کہتا۔ تم زبانِ اردو میں اس خوبی اور روانی سے اپنے خیالات ادا کرتے ہو کہ قابل تہنیت و مبارکباد ہو۔ تمہارا اسلوب مجھ کو پسند ہے۔ تمہاری طرزِ نگارش کا میں شیدائی ہوں۔

اس واسطے کہ اس کا ڈھنگ نرالا، اپنی ہی بہار لیئے ہے۔ سنو! شیکسپیئر اور طالسطائی اور اسداللہ خاں غالب اور سعادت حسن منٹو بننا ہر کسی کا مقدر نہیں۔ ان میں تشے لطیف آئی جناب ایزدی سے۔ اس کا مطلب یہ کیوں ہوا کہ تم اور ہم فن کی تحصیل میں محنت کش و سخت کوش نہ بنیں۔ ان متذکرہ ہستیوں کو سخن طرازی، تمثیل نگاری، داستان نویسی میں ید بیضا حاصل تھا اور ہم اس سے محروم۔ یہ سچ ہے، مگر ہم کو ان متقدمین کے تتبع سے کیوں عار ہو۔ بھائی معدودے چند کے ماسوا عوام الناس کو کسب کمال کے لئے مشقتِ خاص اور کاوش جگر مقسوم ہے بعض تو جان پر کھیل گئے اور حاصل کچھ بھی نہیں۔ ان کا نام رٹ گیا۔ پر یہ کیوں لازم آیا کہ ان کی زندگی رائیگاں گئی۔ وہ جی تو گئے جستجو تو انہوں نے کی حسنِ زیبائے سخن کو پلنے کی۔

تم ہپی، (HIPPY) لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہو یہ خوب کرتے ہو۔ میں ہپیوں کو اچھا سمجھتا ہوں۔ ان نوجوانوں کی بغاوت تمدن و تہذیبِ جدید کے خلاف۔ رسومِ قدیم و کہنہ کے خلاف۔ خود ساختہ ضابطۂ اخلاق کے خلاف۔ مہاجنوں اور ملاؤں اور اہل کلیسا کے خلاف۔ توجیہ ان کی خانہ کوچی۔ گریز پائی۔ بے اطمینانی کی میرے قیاس میں ہے۔ تم ان کو اپنچی، خفقانی اور بدوضع کہو۔ میں گمان کرتا ہوں کہ یہ بھونڈی نئی نسل ایک انقلاب عظیم کی آمد کی علمبردار ہے بہ نسل غرب و شرق، شمال و جنوب کے خطے کے ہر انسان کو ایک رشتے میں پرو دے گی۔ دروغ بافی و ریاکاری، توہم پرستی و پادشاہی، آدمی میں منافرت پر تعمیر یہ تیرہ و تار زندان کہ جس میں تم اور میں ہر کوئی رہتا ہے ڈھے جائے گا۔ دیکھو حضرت خضر کی پیش گوئی پوری ہو کے رہے گی۔ انشاء اللہ العظیم۔

اپنے وطن کے حالات سن لو۔ ولایت کے اخباروں میں بھی دیکھتے ہو گے۔ مشرقی پاکستان میں بڑی شدت ہے۔ ایک شخص مجیب الرحمٰن نامی کہ پہلے حکومت کے خلاف ایک سازش میں ہارت تھا۔ ڈھول۔ ڈھونس اور اہل ہنود کے مہاجنوں کی بے دریغ امداد سے

انتخاباتِ عام میں جیت گیا۔ حاکمِ اعلیٰ قلمروئے پاکستان نے اس کو انتظام و انصرام حکومت سونپنے کا نقشہ مترتیب کیا۔ حتیٰ کہ اس کے لئے تاریخ بھی مقرر کر دی۔ وہ شخص تھا مفسد۔ مملکت کو توڑنے کی خاطر اس کو اہلِ ہند اور چند دوسری سلطنتوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس پر شیر ہوا اور سرکار کے خلاف بغاوت کر دی۔ ڈھاکے میں حاکمِ اعلیٰ بن بیٹھا اور سب عمال اور اہل کار اس کے اشارے پر چلنے لگے۔ اس کے طائفے کے لوگوں نے خلق خدا پر وہ ظلم ڈھائے کہ الامان الحفیظ۔ باہر کے لوگ جو وہاں بستے تھے۔ ان کے جان و مال، ناموس و مکان نہس نہس ہوئے سرکاری خزانے جس جس شہر میں تھے شورہ پشتیوں نے لوٹے ایک پھوٹی کوڑی نام کو نہ چھوڑی۔ ہزارہا آدمی بشمولیت حکام فوج و دیوانی کے ہلاک کر دیئے گئے۔ جس بہیمانہ طریق سے بعض بستیوں میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو ذبح کیا گیا اس کا حال سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دریں چہ شک کہ آدمی کی جبلت چاہے اس پر ملمع سازی تہذیب و اخلاق کی تہ در تہ عمل میں لاؤ۔ خونخوار حیوان کی ہے بلکہ جنگل کے درندے ہم سے کئی لحاظ سے اچھے اور افضل تر۔ مختصر یہ کہ اس قلمرو کے مشرقی حصے میں قیامت آ گئی۔

جب فتنہ و فساد کا دروازہ بند نہ ہوا تو حاکمِ اعلیٰ نے واسطے اس سلطنتِ خداداد کو بچانے کے، فوج کو حکم مجیب الرحمٰن کی سرکوبی کا دیا۔ باغیوں کا سرغنہ گرفتار ہوا اور اب زنداں میں ہے۔ شنید ہے اس پر مقدمہ بغاوت منجانب سرکار دائر کیا جائے گا۔ جس شخص کے ہاتھ میں مشرقی فوج کی یکمنداری ہے۔ تدبیر و ہمت اس میں جمع ہیں اس کا نام ٹکا خاں بتاتے ہیں۔ اس نے صورت حالات کو اب بڑی حد تک سنبھال لیا ہے مگر باغیوں کے جتھے اور اہل ہنود ابھی تک شرارت پر آمادہ ہیں اور قلمروئے ہند کے عمال وہاں کے اخباروں اور آلہ لاسلکی کے ذریعے بے پر کی افواہیں اڑانے سے باز نہیں آتے۔ آئمہ اطہار علیہم السلام اس سلطنت اسلامیہ کو اپنی امان میں رکھیں۔

سیدزادے! اب میری سرگذشت سنو۔ پچھلے چہار شنبہ تمہارے میرے دوست غمگسار اور تمہارے ہم اسم کاظم شاہ لاہور آئے۔ اسمبلی گھر کے قرب میں جو بھٹیار خانہ فیلیٹی نام کا ہے۔ اس میں قیام پذیر ہوئے۔ مجھے ان کی آمد کی حتمی اطلاع نہ تھی۔ یعنی ان کے ورود کا علم تو تھا لیکن صحیح تاریخ و روز اپنے آنے کا انہوں نے لکھا نہ میں نے دریافت کیا۔ ہوائی بندر پر پہنچتا تو کیوں کر۔ یوں بھی موٹر گاڑی کی ناسازی طبع نے صاحب فراش بنا رکھا ہے ایک پہر دن رہے یومیہ کرایہ کی ٹیکسی گاڑی میں ٹھاٹھ باٹھ سے غم خانے پر تشریف لائے اور باصرار اپنے ہمراہ لے گئے۔ ریگل کے بائیسکوپ گھر کے پاس ایک پارسی کی شراب کی دکان سے ایک بوتل دیسی جم خانہ وہسکی کی خریدی۔ ماکولات از قسم سوختہ خواج میوہ و کباب ایک اور جگہ سے لئے اور بھٹیار خانے فیلیٹی کے نمبر ایک کمرے میں جا کر متمکن ہوئے۔ شیریں گفتاری تو تم اس سیدزادے کی جانتے ہو۔ شریک بادہ ناب ہو کر خوب مزے لوٹے۔ نیم شب تک محفل جمی۔ کاظم شاہ نے ان بتانِ افرنگ و معشوقانِ وطن کے ضمن میں داستان سرائی کی کہ جو اس کے تفنگ عاشقی سے قتیل ہوئیں۔ فلاں بانو اور فلاں خانم اور فرالین جو آنا جو برلبِ جو یا بالائے فضائے محیط طیارۂ باد رفتار میں ہمارے یارِ طرحدار کے حدت شوق سے بسمل ہوئیں۔ صاحب ملیح آباد کے بشیر حسن المتخلص جوش کے سترہ اٹھارہ عشق، گوالیار کے سید کاظم شاہ کے اس باب میں کارناموں کے بالمقابل گرد ہیں۔ جناب جوش کو محبوبہ کے وصال کی خاطر جاتے، منڈیر پر پھن پھیلائے سیاہ ناگ کا سامنا ہوا۔ یہاں منزل مراد کی راہ شیروں، بھالوؤں اور حسادِ طبع بھرے شوہروں سے اٹی ہوتی ہے دو چیزیں البتہ ان دونوں کشور کشاؤں میں ساجھی ہیں۔ دونوں پر نازنینان کا فرادا پہلی نظر میں مرمٹتی ہیں اور خادماؤں کے سبیل سلسلہ نامہ و پیام کا آغاز کرنے میں دیر نہیں کرتیں۔ صید افگنی کے باب میں کاظم شاہ سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اکیس برس کی عمر تک اکیس شیر شکار کئے۔ اس سے بعد کی تعداد صحیح وہ نہیں جانتے جز

اپنے دوست کے شوقِ زندگی کے الاؤ سے میں نے بھی تمازت پائی۔ چار دن وہ یہاں رہا۔ وہ دن شادمانی اور خورسندی میں گزرے۔ اہلِ خطہ کے طعام خانوں میں بلاخوری کی۔ مال روڈ پر گھومے پھرے۔ کاظم شاہ کے عارضۂ قلب اور رات کو شمع حیات گل ہو جانے کے خطرہ سے بہ سبیل ٹیلیفون لاہور کے کل ڈاکٹروں اور اطبا کو مطلع کیا۔ ایک دن پورا گھڑ دوڑ کے میدان میں گذرا۔ میرا وہاں جانے کا پہلا موقع تھا۔ کاظم شاہ نے گھوڑوں پر شرط بدنے کے گُر بتائے۔ اس شہر کے سب خوش فکرے، امیرزادے رنگا رنگ کی پوشاک میں ملبوس وہاں موجود پائے۔ فقیر کو اہل وطن کی زرداری، تموّل اور سرخوشی کا احساس ہوا۔ ہم خواہ مخواہ اور بیکار یہاں کی نکبت و مفلسی و نحوست کو روتے ہیں۔ دوپہر دن رہے وہاں سے لوٹے۔ دونوں کی جیبیں خالی۔ میرے چالیس پچاس روپے گھوڑوں کی نذر ہوئے۔ کاظم شاہ نے اپنی متاع تو لٹائی سو لٹائی۔ اپنا دل بھی ایک حسینہ فرخندہ جبیں کو دے آئے۔ وہ گھڑ دوڑ کے حلقے میں ہمیں اپنی ہمجولیوں کے جھرمٹ میں دید میں آئی۔ میاں کاظم کو اس کی ادا بھائی۔ سفید سمور کی ٹوپی اس کافر نے پہنی تھی۔ رنگت بنفشی، ناک نقشہ اہل ولایت کا سا۔ تمہارے دوست نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً وہاں پہنچا۔ اسے نوید دی کہ متوطن بلادِ کراچی ہوں۔ اس کے شہر میں اجنبی۔ اس سے بے تکلفانہ ربط بڑھایا اور یہ بھی کہا کہ جس گھوڑے پہ کہو اس پہ دام لگاؤں۔ وہ متبسم ہوئی۔ کاظم شاہ نے اسے سمور کی ٹوپی کی رعایت سے زارینہ (کہ زارِ قلمروئے روس کی زوجہ کا لقب ہے) کا نام دیا۔

کاظم شاہ چلا گیا اور گویا تگ و تازِ زندگی اس کے ساتھ رخصت ہوئی۔ تمہارے بے چارے محمد خالد خاں خضر اب اسی بے ڈھنگی چال سے چلتے ہیں اور زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ تمہارے گئے پیچھے اب ماسوائے ندیم کے کوئی ہم زباں نہ رہا۔

اہلِ وطن کے اخباروں میں وہی دشنام طرازی، تنفر و خوشامد پرستی کے ہنگامے ہیں۔ یہاں سچ بات کہنا جرم۔ کوئی کہے تو کس سے کہے اور سننے والا کون۔ وطن کئی طاقتوں

ہیں بٹا ہے کہ باہم دست بگریباں ہیں۔ ایسے ماحول میں حقیقت سے فرار میں عافیت پاتا ہوں۔ ساٹھ ستر جزو کی ایک کتاب چہار مجلد کی "لارڈ آف دی رنگ" جو پروفیسر ٹالکین صاحب کی مرقومہ ہے میری بھانجی ناہید بیگم سلمہا اللہ نے مجھے لا کر دی ہے۔ یہ گویا اہل افرنگ کی داستانِ امیر حمزہ ہے۔ دن بھر اس کو دیکھا کرتا ہوں اور دمدار انسانوں بسمر غول، پریزادوں، بونوں، بھتنوں اور ساحروں کے عالمِ حیرت افزا میں کھویا رہتا ہوں۔ پروفیسر ٹالکین کی داستان طرازی سبحان اللہ! بھائی فی زمانہ جب کہ چار سو بہیمیت، شقاوت، عیاری اور فتویٰ سازی کا دور دورہ ہے تو آدمی ایسی داستانوں کی حیرت افزائیوں میں پناہ نہ ڈھونڈے تو کیا کرے۔ سوچتا ہوں کہ حالتِ خفقان میں میں مبتلا ہوں یا کہ میرے ہموطن۔ الغرض تمہارا خضر طائرِ نفس ہوا۔

جناب خورشید کو کورنش، اُن، صاحبہ کو مجرا۔ مان گیا میرے وسوسے خام نکلے۔ بھٹی سے کندن بن کر نکلو گے۔ انشاء اللہ العزیز!

دید کا طالب — خضرؔ

ایم یونس المتخلص بہ "الماس پانوں کا شاہنشاہ" ملتان کے نام

میاں الماس!

کیا نایاب رسالہ تم نے پان کی شان میں لکھا ہے۔ بھائی فی الواقع تم پانوں کے شہنشاہ ہو۔ مرکزی جمعیت پان سگرٹ و مشروب فروشان قلم والے پاکستان نے تمہیں جو یہ اعزاز بخشا، تمہاری ذات پر احسان نہیں کیا۔

عکسی تصویر تمہاری کہ شامل رسالہ ہے حاسدوں کو جلا کر راکھ کر ڈالے گی۔ خلعت شاہی اور تاج دُر افشاں کہ مصور نے اپنے تخیل سے تمہیں پہنایا ہے ایسا گونہ سجتا ہے کہ سچ مچ

کے شہنشاہ لگتے ہو۔ میں گمان کرتا ہوں کہ تین شہنشاہ اب روئے زمین پہ رہ گئے۔ ایک جلشہ کے ہیل سلاسی۔ دوسرے خطہ ایران کے شہنشاہوں کے شہنشاہ تیسرے تم کہ پانوں کے شہنشاہ ہو میاں پان تمہارے مفرح، سکون آور، ریاح کے لئے تریاق۔ اس پر طرہ ادب و شاعری کا شوق۔ واہ وا! خدا تم کو سو سال کی عمر دے اور تمہارے پانوں کی خوشبو کل عالم میں پھیلے چار پان الائچی سپاری لڑکے کے ہاتھ بھجوا دیجئے گا۔ حسابِ دوستاں در دل۔

دعاگو۔ خضر

ضیامحی الدین کے نام ——

اہاہا! فقیر بے نوا خضر اپنی خوش بختی پہ نازاں اور شاداں ہے۔ اس واسطے کہ دس برس کے بعد اس کے دیرینہ شفیق مکرم جناب ضیا محی الدین اس سے ملے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں کہ تم اس شہر ملتان میں تشریف لائے اور میرے مسکن سے ایک گولی پڑتا بھر کے فاصلے پر گھنٹہ گھر کے پاس ڈریم لینڈ کے بائسکوپ گھر میں جلوہ افروز ہوئے۔ میں نے سنا کہ تم آئے ہو، گو جسمانی ہیئت سے نہیں بلکہ بہ سبیل تصویر متحرک و متکلم اور ایک طائفہ گل رخان تو بہ شکن کا اپنی معیت میں لائے ہوئے ہو، رہا نہ گیا۔ اشتیاقِ ملاقات نے بیکل کیا۔ ہر چند کہ بوجہ مردم بیزاری کے کہیں آتا جاتا نہیں۔ تمہارے ملنے کو اپنے کلبہ حزیں سے نکلا۔ جانِ من تم اس بات کو باور کرو کہ حکیم سادات دواخانے والے نے پیدل چلنا میرا روک رکھا ہے۔ مشورہ اس کا یہ ہے کہ جہاں کہیں جاؤ موٹر گاڑی میں بیٹھ کر جاؤ تاکہ کھڑکی میں سے تماشہ دنیا کی سیر سے دل بہلے۔ بیٹری موٹر گاڑی کی دو ماہ سے ناکارہ ہے اس خاطر پیدل تمہارے مسکن پہ پہنچا۔ بائسکوپ گھر کا مہتمم اعلیٰ مجھے جانتا ہے اور اکثر مروت کرتا ہے اس نے ٹکٹ کے دام نہیں لئے اور ایک نشست گاہ محفوظ میں جا بٹھایا۔ عمالان محکمہ

۔برقیات کی یہ لوگ خاطر داری بالخصوص کرتے ہیں۔

قصہ مختصر کہ تم کو اس بائیسکوپ "مجرم کون" میں دیکھا۔ شکل و صورت تمہاری کچھ بدلی نظر آئی۔ بھائی یہ زمانے کی کارسازی ہے۔ چال ڈھال، وضع قطع سے تمہاری شناخت میں دقت نہ ہوئی۔ پرانے زخم ہرے ہوئے۔ ایک پہر نہیں۔ اچھلتے کودتے۔ رقص ولایتی کرتے، نازنین کا فرادا سے بے تکلفانہ چہلیں کرتے دیکھا سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گیا۔ ماشاءاللہ گھونسے بازی میں خوب مہارت بہم پہنچائی ہے۔ ڈاک گاڑی کے طعام خانے میں تمہارا نازنینانِ ہوشربا کے ساتھ باہمی رقص پرخروش اور زمزمہ پردازی۔ چلتی ریل میں فرزانانِ قوی الجثہ سے تمہاری زور آزمائیاں۔ روپ بہروپ میں تمہاری اور تمہارے دوست کی نیرنگ نمائیاں آبِ متلاطم میں سِل سنگ پر تمہاری محبوبہ شہناز کی رنگین ادائیاں، ان سب کو دیکھ کر محوِ حیرت ہوا۔ تمہاری خوش طالعی پر رشک آیا۔ ہیہات کہ مستقل فراقِ معدہ کے عارضے نے اس خضرِ فلک زدہ کو ہمیشہ عشقِ مجازی کی نشاط انگیزیوں سے محروم رکھا۔ بعد اختتام بائیسکوپ بھی طبیعت اس تمثیل بے مثال سے بھر نہیں پائی۔ اگلے پنج شنبہ کو دوبارہ تمہاری اور شہناز بی بی کی دید سے فیض یاب ہوں گا۔ انشاءاللہ اگر حیات نے یاوری کی اور بائیسکوپ گھر کے مہتمم نے پھر دعوت اسے دیکھنے کی پیش کی تو بار بار دیدار تمہارا ہوگا۔

سبحان اللہ! کیا بائیسکوپ تم نے بنایا۔ بائیسکوپ میں تمثیل سازی کا نیا رنگ تم نے دکھایا کہ ہالی ووڈ والے رشک کریں بس۔ اہل وطن کے بائیسکوپ بنانے والوں کو تم نے آئینہ دکھایا۔ مگر کس خوبی سے اور کیسی خوش ادائی سے۔ صاحب وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ میں تمہاری صلاحیت طرحداری، طباعی کا پہلے مداح تھا، اب قائل ہوا۔ اس انداز پر چند اور بائیسکوپ بناؤ تو شاید طرزِ کہنہ سے لوگوں کا دل پلٹے۔ خدا تمہیں جیتا رکھے۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔

تم سچ مچ ملو تو کھل کے باتیں ہوں۔ ہاں میاں ضیامحی الدین طول عمرہٗ، ذرا ٹھہریئے گا۔ مراسلے کے اختتام پر مشورہ صائب خاص تمہارے فائدے کا دیتا جاؤں۔ وہ یہ کہ جو جدت تم نے ڈاک گاڑی کے طعام خانے میں محفل رقص و سرود جما کر کی، بعینہٖ لاہور سے کراچی جانے والے ڈاک کے طیارے میں عمل میں لاؤ۔ آئمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قسم، ناظرین و عکاسانِ بائیسکوپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ وہ ایک نئی رمز جانیں گے کہ اب تک کسی کو سوجھی نہیں۔

رفیق خیر اندیش۔ خضر

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ـــــ

اے دریاباد کے مولوی جی!

تم مرجع و منبع صدق و صفا ہو۔ فقیر خضر تمہارے طرزِ انشا و خیالاتِ عالیہ و طہارت انگیز کا مداح ہے۔ اس وقت سے جب ہنوز مکتب میں طالب علم تھا اور مسیں نہیں بھیگی تھیں۔ جامع میں بھی تمہارا پرچہ صدق باقاعدہ دیکھتا تھا۔ ایک دوست صاف باطن ٹخنوں کے اوپر شرعی پتلون پہننے والے، میرے حجرے کے شریک اسے منگواتے تھے۔ گاہے گاہے مجھے پڑھنے کو دے دیتے کہ شاید دلِ زنار پرست میں شمع ہدایت روشن ہو جائے۔ ان کی زبانی یہ سنا کہ ہمارے مولانا دریابادی ایک زمانہ میں دہریہ تھے اور فلاسفۂ اہل فرنگ کی دانش و حکمت کے دل سے قائل، یک لخت قلب پر گھاؤ ایسے پڑے کہ دہریت سے تائب ہوئے۔ عارف کامل بن گئے۔ ادھیڑ عمر میں نکاح ثانی پڑھوایا اور پوتوں نواسوں والے ہوئے مبارک اللہ!

پچھلے چہار شنبہ یا پنج شنبہ کو یہاں کوچہ حسن پروانہ میں ایک کتابوں کی دکان پر سر کتب

کرتا تھا۔ ایک رسالہ مجلد تمہارا انطباع کردہ موسوم بہ "مقالات عبدالماجد" ایک گوشہ میں نگاہ میں آیا۔ ہدیہ ساڑھے تین روپے۔ گویا گولڈ لیف مارکہ سگرٹ کے پیکٹ کی قیمت میں نے وہ رسالہ خریدا۔ اس واسطے کہ ایام طفولیت میں تمہارا اسلوب مجھے پسند خاطر تھا طبیعت کو تجسس تھا کہ دیکھوں ہمارے مولوی صاحب اوسط عمر میں کس روش اور اور کس رنگ پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ گھر آکر اسے بغور دیکھا مضامین متنوع تنقیدی البتہ خشک اور بے روح۔ واہ صاحب! دیباچے میں آپ نے بحیلہ کسر نفسی اپنی خودنمائی کا خوب ڈھنگ نکالا۔ خود کو لکھتے ہو کم سواد، بے استعداد، قصباتی دیہاتی اور یہ کہتے ہو کہ جو باکمال اس سلیھٹی پھیکی غذا پر منہ بنائیں گے۔ وہ محض اپنی خوش ذوقی و حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اجی مولوی صاحب! کسر نفسی کا بھی ایک فن ہے کہ ہر کوئی اسے نہیں جانتا۔ سعادت حسن منٹو ایک داستان گوئے مے خوار تھا وہ ہر مجلس میں اپنی داستان گوئی کی شیخی بگھارتا تھا اس انداز سے کہ وہ شیخی بھلی لگتی تھی اور اس شخص پر بے ساختہ پیار بھی آتا تھا تمہاری کسر نفسی باعث کراہت ہوتی ہے۔ ہر مضمون میں تم نے دانش و آگہی سے سرو اربد بکھیرے ہیں اور اہل مشرق کی فوقیت و فضیلت اہل مغرب پر۔ تمدن و معاشرت و سخن سنجی یعنی ہر بات میں مثبت کی ہے۔ سبحان اللہ! "جھوٹ میں سچ" کے عنوان کے مضمون میں قصہ گل بکاؤلی، کی ذوق بخشی کو تم نے اہل فرنگ کے داستان سراؤں سکاٹ جارج ایلیٹ اور ڈکنز سے کہیں افزوں و اعلیٰ بتایا۔ مولوی صاحب قبلہ! داستان سرائی ایک فن ہے منجملہ فنون سخن سے دل بہلانے کا فطرت حضرت انسان کے ہشت پہلو دکھانے کا۔ مواعظ و معارف اور پند و موعظت کا فن آپ جیسے قطب الاقطاب کی سلطنت ہے۔ اہل فرنگ اس پیرایہ تحریر میں مصنف "گل بکاؤلی" کی ٹکر کیوں کر لیں گے؟

خلاصہ تمہارے مضامین کا یہ ہے کہ اہل فرنگ بیشتر کافر ہیں اس لئے ان کی ہر

شے بتذل، بُری اور سراپا قباحت۔ اہلِ مشرق کی ہر چیز آئینہ صداقت۔ ان کے جھوٹے بھی سچے، کم استعداد اور جاہل لوگ بھی فاضل اجل اور علامۃ الدہر۔ حیران ہوں کہ ہمارا ندیا بادی کیا لکھتا ہے اور اس بیست صدی میں کس دنیا میں رہتا ہے۔ اجی مولانا، بڑا رونا رزق کا نہیں۔ خوش ذوقی اور ذہن تربیت یافتہ سے کوئی شخص عاری ہو تو بلاشبہ وہ تو نہیں روئے گا۔ دوسرے اس کو دیکھ کر البتہ روئیں گے۔

اس بار آم کی فصل ملک پاکستان میں بوجہ فرطِ برودت اچھی نہ ہوئی۔ قلمی آم اچھی قسم کا منڈی میں ساٹھ ستر روپے من تک بکتا ہے آپ کے دریاباد میں کیا بھاؤ ہے۔ آپ نے قصد رسد بھیجنے کا کیا تو اس فضائے مخاصمت وجدال میں ترسیل کی صورت کیا ہوگی۔

دیکھئے خفا نہ ہو جئے گا۔ فقیر کی عادت بزرگوں سے شوخی و شرارت کی ہے۔ حالانکہ خود اس کا شمار بھی اب بزرگوں میں ہونے لگا ہے۔

عفو کا طالب۔ خضرؔ

محمد حسین آزاد کے نام ـــــ

سنایئے حضرت! عالم برزخ میں کیوں کر گزرتی ہے۔ قیاس کرتا ہوں کہ بی بی نیک بخت آپ کی، جو آپ کو لحم الکرہ یہ کھلاتی تھی دہاں آپ کے ہمراہ نہیں ہوں گی۔ واقع میں آزاد ہو گئے۔ چند برس کا توقف اور ہے۔ پھر جنت میں قیام ہوگا۔ اس مملکت پاکستان کے سب اہل دین و ستارہ شناس اس باب میں متفق ہوئے کہ قیامت کا روز اب آیا ہی چاہتا ہے۔ چودھویں صدی تقویم ہجری کے اختتام میں صرف ہشت سال باقی ہیں۔ علامات بھی سب یہاں ظاہر ہو چلیں بے حیائی، کھلے بال بازار میں

نکلی۔ زن و مرد کا امتیاز مٹا۔ پہچان میں دشواری ہوئی۔ دجال یک چشم ملک اسرائیل میں موشے دایان کی شبیہ لے کر پیدا ہوا۔ ابھی حضرت اب دیر نہیں! ہم سب اس ارضِ پاک کے رہنے والے روزِ حشر کا انتظار کرتے ہیں۔ حور و قصور و شرابِ طہور کے خواب دیکھتے ہیں۔

آگے جو لکھا ہے حشو و زوائد اس کو سمجھو۔ خفقانی مراقی آدمی جو منہ آئے بکتا ہے۔ مدعائے کلام اور ہے۔ ایک صاحب مولوی مالک رام نام۔ غالباً پنجاب کے رہنے والے ہیں پردیس میں رہتے ہیں۔ وہاں کے میرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کے پرستاروں اور پجاریوں میں ان کو جان لیجیے۔ میرزا مرحوم کے حالاتِ زندگی کی جزئیات نگاری اور ان کے کلام پر محققانہ خامہ فرسائی میں ان کا ثانی نہیں کہ یہ کام واسطے ان کے مقصدِ حیات قرار پایا ہے۔ حضرت کو یاد ہوگا کہ یہ وہ میرزا اسداللہ خاں ہیں جن کا تخلص پہلے اسدؔ تھا۔ پھر اسدؔ سے غالبؔ بن بیٹھے۔ بعد میں نجم الدولہ، دبیر الملک وغیرہ کہلائے آپ کے استاد ملک الشعرا خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوقؔ، استادِ شاہ، سے چشمک تھی۔ ان کا احوال آپ نے اپنی تصنیف فرحت خیز "آبِ حیات" میں بھی درج کرنا واجب سمجھا۔ اگرچہ طوعاً کرہاً بڑا احسان میرزا پر کیا ورنہ آج وہ زمرہ شاعرانِ ہند ہی سے خارج ہوتے۔ قعرِ گمنامی میں پڑے روتے۔

ان مذکورہ مولوی مالک رام نے ایک مضمون بعنوان "محمد حسین آزاد بنام غالب" ایک پرچہ لکھا ہے۔ اخی المکرم۔ شاعر عصر احمد ندیم قاسمی نے یہ پرچہ مجھ کو مستعار دیا۔ مضمون پڑھا تو حیرت کے مارے میری زیرہ سی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ باور نہ کیا کہ جو کچھ پڑھتا ہوں وہ آپ نے اپنے غالب کے احوال میں رقم کیا۔ میں تمہاری انشا پردازی کی رنگینی پر مرتا ہوں اور "آبِ حیات"، تمہاری اسم با مسمیٰ ہے۔ گلستانِ اردو کا چیدہ مہکتا گلدستہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارا طرز اس افسانہ میں خوب ہے۔ اس ننگِ آفرینش خضر

کو بے حد مرغوب ہے ہاں حضرت یہ تسلیم کیجئے گا کہ غالب کا ذکر قلمبند کرتے وقت آپ نے پٹی تعصب درعایت داری کی اپنی آنکھوں پر باندھی۔ جو اقتباسات مالک رام صاحب نے "آبِ حیات" کے اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں۔ وہ ظاہراً اس شاعر کی تعریف میں ہیں مگر ہیں فی الحقیقت تحریر پہلو دار کے بچھو کے۔ واہ! کس خوبی سے ذوق کے مقابلے میں غالب کو ڈھایا ہے اور بے چارے ہیرزل کے کلامِ نثر و نظم میں کیڑے ڈالے ہیں۔ آپ نے یوں اپنے استاد سے ارادت و عقیدت کا حق ادا کیا۔ یہ فی نفسہٖ قابلِ داد بات ہے۔ البتہ انصاف کا خون بے دردی سے کیا۔ ناقدِ سخن صائب الرائے کو معرضِ تحریر میں تحمل اور تامل چاہیئے نہ سخن پروری و جانب داری میں توغل چاہیئے۔ حضرت یہ حرزہ گیری وعیب جوئی تمہارے ظرف شایان نہیں سا آپ پر معلوم ہو کہ اسد اللہ غالب کو اب ہمہ و کل نے دنیائے سخنِ اردو کا سکندر مانا اور آپ کے استاد خاقانی ہند دلوں سے اُترے۔ صاحب ظرافت و لطیفہ بازی مدار تحقیق ہرگز نہیں ہوتی۔ فقیر نے ان اقتباسات کو پڑھا تو غصے میں کھولا۔ نقلیں ان کی درج ذیل واسطے یاد دہانی کے ہیں ان کو دیکھیئے گا پھر اپنے قول فیصل پر از روئے انصاف نظر ثانی فرمائیے گا۔

۱۔ نقل عبارت آب حیات: "مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں چھپی ہیں اور جس طرح امراء و دوسلائے اکبرآباد میں علوئے خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں۔ اسی طرح اردوئے معلیٰ کے مالک ہیں۔ اس سے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جائے۔"

مولانا محمد حسین آزاد صاحب! افسوس کی بات ہے تم نے اس اوچھے وار کو جائز جانا۔ میرزائے فارسی غالب کو اس لئے کہا کہ علاقہ ان کا سخنِ اردو سے ثانوی رہے۔ رئیس زادہ اُن کو بنایا ہے دلی کا نہیں، آگرہ کا اور مطلب یہ ہے کہ نامی تھے تو حیثیت خاندان کی

بدولت! خوب حضرت خوب! تمہارا منہ تکتا ہوں۔

۲۔ نقل عبارت آبِ حیات: "اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی سے باکمال شاعر تھے، مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیر زادے کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے۔"

گویا اعادہ بالتخصیص اس امر کا کرتے ہو کہ شاعر باکمال زبانِ پہلوی کے تھے۔ زبانِ اردو کے شعرا میں نہ تین میں نہ تیروں میں۔ ساتھ ہی ان پر طعنہ ہے ان کے امیر زادہ ہونے اور علوم درسی سے فیضیاب نہ ہونے کا۔

۳۔ "تصنیفاتِ اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ ۔ ۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"

سبحان اللہ! بندہ پرور! فنِ تنقیص کو تم سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ خوب بطریق احسن فرماتے ہو کہ اکثر کلامِ اردو میرزا کا بے معنی ہے جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جو کچھ کہتے ہو خضر اس کو آپ کے استاد ذوق کے مطابق حال پاتا ہے۔ خاقانی ہند کا کلام بیشتر البتہ ایسا ہے کہ بوجہ صنائع بدائع سے بوجھل ہونے کے مفہوم اس کا صرف ان کے شاگردوں کے دل نشیں ہے۔ خلاف ان کے امثال و مناظر کے پیچ میں سے نکالے۔ غالب کے بارے میں جو لکھا ہے پوچ ہے خارج از راستی ہے۔

۴۔ نقل عبارت آبِ حیات: "اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے

مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا۔ اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال بس اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے"

مولانا! عرصۂ حشر میں اس بغضِ معاویہ کی جواب دہی کیوں کر دو گے۔ میرزا کے اکثر کلام پر لایعنی خرافات، خام و ناقص ہونے کا حکم لگایا، جو چار پانچ شعر صاف زبانِ مستعمل میں نکل گئے ـــ یعنی "اتفاقاً" ـــ وہ البتہ خوب ہیں۔ اس عبارت کی شرح میں آپ نے عبداللہ خاں اوج کے حالات درج کئے ہیں۔ گویا غالب کے کلام کو اوج کی شاعری سے ملایا ہے۔ اس شرح کے آخیر پر رقمطراز ہو" الفاظ چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا، اس لئے کبھی مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا" واہ مولانا! عبداللہ خاں اوج کی آڑ میں وار میرزا صاحب پر کاری اور سخت کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کسی کو بڑا کہنے کے یہ انداز قاعدہ اشراف ہرگز نہیں۔

۵۔ نقل عبارت آبِ حیات: "اس مجموعہ کا نام میرزا نے خود اردوئے معلےٰ لکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوشنما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے (یہاں آگے مثال ان کے کلامِ نثر سے دی ہیں) ان خطوں کا طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہی کا ایجاد تھا

کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں۔"

مولانا! میرزا بے چارے کے کلام کو تم نے صفحہ دہر سے مٹایا۔ اب ان کی اردو نثر کے کارنامے پر پانی پھیرتے ہو" اردوئے معلیٰ"، کتاب لاجواب ہے۔ مکتوب نگاری کے حسن نگارش کی۔ تمہاری تعریف سے کیا کہنے۔ سراسر تنقیص و غلو ہے۔ نہ میرزا کو ناظم مانتے ہو نہ نثار۔

مزید اقتباسات مولوی مالک رام کے مضمون میں ہیں۔ میں درج نہیں کرتا۔ سب سے تمہارا تعصب و کینہ غالب کے بارے میں نمایاں اور ہویدا۔ سارے کا سارا ذکر غالب جو آپ نے "آبِ حیات"، میں مرقوم کیا اس سے مقصد یہ ہے کہ نام اور کام اس پیمبر سخن کا حقیر ہو اور درجہ اس کا استاد قبلہ حضرت خاقانی ہند سے کمتر قرار پائے۔ اپنے استاد سے آپ کی عقیدت وارادات کی مجھ کو قدر ہے لیکن قبلہ اس سے کیوں لازم سمجھتے ہو کہ غالب کی عیب جوئی میں حدیں پھلانگ جاؤ۔ مولوی مالک رام نے جو غالب کے خلاف آپ کی فرد جرم اپنے مضمون میں واضح کی ہے اس سے خضر نے یہ استنباط کیا کہ حسد و بغض سرشتِ انسانی میں رچا ہوا ہے۔ اچھے سے اچھے بے ریا انصاف پرور آدمی کے خون میں بھی یہ زہرناب گردش کرتا ہے۔

میں اب اس بارے میں قطع کلام کرتا ہوں۔ غالب کی تحقیر پہ اب بھی اڑے ہو؟ تمہاری مرضی۔

قبلہ اب اس جہانِ آب و گل کی کچھ باتیں سنیئے گا۔

آپ کی پیشین گوئی اپنی تصنیف بے بہا" نیرنگ خیال" میں زبانِ اردو کی ترقی روزافزوں کے باب میں افسوس پوری نہ ہوئی۔ فسانہ و فسون و شاعری میں چند صاحب طبع لوگوں

نے نام پیدا کیا لیکن سیر و سیاحت، سوانح نگاری، تاریخ میں باستثنٰے ایک آدھ کتاب کے، کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ مقالہ نگاروں اور نقادانِ ادب البتہ بے شمار ہیں۔ ادب پڑھنے سے اب یہاں سب گریزاں ہوئے۔ کتاب دیکھنے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ قبلہ دنیائے سخن میں یہاں اب سکتے لوٹتے ہیں۔ یہ حالت اب بدلتی نظر نہیں آتی۔ اس واسطے کہ معالج و جامعہ ہائے و دیگر ادارہ ہائے تعلّم و ہدایت (از قسم ریڈیو ٹیلیویژن) پر بعض جاہل اجہل حضرات کا تصرف کامل ہے۔ سخن و ادب کی تطہیر کا عمل جاری ہے کوئی وقت آئے گا کہ شاعری میں سے شاعری نکل جائے گی، نرا نہ رہ جائے گا۔

ایک شاعر کامل سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں رہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کہلاتے ہیں۔ وہ آپ کے پڑوس میں رہتے ہوں گے۔ ملاقات ہو تو فقیر کا سلام بانتعظیم کہہ دیجئے گا۔ اور یہ بھی پیغام دے دیجئے گا کہ آپ کا کلام بلاغت نظام سب کا سب ریڈیو کے مطربوں قوالوں، فقیھوں کی نذر ہوا۔ کوئی اسے پڑھتا نہیں، سمجھتا نہیں، مطالب عیلدی سے اپنے دل کے نکالتا ہے۔

قبلہ! یہ خط بیرنگ ڈاک میں بھی تم کو نہیں پہنچے گا۔ سوچتا ہوں کہ پہنچاؤں تو کیوں کر۔ مابین اس عالم اور عالم برزخ کے انتظام ترسیل ڈاک مجھ پر مجہول ہے۔ خیر یہاں میرے محلے میں ایک مولانا مظہر العجائب رہتے ہیں۔ فقیر پر شفقت فرماتے ہیں۔ جنات ان کے شاگرد ہیں ایک دو کو آب خوروں میں مقید کر رکھا ہے اب کھانا کھاتا ہوں۔ مابعد اس کے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر معروض کرتا ہوں کہ جن آپ کو یہ خط پہنچانے پر مامور کر دیں متوقع ہوں وہ عذر نہیں کریں گے۔

آپ کے استاد ملک الشعرا خاقانی ہند آپ کے پاس بیٹھے ہوں تو میرا سلام مجرا عرض کر دیجئے گا۔ کیا ان کو اب بھی ہمارے نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر سے کدورت

باقی ہے؟ وہ ملتے تو ہوں گے؟

کم نقطہ
خضر

فہمیدہ ریاض کے نام

اہا ہا ہا! خط ہماری صالح، سرکش اور راست گو فہمیدہ کا بتوسط شفیقِ مکرم احمد ندیم قاسمی صاحب پہنچا۔ غنچہ دل کھلا کہ تم نے اتنی مدت کے بعد یاد کیا۔ کھولا پڑھا یہ آپ کا احسان اس سرد کِ افسردہ و آزردہ پر ہے۔ ورنہ میں سزاوارِ تحسین ہرگز نہیں۔ محض ایک ذرّہ بے مقدار ہوں۔ ادب کے سالکوں میں نہیں۔ اس کے دریوزہ گروں میں شمار کر لو۔ کتابوں کا کیڑا مجھ کو کہو۔ ہاں زبانِ اردو سے شیفتگی رکھتا ہوں اور نثر میں مشقِ سخن کرنے کا شوق ہے۔ عطیہ قوتِ مخترعہ سے خلّاقِ اعظم نے مجھے محروم رکھا۔ ورق سپید پر الفاظ کے بے روح طوطا مینا بنا لیتا ہوں۔ وہ بھی بدشکل مروجہ طرزِ جمہور کے خلاف اہلِ فرنگ کے رنگ ڈھنگ میں۔ عزیزہ من غبارے میں اتنی ہوا نہ بھریئے گا کہ وہ پھٹ جائے۔ فقیر جانتا ہے کہ کوئی تحریر ہنوز اس کے قلم سے معرضِ وجود میں ایسی نہیں آئی جو لائقِ حیات دوام ہو۔ ہیہات! زندگی بھر میں ایک ورق کیا ایک سطر بھی اگر حضرت رابرٹ لوئی اسٹیونسن رحمتہ اللہ علیہ کے جیسا لکھ لیتا تو خوش خوش اس سرائے فنا سے جاتا۔ اب مروں گا بے مراد اور ناکام۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ غم بھی لغو ہے بلکہ مجھ کو ذوقِ صحیح رکھنے اور شاہکارِ سخن سے لطف اٹھانے کے ملکہ پر شاداں و نازاں ہونا چاہیئے۔ آدمی ناشکرا ہے جو مجھ سے کوئی مطلب بخوبی احسن ادا نہ ہوا تو اس کا کیا۔ شاہسواران ادب اور فن کے صاحبانِ کمال دنیا میں بہت سے ہوئے کہ ان کی تصنیفات کی سیر کل عمر کر و زندگی بنڑ جائے۔ سچ بات یہی بات دلنشیں

بات کہنا چاہیئے۔ کوئی کہے میں نہ کہوں۔ اس سے کیا فرق۔ خالق سے بڑھ کر اس کی تخلیق جاندار پُر رنگ زندگی بخش ہو۔ ایک مثال میرے ذہن میں آئی۔ اہل انگلستان کے سخنوروں میں ایک عرصہ سے تنازع اس بات میں ہے کہ شیکسپیئر کی تمثیل ہائے لازوال شیکسپیئر نے لکھی تھیں یا کہ ان کو لکھنے والا کوئی اور تھا۔ میں اس کو بحثِ فضول گردانتا ہوں۔ اس واسطے کہ تمثیلوں کا سحر حسن و نغمہ و دانش قائم و دائم، امر وجود۔ ان کو لکھنے والے کا نام بین جانسن ہو یا کھتری دیوالی سنگھ، اس ہندی کی چندی سے کیا حاصل۔ اصل بات ہے ان پرشکوہ تمثیلوں کا وجود کہ خزینہ بے بہا حسنِ رنگا رنگیٔ فطرت کا ہے۔ یہ لٹائے نہ لٹے۔ شمع فروزاں ہے جس سے ہم سب چراغ جلائیں۔ آگہی پائیں اور رونق ہستی کی ان کی وجہ سے دوبالا ہوئی۔ میں جب اس عالم کا تصور کرتا ہوں۔ ان تمثیلوں کے بغیر اور اہلِ مشرق و مغرب کے ان شاہکارانِ عظیم کے بغیر جو خونِ جگر سے لکھے گئے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ الغرض طالستائی و دوستوفسکی و سعادت حسن منٹو تو نقش برآب ہوئے اور ان کے نام کوئی جپتا ہے یا نہیں جپتا اس سے ان کو کیا فائدہ۔ وہ اب ہمارے لئے "وار اینڈ پیس"، "برادرز کرامزوف" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" بنے۔ فقیر حقیر کہتا ہے کہ جو ان کی سیر عقل و بینش و لطف کا اہل ہو، اسی نے گویا وہ تصنیفات لکھیں اور وہ باتیں کہیں۔ ایک اہلِ فرنگ جان ڈن کہتے ہیں کہ کوئی بشر اس دنیا کا جزیرہ نہیں۔ سب آدمی، خواہ کسی دور کے کسی ملک کے ہوں، ایک ہی براعظم کے خطے اور ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ اس لئے کبھی یہ پوچھنے کو نہ بھیجو کہ جنازہ کس کا اٹھتا ہے کیونکہ یہ جنازہ خود تمہارا ہے۔ صاحبہ تم جو شاعری کرتی ہو۔ وہ گویا تم نہیں میں کرتا ہوں۔ نغمہ و نوحہ مرے دل کا اپنا ہے۔

جزاک اللہ انداز نظم کا تمہارا دل نشیں ہے۔ واسطے شاعری سے مناسبت طبیعت رکھتی ہو۔ "پتھر کی زبان"، کیا لکھی۔ پتھر کو زبان دی۔ کوئی سمجھے تو! مفہوم پلے تو! حسنِ نگارش بے پناہ اور اس کے ساتھ جو بات کہنا برملا بے جھجک، بناوٹ نہیں، تصنع نہیں، لفاظی نہیں

یہاں اب بقراطِ شاعری کے پھیلے ہیں، اشعار ان کے نتیجہ دماغ سوزی و موزونی طبع کا کہیے، کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں۔ نہ نغمگی، نہ خلوصِ صداقت گرہ دار باتیں، الفاظ وہی گھسے پٹے فرسودہ، لغت اصفہانی و ہندی و عربی ان کی البتہ مرعوب کرتی ہے جو منشی متفدی نثر میں درج کرتے ہیں۔ وہ الفاظ ان لغات کے یہ حضرات نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ ریخ، شاعری اسے کہیے۔ علامات کا نیا ڈھکوسلا انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ مہمیز اسپ سخن کا اس سے کام لیتے ہیں۔ ذہن ان کا گرفتار اعوجاج ہوا۔ یہ ہیچ مذاق ہزار سر مارتا ہے۔ ان کے اشعار کا درِ معنی نہیں کھل پاتا ہے۔ یہ اشخاص بدعی ہیں کہ متقدین و متاخرین نے جو شاعری کی جھک ماری۔ اس واسطے کہ ہیئت و علم علامات سے ناآشنائے محض تھے۔ گردابِ معانی و الفاظ کا سلیقہ ان کو نہ تھا دل ہی دل میں۔ جان کیٹس و رابرٹ برنز و میرزا اسد اللہ خاں دہلوی سے اولیٰ تر جگہ خود کو قصر سخن میں دیتے ہیں۔ اب کسی کو ان کا کہا سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس سے غرض ان کو نہیں۔ خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تم اہلِ ولایت کے ماحول نو میں بھی راہ فن سے نہیں بھٹکیں جستجوئے حق و راستی و جگر کاوی در سخن سے منہ نہیں پھیرا۔ تابانی و درخشانی نگارش کی برقرار رکھی بلکہ اس پر اضافہ کیا۔ اعتراضاتِ نقادان و محققین سے حوصلہ نہ ہاریئے گا۔ یہ لوگ ہیں راہِ سخن کے غول، قوتِ باصرہ و سامعہ سے محروم، آگہی سے بے آگاہ۔ انہیں کے بارے میں باری تعالےٰ ام الکتاب قرآن میں فرماتا ہے: صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ

بالتخصیص اس ریاست میں وہ جو خود کو اسلام پسند گردانتے ہیں۔ ان پر اس ارشادِ الوہی کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

صاحبہ! ولایت کی زندگی کی حقیقت مجھ پر مجہول ہے، لکھو کبھو نکر رہتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں، معاشرہ کیسا ہے یہاں کا حال فقیر کیسے معروض کرے۔ ایک مدت سے سچی بات یہاں کسو کو کہنے نہیں دیتے، نتیجہ یہ ہے کہ دروغ گوئی ہر شہری کی فطرت ثانیہ بنی، ظلم، ریا و جہالت ہر چہار سمیت ٹھاٹھیں مارتا ہے، اس ملک موسوم بہ پاکستان میں اب

اگر رہ سکتے ہیں تو صرف اختر شناس معلمان اخلاق، پیران خرقہ پوش، صوفیہ کرام، قائدین ذلیشان اور مہاجن! ان کے علاوہ ہر کوئی یوں کہئے جینے کو جیتا ہے، سانس لیتا ہے۔ زندہ البتہ اس کو نہیں کہہ سکتے۔ یہاں ہر نئے لطیف ڈھے رہی ہے۔ مجتہدین روباہ صفت کے غول کدالیں ہاتھ میں پکڑے عمارات تہذیب وسائنس و فن و نغمہ و رنگ کے گرانے کے درپے ہوئے۔ کہتے ہیں یہ سب خرافات ہے۔ یہاں صرف اللہ کا نام رہے گا۔ گویا کہ اللہ ان کی دانست کا رنگ و بوئے عالم پر چیں بجبیں ہے۔ خدائی فوجدار بنے ہیں۔
لگے دن میں نے اپنے لڑکے منصور کی اردو کی کتاب دیکھی جو اس کے مدرسہ میں مروج ہے میں نے خیال کیا کہ دینیات و مذہبیات کی کتاب ہے۔ سرورق غلط چھپا کیونکہ اول سے آخر مضامین مسائل دینی وقصص سلاطین مسلین درج تھے۔ وہ بھی پھیکے بے مزہ۔ نہ کوئی حکایت تماشا و حیرت کی جس سے تخیل بچے کا جِلا پائے، نہ سیر و مہم کا حال، نہ کوئی تسخیر کائنات کا ذکر از کار نظمیں تو ایسی کہ ذہنِ طفل کو اس میں خوشی نہ ہو فضیلتِ نماز روزہ پر ریاست کی شان میں۔ میں نے سر پیٹا۔ لاحول ولاقوۃ۔ وہ کیسے جاہل بے ذوق لوگ تھے۔ جنھوں نے بچوں کے لئے یہ کتاب لکھی۔ کیا وہ خود بچے نہیں رہے۔ یہ کتاب کیا تھی۔ پند نامہ اس کو کہہ لو۔ موعظت کی نقر برآرائی کہہ لو۔ اہلِ ولایت کے بچے اس عمر میں تصاویر رنگا رنگ سے مزین لائٹز ہیگرڈ وا سٹیونسن کی تصنیفات پڑھتے ہیں۔ مہم جوئیوں کے خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ قوتِ متخیلہ جاگتی و روز افزوں بڑھتی ہے مطالعے میں استغراق ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی کتابیں ہیں ہی نہیں۔ کوئی ان کو لکھنے والا نہیں۔ افسوس! افسوس۔
حساب کی کتاب دیکھتا ہوں یا ابوالعجب۔ سوال تفریق کا دیتے ہیں کہ ابوالحسن کے والد مولانا کفایت حسین کی تسبیح کے دانے یک صد ہیں۔ بیس انھوں نے پڑھ لئے باقی کتنے رہے۔ صاحبہ! میرا قیاس مقتضی ہے اس کا کہ یہاں جو ادب و اخلاق و تخیل نو کی بساط

پر جھاڑ و پھری ہے، اس کی وجہ یہی مدرسوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم سے تو جاہل ان پڑھ رہنا اور مرغزار کوہسار میں بھیڑیں چرانا لاکھ درجہ بہتر تھا۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ مکر و عیاری کے جال میں پھنسے ہیں۔ صبح کے اخبارات کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے اور سارا دن قوم وریاست کا غم کھاتے ہیں۔ مقہوری و بے بسی کے باوجود کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ عذابِ الٰہی اس کو کہتے ہیں۔

تمہارے شہر لندن میں ایک پرچہ موسوم بہ "اتوار آبزور" چھپتا ہے۔ کسی پچھلے شمارے میں ققفانندوس کے داستان طراز عظیم اسکندر ساٹرنتسین صاحب کے لکھے سات قصوں کے تراجم پرچہ کے ضمیمہ ادب پہ درج ہوئے ہیں۔ ان کو ملاحظہ کیجئے گا اور ادب عالیہ کا لطف لیجئے گا۔ اخی المکرم محمد کاظم آبزرور اور دوسرے انگلش پرچوں کے جامع ہیں۔ ان کی عنایت فرمائی سے یہ قصے پڑھے واہ! واہ! ایک قصہ ان میں سے اس طور ہے کہ ایک ٹھنا درخت کا، کہنہ و سال خوردہ، گلتا سڑتا ایک دلدل میں پڑا ہے اور ہجوم و حشرات نے اس کے گڑھوں میں مسکن بنایا ہے اس کی چھال سے نمو و پرورش پلتے ہیں۔ وہ ٹھنا دلدل میں کھبتا ہے اور ہزاروں کیڑے زیریں حصے سے اوپر آجاتے ہیں۔ لاکھوں فنا ہوجاتے ہیں ٹھنا بہتا اور لڑھکتا ہے۔ اور کیڑے فنا بھی ہوتے ہیں لیکن اس گلتے سڑتے کندۂ چوب سے چمٹے ہیں، اپنے ٹھنے کو چھوڑتے نہیں۔ بس اتنا سا قصہ ہے۔ عبارت آرائی نہیں۔ پیرایۂ تحریر سے وہ مرقع بنایا ہے کہ بھول نہیں سکتے۔ صاحبہ جب میں نے یہ پڑھا تو سوچا کہ یہ قصہ میرے اور بہت سے دمسازوں کے حال کے مطابق ہے ایسے قصے یہاں لکھے کون؟ اسکندر ساٹرنتسین سے یارانِ درمند و راست گو جگر کے گھاؤ کھائے ہوئے اس سلطنتِ اسلامی میں پیدا ہونے سے رہے۔ ایک سعادت حسن منٹو یہاں تھے وہ فحش نگاروں کے زمرے میں آئے۔ اجارہ داران مذہب کے مطعون۔ ابھی کسی روز یہاں مجتہدین نعرہ زن ہوں گے کہ کتب اس کی بر سرِ بازار جلاؤ۔ نہ کوئی خریدے نہ پڑھے۔ ان کی بجائے پڑھو مولانا عبدالماجد دریابادی کے ارشادات کو یا داستانوں میں مورخِ اسلام حضرت نسیم

صاحب المتخلص حجازی کے قصہ ہائے روح پرور و حیرانت انگیز کو۔

صاحبہ! میرے لئے یہ موجب یمنت و شادمانی ہے کہ تم میری تصنیف "کھویا ہوا افق" کے بارے میں پرچہ "فنون" میں ایک مضمون لکھنا چاہتی ہو۔ اس پر لکھئے گا کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی۔ تم جو میرا کلامِ نثر پڑھتی ہو، گویا مجھ پر احسان کرتی ہو۔ مضامین فقیر کے جو کچھ ہیں، اکثروں کو مفہوم اُن کا ہاتھ میں نہیں آتا۔ میں خود کو بہلاتا ہوں کہ میں نے اپنے یارانِ دلی کے نام مضامین کے روپ میں مکتوب لکھے ہیں۔ شوق ہمکلامی کیلئے ہے۔ اس کو غنیمت جانتا ہوں اور اپنی خوش نصیبی متصور کرتا ہوں۔

آپ کو یاد ہوگا ایک کتاب میری تقریباً بیس سال پہلے "بیس سو گیارہ" مکتبہ جدید کے مطبع میں چھپی، وہ اکارت ہوئی۔ جن اصحاب نے اسے دیکھا اس کے مطالب کے معنی نہ سمجھ سکے۔ چند ایک نے بھانپا کہ میں نے کیا کہا ہے اور فن طنز نگاری کے ڈھنگ کو سراہا۔ اب جو پیشین گوئیاں میں نے اس میں از راہ کشف لکھی تھیں۔ وہ اس قلمرو میں ایک ایک کر کے پوری ہو رہی ہیں۔ ماحول ناسازگار میں اس کتاب کا نقش دوم چھپنے کی نوبت نہیں آسکتی اور پہلا نقش "گاؤ خورد" کے مصداق ہوا۔

میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ بہت سے سخنور و اکابر ملت یہاں کے مجھ سے آزردہ ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بسبیل مکاتیب آج کل ان کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ مقصود اس سے دل آزاری واللہ نہیں، ان کی ہنسی اُڑانا نہیں۔ محض یہ چاہتا ہوں کہ اپنے کو پہچانیں، آگہی و ہدایت پائیں۔ دولتِ خاکساری کو ڈھونڈیں۔ خود کو ان سے حقیقت میں کمتر اور فروتر جانا۔ جب کبھی خلوت میں اپنے باطن کو آئینہ دکھاتا ہوں تو ہول آتا ہے۔ عفریت فسق و فجور روبرو آنکھیں ملاتا ہے۔ جو میرا وہ سب کا حال اور امتیاز فقط اگر ہے تو یہ کہ صداقت ان لوگوں کو ناقابلِ قبول ہوئی۔ اصل کو سو پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ جنت الحمقاء میں رہنے پر مصر ہیں۔

اور سنو ایک معلم ادب، مضافات لاہور کا رہنے والا۔ انگلش زبان سے ناآشنائے محض۔ اس نے ایک پرچے میں فقیر کی کتاب "کھویا ہوا اُفق"، پر لکھا اور میری غیبت میں کہا کہ یہ جاہل المجہول مخض الف کے نام ب نگارش کی نہیں جانتا۔ میری فسانہ نگاری پر پھبتی کسی۔ میرے ایک شاگرد نے اس عبارت کو نشان کر کے پرچہ مجھے پارسل میں بھیجا۔ مجھ سے اجازت اس کا جواب دینے کی چاہی۔ میں نے اجازت نہ دی۔ اس واسطے کہ کیچڑ زیادہ اُچھلے گا۔ پھر میری تحریر کسی کے دل نشیں نہیں تو میں اس کے منہ کیوں آؤں۔ وہ اپنی دانست میں صحیح ہوگا۔

ہاں صاحب!! ایک شکوہ آپ سے فقیر کو ہے۔ ہمارے ایک دوست عزیز محمد کاظم لغتِ عربی کے ماہر، ارضِ جرمن سے تمہیں ملنے کو ڈاک برقی میں لندن پہنچے۔ ہر چند کہ تم کو اطلاع انہوں نے اپنے ورود کی کر دی تھی۔ تم نے بوجوہ ان سے ملاقات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بے چارے تمہارے دیئے ہوئے پتے پر تمہیں ڈھونڈتے پھرے۔ معلوم ہوا تم وہاں سے نقل مکانی کر کے کہیں اور چلی گئی ہو۔ ہمارے دوست بے حد مایوس اور شرمسار ہوئے۔ اب تم کو کوستے ہیں۔ دیکھو صاحبہ! یہ بات اچھی تم نے نہ کی۔

اب خط کو ختم کرتا ہوں۔ دفتر جاتا ہوں۔ وہاں سے اسے بسیل ہوائی ڈاک تمہارے پہلے پتے پر ارسال کر دوں گا۔ متوقع ہوں تمہیں پہنچ جائے گا۔

دعا میری لیتی جاؤ۔ خدا کرے تمہارا انداز پھیلے، نئے نئے رنگ اس میں پیدا ہوں۔

خدا حافظ!

خیریت کا طالب: خضر

راؤ ریاض الرحمٰن کے نام

اپنے گرو اور دھیالیوگی سوامی راؤ ریاض کی خدمت میں پرنام۔ بندگی۔ نمسکار۔

یہ وقت صبحِ کاذب ہے۔ مرغانِ سحری وامامانِ مساجد شرق و غرب و شمال و جنوب سے اذانیں دیتے ہیں۔ دن یک شنبے کا۔ کل کے اخبار کے حساب سے شوال المکرم کی دسویں، مگھر کی چودھویں اور نومبر کی انتیسویں۔ اخبار کا فون نمبر البتہ وہی رہے گا۔

آپ کے حسبِ فرمان و ہدایت ابھی ابھی یوگا کی حرکات اپنے جسدِ خاکی پر بروئے کار لایا ہوں۔ تین منٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھا۔ سانس کھینچا مہایوگی کے بتائے ہوئے منتر جپے مابعد بآسرۂ دیوار سر کے بل ہو کر شیرآسن کیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں بل آیا۔ چنانچہ باب دردِ کمر شدید ہے بہ جلد نہیں جائے گا۔ قراقرِ معدہ وامعا کو اغلباً ان کرتبوں سے افاقہ ہوا۔ اجابت کھل کر ہونے لگی ہے۔ اسہال کی صورت نہیں۔

آج کل فقیر نے یہ وتیرہ پکڑا ہے کہ اس وقت گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر احبابِ دیرینہ و اکابرینِ ملت کو مکتوب لکھتا ہوں۔ گستاخیاں اور شہادتیں ان سے بہر طور کرتا ہوں اور مقصد اس سے ممدوحین کی دل آزاری حاشا نہیں۔ شغلِ بیکاری کہو۔ دوسروں کو آئینہ دکھا کر لطف اٹھاتا ہوں۔ خود اپنی صورت و سیرت سے بیزار ہوں اور آئینہ صرف اس وقت دیکھتا ہوں جب داڑھی مونڈنے کی نوبت آتی ہے۔ بال تراش کے پاس جاتا ہی نہیں جھیل مانسرور کا جٹا دھار سادھو لگتا ہوں گا۔ یہ مکتوب جو تم کو لکھتا ہوں اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ورنہ کہنے کی کچھ خاص بات نہ تھی۔ کیا لکھوں کیا کہوں۔ ایک عرصے سے تم نے اپنی عنایات سے فقیر کو محروم کر رکھا ہے۔ زمانہ بدلا، تم بدلے، ہم بدلا ہاہاہا!

یوگی صاحب بہادر! از راہِ شکایت نہیں لکھتا آپ کی بے نیازی اور اپنی نامرادی کو روتا ہوں۔ مجھ کو پتہ چلا کہ پچھلے دنوں آپ کارِ سرکار کے سلسلے میں رونق افزائے ملتان شریف

ہوئے اور قدومِ مقدس لزوم سے اس قصبے کو مشرف کیا۔ جہاں آپ شریکِ اجلاس ہوئے وہاں سے چند فرسنگ کے فاصلے پر اس درویش کا دفتر تھا۔ موٹر گاڑی بادرفتار آپ کے پاس تھی۔ ایک گھنٹے میں تم اجلاس کمشنری سے فارغ ہوگئے۔ چاہتے اور رہپلی سی طلبِ دید ہوتی تو گھڑی دو گھڑی کو مجھ کو مل جاتے۔ مگر چاہتے کیونکر تم نے وہاں سے گاڑی پکڑی اور سیدھے پہنچے بہاولپور۔ آجاتے تو تمہارا کچھ نہ بگڑتا۔ میں نہال ہوجاتا۔ ہم کلامی و ہم سخنی کے لمحاتِ چند مزہ دے جاتے۔ سچ ملنے گا۔ یہ دولت ہم زبانی کی اس قصبے میں میسّر کہاں ! میں اس واسطے کہیں آتا جاتا نہیں کسی سے ملتا نہیں۔ ادبِ انگلش کی خوبیوں اور عمدگیوں کا ذکر دلپذیر تمہاری ہمہ دانی اور شیوا بیانی سے کرنے والا اس ریاست میں کون ہے۔ یہاں تو ادب نام کی چیز کو کوئی نہیں جانتا اور پھر انگلش ادب ! آلڈس ہکسلے ڈی۔ ایچ لارنس۔ جان فاولز اور دوسرے سخنورانِ فرنگ کے ادب ضو افشاں کی بات کرنا گویا خود کو خفقانی و مجنون ظاہر کرنا ہے۔

راؤ صاحب کچھ یاد ہے جب زمانہ طالب علمی میں فقیر حضرت رابرٹ لوئی سٹیونسن رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات مثل طفلِ دبستاں مطالعہ کرتا تھا آپ آلڈس ہکسلے ڈی۔ ایچ لارنس اور ورجینا وولف کی داستانوں میں مستغرق تھے۔ ایک تھے اہلِ فرنگ کے ستارہ شناس جے ڈبلیو ڈن۔ ان کی کتاب سکوتِ وقت پر تو تمہاری حرزِ جان تھی۔ اس کے پیرے کے پیرے تم کو حفظ تھے۔ اس طور ملک الشعرا حضرت ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے دلوان تمہارا اوڑھنا بچھونا تھے۔ تیغِ انگلش سے ہم دونو گھائل ہوئے۔ آتشِ شوق بھڑکی کہ بزبان اردو لکھیں ایک حکایت عجیب و حیرت ناک تمہاری ایک پرچے "سویرا" میں چھپی۔ دو تین ناول تم نے فلسفیانہ آغاز کئے ہر وقت ان کی تکمیل میں خون در جگر رہتے تھے۔ ادھورا تم نے ان کو چھوڑا۔ اب جو تم سے کبھی ان امنگوں اور داستانوں کا ذکر آتا ہے تو تم فرماتے ہو، یہ شوقِ فضول تھا۔ فقیر کہتا ہے ریاض الرحمٰن کچھ لکھو، تم ہنستے ہو، کیوں

لکھوں؟ ان اہل فرنگ سے بہتر تو میری تحریر نہیں ہوگی"۔ واہ میاں صاحب! خوب منطق یہ ہے جواز ڈھونڈا ہے اپنے تساہل کی پردہ داری کا جانِ من۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ چونکہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی "سنز اینڈ لورز" کی طرز کی داستان کا لکھنا مشکل ہے۔ آدمی شغل سخن سنجی سے کنارہ کرے۔ برا بھلا کچھ تو کہنا چاہیے۔ جادہ پیمائی تو راہِ منزلِ سلطنت ادب کرنا چاہیے۔ کچھ تو ہاتھ البتہ آئے گا۔ دل کے پھپھولے ورقِ سپید پر پیرہن کاغذی پہنیں گے۔ یہ دلیل تمہاری لغو ہے خارج از اصلیت ہے۔ تصنیفات اہل فرنگ کو ہزاروں کی تعداد میں فراہم کر رکھا ہے ان مصنفین کی دانش و آگہی سے ہم کو بھی فیض یاب کرتے۔ وطن کی ظلمتِ جہالت قدرے چھٹتی، اشخاص توہمات دیرینہ و التماعات فرسودہ سے رستگاری پاتے۔ آفاقِ نو نظارہ کرتے۔

اس سلطنتِ عظیم کی سلامتی کے واسطے دعا کرو۔ اخباروں میں سرحدوں پر اہلِ ہنود سے پھر ہنگامہ آرائی کے چرچے ہیں۔ افواجِ اسلام ریاست کی حفاظت کے لیے صف آرا ہیں شرقی خطے میں بے جگری سے لشکر کفار کی یلغاروں کا منہ پھیرتی ہیں۔ کفار کی حاکم اعلیٰ ہے تو عورت مگر ہٹ کی پکی، دروغ بیانی میں بے باک۔ اس مصیبتِ عظیم کی آنچ اب مدھم ہوتی نظر نہیں آتی نفرت و انتقام کے الاؤ بھڑکتے ہیں۔ تم تو ہمالوگی بدھ کے چیلے ہو۔ بتاؤ کیا صورت پیدا ہونے والی ہے۔ میرا قیاس مقتضی ہے کہ مسلمین کو فتح حاصل ہوگی لیکن ریاست و حکومت کا وہ ڈھنگ نہیں رہے گا۔ اکابران قوم اور اہل تمول گول ہوں گے۔ راج عوام کو ملے گا۔ اب حالات تم دیکھتے ہو۔ افواج بہادر ہماری خون ارزاں خندقوں میں کرتی ہیں قائدین عظام کو تقریر سازی و بیان بازی سے فرصت نہیں۔ باہمی تنازعات میں بے طرح الجھے ہیں۔ کس کی سرکار بنے گی، کون حاکم ہو اور کون صدر الصدور۔ شاعر ترانے بنانے پر مامور ہیں۔ ہیہات ربع صدی ہیں کہاں سے کہاں پہنچے۔

فقیر فکر نہیں کرتا۔ آئمہ عالی کرام و اصحاب سبز پوش ہماری نگہبانی کریں گے۔ دل بہلانے

اور وقت گزاری کے لئے شغلِ نو اختیار کیا ہے۔ اس قصبے کے کبوتر بازوں میں ایک شخص ہے اللہ رکھا خاں، میرے محلے میں رہتے ہیں۔ ان سے دوستی گانٹھی ہے۔ پہر دن رہے ان کے کوٹھے پر چلا جاتا ہوں اور کبوتر پروازی میں شریک ہوتا ہوں۔ زنہار دور بھنگ بھی چل جاتا ہے۔ بہاولپور میں بھنگ کا بھاؤ کیا ہے؟ بھائی سچ پوچھو تو زندگی گزارنے کا بہترین فلسفہ اللہ رکھا خاں صاحب کے اس بیت میں متشکل ہوا ـــ بیت:

دوری ڈنڈا گھسدا رہے   تے ملک ماہی داوسدا رہے

(ماہی لفظ سرائیکی ہے اور اس سے مراد محبوب ہے یعنی خدا)

خیال کرتا ہوں۔ اس فلسفے پر سب خدائی عمل کرنے لگے تو نہ جنگیں ہوں، نہ ظلم و ناانصافی۔ نہ حسد و غیبت۔ سب مزے میں رہیں۔ کوئی کسی سے تعرض نہ کرے۔ بندہ پرور اس فلسفے کو ہنسی میں نہ اڑائیے گا۔ اس عالم کے سلاطین و فاتحین جو ہوئے ہیں۔ اتنے مصروف کار اور آمادہ عمل نہ ہوتے اور اپنے تکیوں میں بیٹھ کر نروان کے حصول کی خاطر بھنگ گھوٹتے تو روئے زمین پر رہنے والے وبا ہائے کشت و خون و دار و گیر سے مامون رہتے۔ خلقت خدا کی چین سے رہتی۔ اس باب میں ایک انشا پرداز انگلستان جے۔ بی۔ پریسٹلے نے ایک مضمون بعنوان "درعند داری کاہلی وبے کاری"، چھاپا ہے کہیں سے مل جائے تو اسے پڑھیے گا۔

یہ فرمائیے آپ کے سیٹھ ـــ آلات زرعی کے دوکاندار نے درویش نوازی کیوں چھوڑ دی بس دعوت نامے کے انتظار میں ہی رہا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے بہاولپور سیٹھ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ضیافت سے لوٹا، وہ مشروب کہ جو مقوّم جسم و مفرّح روح تھا، مسدود ہوا۔ کب بلاتے ہو۔ چاہتا ہوں پھر یاروں کی صحبت میں دھما چوکڑی مچاؤں۔ آواگون دکتی کے بارے میں مباحث ہوں۔ حضرت احمد حسن چغتائی صاحب زمیندار کوٹلہ موسیٰ سے چھیڑ خانی کی جائے۔

مزید لکھتا ہوں کہ میری بینائی میں فتور آگیا ہے۔ موٹر گاڑی چلاتا ہوں تو پانچ گز کے آگے اشیاء و اشخاص ہیولے نظر آتے ہیں۔ صوفی و طبیب فرنگ آلڈس ہکسلے کی کتاب ترقی بصارت پر آپ کے پاس موجود ہو تو کسی آنے جانے والے کے ہاتھ یا بذریعہ رجسٹری پارسل ضرور بھجوا دیجئے گا۔ یہ بات بھولیئے گا نہیں۔

اب روئے سخن قبلہ دیدہ و دل ظہور نظر صاحب کی طرف ہے

امیدوار ہوں کہ حضرت خرسند ہوں گے۔ محفل اخوان میں چہچہاتے ہوں گے شاعری کرتے ہوں گے۔ بے پر کی اڑاتے ہوں گے۔ میاں اس عبارتِ آخر سے مجھ کو یاد آیا۔ کیا آپ نے کبوتر اب بھی پال رکھے ہیں۔ چھ سال آگے کی بات ہے میں تمہارے کابک پر حاضر ہوا تھا اور ہم اور تم پہروں کبوتروں کے کرتب دیکھا کرتے تھے۔ کیسی مسرت و طمانیت قلبی ان طائرانِ اہل صفا کی باہمی وضع الفت کے نظارے سے ہوتی تھی۔ حضرت دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی شغل نہیں۔ جو اشخاص اقسام کبوتر پہچانتے ہیں۔ لقوں اور شیرازی کو الگ الگ بتا سکتے ہیں۔ فقیر کے نزدیک اسکندر و دیو جانس کلبی سے زیادہ خوش نصیب ہوئے۔ گوہر نایاب قلزم حیات کا انہوں نے پایا۔

"ریزہ ریزہ"، کی نظمیں اکثر لے بیٹھتا ہوں۔ باور نہیں آتا کہ ہمارے پھکڑ، لفاظ، خوب دوست نے یہ موجِ خوں صفحہ ورق پر رواں کی ہے بارک اللہ حسن گفتار سے کمال معراج پر کمند ڈالی ہے۔ تراوشِ جگر کو شکل الفاظِ مترنم کی دی ہے۔ آئمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام تم کو جان کیٹس و شیلے اردو زبان کے بننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ انگلش سیکھئے گا اور ان کی شاعری کو پڑھیئے گا۔ دو تین نظمیں جان کیٹس کی "تشبیب ہائے عندلیب" "خاکدانِ یونانی" کے پایہ کی لکھ جاؤ تو نام تمہارا کبھی نہ مٹے گا۔ نظم اردو پر احسان ہوگا۔ ایک یہ بات پیش نظر رہے، شاعری عظیم نوائے دلِ درد مند ہے اور شاعر کو بندہ آزاد ہونا چاہیئے۔ تعصب و جنون کسی دین و مسلک کے بارے میں شاعر صادق کے شانِ شایاں ہرگز نہیں۔ حسن زیبائے سخن سے یہ عناصر گھناتے ہیں خردمندی

وبیدار مغزی و وسیع القلبی کی آنچ رگِ کلام میں نہ سلگے تو اس میں جان نہیں پڑتی۔ کام فن شاعری کا اخلاقی حسن معنی ہے نہ کہ تبلیغ و پند و موعظت۔ نہ کسی نظریہ و خیال کا پرچار۔ میرزا اسداللہ خاں غالب کو جو لوگ اب تک پڑھتے ہیں تو وہ اس واسطے کہ کلام بہار آفریں اس کا دولتِ خلوص سے مالا مال ہے۔ قلوب پر ضرب کرتا ہے۔ بناوٹ وصنعت گری و جھوٹ سے پاک ہے۔

افواجِ ظلمات اندرون ریاست سے اٹھی ہیں۔ پروفیسر ٹالکین صاحب داستان بے مثال کی قلمرو "مارودڑ" کے جنات و غول بیابانی غلبہ حاصل کیا چاہتے ہیں۔ بیرون سے مہارانی سلطنتِ ہند۔ دیوی اندرا دھمکی دیتی ہے "پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجاؤں گی"۔ اللہ اللہ خوابِ کابوس ہے؟ حقیقت ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ متوقع ہوں کہ یہ دورِ ابتلا ختم ہوگا۔ نیرِ عالمتاب روشنی جدید کا اس سرزمین پر چمکے گا۔ نسیم بہار مردہ و نیم مردہ قالبوں میں روح پھونکے گی۔

آؤ حضرت ہم اور تم پھر کبوتر اڑائیں۔

ایک بیت سرائکی میں نے تہالیو گی ریاض الرحمٰن کے نام مکتوب میں نقل کیا ہے۔ اس زمین میں ایک نظم مرصع اگر لکھئے تو لطف آجائے۔ میں اب اللہ رکھا خاں کے گھر کبوتروں کا تماشہ کرنے جاتا ہوں۔

آشفتہ سر

خضر

(مرقومہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء)

کرنل شفیق الرحمٰن کے نام —

اہاہا۔ ہمارے رفیق دیرینہ و یارِ غمخوار شفیق الرحمٰن تشریف لائے۔ شاداں ہوا، دل

کی کلی کھلی۔

جانِ من آج ڈاک کے ہرکارے نے تین خط لا کر دیئے۔ ایک تمہارا بزبان انگلیش۔ دوسرا کراچی کے رہنے والے سید کاظم شاہ ماہر انجنیئر پارچہ بافی کا۔ تیسرے کے کاتب ہمارے ضیلئے محبت چوہدری ضیاء الحق پروفیسر حال مقیم بلاد کراچی تھے۔ میں نے اسے پوسٹ ماسٹر کا احسان جانا کہ تین ہمدم میرے اکٹھے مجھ سے باتیں کرنے آئے۔ مجھ سا خوش نصیب بھی غم خانۂ جہاں میں کون ہوگا۔ پروردگار تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ہاں سنو۔ تین مہینے سے خاکِ پاک ملتان میں پڑا ہوں۔ تم جو شکوہ کرتے ہو میری خاموشی و بے تعلقی کا۔ اور کہتے ہو کہ ملتان پہنچنے کی اطلاع کے خط کے بعد تم کو لکھا نہیں وہ بالکل بجا سر آنکھوں پر۔ میں اب عذرِ گناہ کروں تو وہ بدتر از گناہ ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قراقرِ معدہ کے عوارض نے رنگ و بوئے ہستی سے دل اچاٹ کیا۔ کہیں آتا نہیں۔ کہیں جاتا نہیں۔ دیوان خانے میں تنہا بیٹھا یا لیٹا خونِ جگر پیتا ہوں اور دل کے پھپھولے پھوڑتا ہوں۔ خط لکھوں تو کیوں کر۔ سیاہی کی دوات میں تلچھٹ جمی ہے۔ پیڈ جو منگواتا ہوں وہ میرے بچے ہارون اور سارہ کی نقش سازی کے کام آتا ہے۔ قلم کا رلیف نب سو وہ گھسا اور بیکار ہے اور یہ نب یہاں نایاب ہے۔ ان آفات کا تدارک بھی کر لوں تو پھر لکھوں کیا۔ نہ وہ کیفیتِ سرِوش نہ وہ حدتِ خون۔ نہ وہ جولانیِ طبع۔ ہذیان بکوں گا۔ مفت میں یارانِ دلی کو پریشان کروں گا۔ تم کہو گے یہ خضر بڑا شریر ہے کیسے کیسے بہانے بناتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بہانہ سازی آتی نہیں۔ اور تم سے بہانے کیوں کرنے لگا جو کچھ اوپر لکھا امرِ وقوعی و اصلی ہے اور مبالغہ آمیزی ہرگز نہیں۔

آپ پوچھتے ہیں ملتان کیسا شہر ہے۔ میرا دل لگا یا نہیں۔ جب آیا تو شہر کی دو تین روز سیر کی۔ ہر جگہ خاک اڑتی ہے جس محلے میں نکل جاؤ ایک نہ ایک گورستان انجامِ ہستی کی نوید دینے کو موجود۔ گداگر لاتعداد' بافراط یعنی جتنے کل سلطنت کے عربی خطے میں تین دین کرتے

ہیں۔ ان میں سے نصف یہاں ہوں گے۔ ایک قلعہ ہے ایک حُسین آگاہی اور شاہراہ ابدالی۔ جو اعلیٰا سلطان احمد شاہ ابدالی نے بنوائی تھی اور سرکار کے تعمیرات کے شعبہ نے اس پر تار کول بچھایا ہے۔ حکومت کے عمال و اہلکاران عالی شان مثلاً کمشنر صاحب بہادر علاقہ ملتان ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ملتان، کوتوال شہر اس سڑک پر وسیع و عریض حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پھریرے ممٹیوں سے اڑاتے ہیں۔

دل تمہاری ملاقات کو بہت چاہتا ہے جب احکامات لاہور سے میرے تبادلے کے صادر ہوئے تو سوچا دو دن کے لئے راولپنڈی محبِ قدیم کی دید کے واسطے ہو آؤں کیوں نہ پہنچا! اب اگر میں یہ کہوں کہ عازم سفر یوں نہ ہوا کہ امام ضامن کا ایک روپیہ بازو پر باندھنے والا کوئی نہ تھا کسی نے گیارہ روپے زادِ سفر کے نہ دیئے تو تم کہو گے۔ اس خضر کو بہانے تراشنے خوب آتے ہیں۔ تھوڑا مبالغہ لطفِ تکلم کی خاطر کرتا ہوں اصل بات ہے توسنِ ہمت نے جواب دیا۔ بے خودی کی کیفیت آگے دوری تھی اب دائمی ہے امراض بدنی و روحانی کے مارے زیست مجھ پر دشوار ہوئی۔ سنو گزشتہ جنوری کی اکیسویں تاریخ سے عمر پنجاہ و دو سال پوری ہوئی۔ ابھی سے طاقت سلب ہوئی۔ حواس عنت ربود۔ ڈاڑھیں دونو طرف کی ندارد۔ جب سے ملتان پہنچا ہوں یعنی پانچ ماہ سے حجامت نہیں بنوائی۔ روز خط بنوانے کا قصد کرتا ہوں پھر کاہلی آڑے آتی ہے اور یہ سوچ بھی کہ تھوڑے بہت بال جو سر کے پچھلے نصف پر رہ گئے ہیں وہ بھی حجام مونڈ دے گا۔ حجامت کے تکلف و اہتمام کا مزاج اب متحمل نہیں۔ حال یہ ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے یہ آدمی دین و دنیا سے گیا۔ سڑی منی بنا۔

جانِ خضر! صورت تمہارے یار کی سچ مچ دیکھنے کے لائق ہے۔ میرے بچے تو مجھے سدا سے بابا کہہ کر بلاتے تھے۔ اب تو اچھے خاصے متوسط عمر کے لوگ میرے بزرگ ہونے کو میرے منہ پر مارتے ہیں۔ حد یہ ہے چند روز ہوئے ایک آدمی چالیس پینتالیس برس اس کا سن، میرے پاس آیا۔ ٹھوڑی میری کو ہاتھ سے چھو کر کہتا ہے " بابا جی مجھے اپنا بچہ سمجھو۔ حق میرے

میں دعا کرو،" واللہ سینے پر سانپ پھر گیا۔ ہائے بڑھاپا وقت سے پہلے آیا۔ رخشِ عمر منہ زوری سے اڑا جاتا ہے۔ ہزار طنابیں کھینچو رُکتا نہیں۔ قصہ مختصر قدر انداز قضا چلّہ کمان کھینچے ناوک انگنی کو طیار کھڑا ہے بصد حیلہ اس کو ٹالے جاتا ہوں۔

بھائی تم جھلاؤ گے کہ دوست تمہارا کیا داستانِ اندوہ افزا لے بیٹھا۔ مقصود اس بیانِ حقیقت سے یہ ہے کہ اب یادوں کے سہارے جیتا ہوں اور یادیں بھی کیسی کیسی۔ یاد کرو کم و بیش تیس برس اس کو ہونے کو آئے۔ جب ہم تم لاہور میں درسِ طب و انجنیئری لیتے تھے۔ اتوار کے اتوار تم میری اقامت گاہ میں آ جاتے۔ کیا صحبتیں تھیں۔ کیسی اُمنگ و ولولہ کی گفتگو۔ اہل کیمبرج کے بذلہ سنج پروفیسر سٹیفن لی لاک کی کتابوں کے حصے ہم ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ پھر ہم اور تم حجرے سے مہم آزمائی کی خاطر نکلتے۔ نیز سرما کی تمازت سینکتے۔ طائران طرب انگیز کا سرود سنتے۔ اناج کے کھلیانوں میں سے راوی کی راہ پکڑتے۔ راستہ میں بی بی پاک دامن کا روضہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ یک چشم کے ایک جرنیل صاحب کی شکستہ حویلی اور بہت سی تاریخی عماراتِ کہنہ آتیں۔ وہاں ہم گاہے دم لیتے اور بعض اوقات پتھر سے اپنے نام ان کے درودیوار پر کندہ کرتے۔ راوی کا دریا اس طریق سے میرے مکتب سے چھ کوس کا فاصلہ بنتا تھا۔ ہم ایک پہر دن رہے دریا پر پہنچتے۔ کسل و تھکان ہے ہمارے اعضا ان دنوں بیگانہ تھے۔ موجِ دریا میں ہم دیر تک ناؤ کھیتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمارے قہقہے بلند ہوتے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا، کیا عمر تھی۔ کتنی شتابی سے ہم کو ہنسی آتی تھی۔ گفتگوئے نشاط انگیز کا ایک سیل رواں ہوتا کہ نغمسانہ جاننا سخن سنجانِ زبانِ اردو گاہے ہمارا موضوع بنتے۔ اہل ہنود کے افسانہ طراز کرشن چندر صاحب ایم اے کی ان دنوں بڑی دھوم تھی اور ہم دونوں ان کے پرستار و عاشق۔ شیخ چلی کی طرح ہم تم خیال باندھتے تھے آسمانِ نگارش پر کمند ڈالنے کی، فسانہ فسوں کی قلمرو کو سر کرنے کی۔ ہائے کیا حسرتیں تھیں۔ کتنا اعتماد تھا زندگی پر۔ اب سوچتا ہوں کہ کیا آرزوئیں تھیں جو نقشِ باطل ہوئیں۔ تباہی کا غم نہیں کرتا اور دگر دنگاہ اپنے ہم جنسوں پر دوڑاتا

،موں تو کوئی آدمی ایسا نظر نہیں آتا جس کے مطابق اس کی آرزو کے تمنا بر آئی ہو۔ تم تو پھر بھی بہت کچھ ہوئے۔ مجلد ہفت و ہشت تمہارے اب تک انطباع ہوئے اور اب بھی لوگ ان کو پڑھتے ہیں۔ سب نے سالک نثر ادوکا تمہیں تسلیم کیا۔ شگفتگی و شوخ بیانی سے ایک عالم کا دل موہ لیا۔ سچ پوچھو تو میری حسرت کا تمہاری کامرانی مداوا بنی کہ تمہاری سخن گستری کی شہرت میری ناموری ہے۔ تم نے گوہر مقصود کیا پایا میں نے فخر کیا اور کامرانی اس کو اپنی متصور کیا۔

تم کو ظریف الملک سب نے مانا۔ دوست قدیمی تمہارا البتہ ایک سوال تم سے پوچھتا ہے۔ مبدان مارکر تم معاً پیچھے کیوں ہٹے۔ قلم اپنے ہاتھ سے کیسے دھر دیا۔ سوچو بھائی یہ بات اچھی نہیں قارون سخن تم کو کیوں نہ کہوں کہ اموال بذلہ بیٹ کر بیٹھ گئے۔ جو سرمایہ آفریدگار نے تمہیں ودیعت کیا تھا، لازم تم پر تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اسے لٹاتے جاتے چھپاتے شوخ رنگوں سے فروزاں الفاظ کہ صنعت گری مخص تمہاری تھی اور تم ان کو نثر مطہرہ میں خوبی سے پرو دیتے تھے۔ اب انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ اس کو کہتے ہیں ظلم و ستم خوشی و ہرجائیت۔ یہ نہ کہو کہ مصروفیات کار و مکروہاتِ دنیوی مشق سخن میں مانع ہوئیں۔ کوئی عذر تمہارا قابل سماعت نہیں، حاشا و کلا۔ اصلاً نہیں۔

اور یہ جو تم خوب فرماتے ہو کہ ایک مجموعہ اپنی محررہ حکایات عبدالباقی کا ترتیب دو اور اس کتاب کا انطباع ہو۔ میں کہتا ہوں اول تو وہ حکایات طاقِ ادب میں جگہ پانے کے لائق نہیں۔ دوم اس بکھیڑے میں پڑوں تو کتاب چھپواؤں کہاں سے۔ اخی من چوہدری رشید احمد مہتمم مطبع مکتبہ جدید جو ازراہ دلداری و کرم فرمائی میری کتابیں چھاپتے تھے۔ انہوں نے اب ستارہ شناس، خزینہ علوم روحانی حضرت فیروز نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی اور توبہ کتب ادب کے انطباع سے کرلی کہ منبع فسق و فجور ہیں، مابعد ہذا بیت نصف سے زائد مطبع کے کاریگروں کو وہ فارغ کر چکے ہیں۔ وہ سچے ان کے ہادی و مرشد فیروز نظامی سچے فقیر اب کیا کرے بفرض محال کوئی ناشر احمق، قدردانِ سخن اس کام کو تیار بھی ہو جائے اور کتاب چھپ بھی جائے تو

اس کو پڑھے گا کون۔ اہلِ وطن کو فن و سخن سے وحشت ہوئی۔ اخبار و پرچہ ہائے فلم کے علاوہ کچھ پڑھنا ان کے لئے وبالِ جان! یا پھر تصوف و علوم باطنیہ یعنی ٹوٹے ٹوٹکوں کی کتب چند لوگ پڑھ لیتے ہیں۔ اس واسطے کہ اموال کی افزائش کا کوئی نسخہ تیر بہدف ہاتھ آ جائے اور دونو جہانوں میں سرخرو ہوں۔ تمہاری اطلاع و خاطر جمعی کے لئے یہ عرض کر دوں کہ ایک مجموعہ میرے کلامِ نثر کا دوستِ مشفق سید محمد کاظم بہاولپوری نے ترتیب دے رکھا ہے۔ ان کو لکھتا ہوں کہ بسبیل رجسٹری پارسل تم کو پہنچا دیں تم بھی دیکھو۔ دوسرے اہلِ علم و فضل وہاں کے بھی اس کو دیکھیں تین یا چار دیباچے۔ تقریظیں، تعارف نامے اصحابِ سخن سنج کے اگر مسودے کے آگے پیچھے لگ جائیں تو موجبِ زیبائشِ کتاب ہوگا اور مصنف کا دل بڑھے گا۔ ایک تم، دوسرے کرنل محمد خاں اور تیسرے کوئی اور صاحب جو نثر ظریفانہ کا ذوق رکھتے ہوں۔ تینوں دیباچہ نگاری سے دو دو ہاتھ کریں۔ مادہ تاریخ کا آج کل رواج نہیں۔ میرے نزدیک یہ مستحسن و مناسب ہے کہ دستور قدما کا تھا۔ آخر کو برائی کیا ہے۔ میجر سید ضمیر جعفری قطعے کی طبع آزمائی کریں۔ سنہ جو کچھ بھی نکلے مجھے منظور۔ کتابیں چھپوانا، ناشر کو دام میں لانا تمہارا اور احباب مذکورہ کا کام ہے اس بکھیڑے میں پڑوں گا ہی نہیں۔ تم کو بھی میرا مشورہ ہے کہ اصرار اس کی طباعت پر نہ کرو۔ کتابِ فسانہ و ادب کا اس ریاستِ اسلامیہ و دینیہ میں چھاپنا ناکردہ خوار و کردہ پشیمان کا معاملہ ہے۔ بھائی میں نے اپنی مشقِ سخن گستری کو اپنے محبانِ دلی و روحانی کے نام سندیسہ ہائے ذاتی و خاص گردانا۔ وہ خوش نویس خوش میرا خدا خوش۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہے روزہ میں رکھتا ہوں لیکن لعنت میرے نسیان کو کہ روزہ رکھ کر بھول جاتا ہوں۔ بعد تناول غذا کے یاد آتا ہے کہ روزے سے ہوں۔ مورخِ قوم، نباضِ حالات ملکی حضرت الطاف حسین قریشی کبھی تمہارے پاس پھر آئے؟ ضمیر جعفری کی کتاب "مافی الضمیر" جو ان کے زیرِ اہتمام چھپی ہے انہوں نے اس عاجز کو بھجوا دی تھی۔ وہ ان دنوں اپنے پرچے میں ہر کس و ناکس کے پرزے اڑا رہے ہیں، شاذ ہی کوئی بچ کے رہے گا۔

بہت باتیں کہنے کی ہیں۔ ایک جا ہوں تو زبانیں برسرِ گفتار آئیں۔ آ گئے جیسا ہنستے تھے ویسے پھر ہنسیں۔ اب تو ہنسنا بھی بھول گیا۔

میری چھوٹی بچی آئی ہے کہتی ہے بابا آپ وعدہ بھول گئے۔ آپ کو، ہمیں فلم پہ لے جانا ہے بس ان کو "مستانہ ماہی"، کا بائیسکوپ دکھانے کے لئے جاتا ہوں۔ تمہارے لڑکے بالے میرے بھتیجے، برادرزادے اچھے تو ہیں؟ تو دلیع محبوب کرتا ہوں اور موٹر گاڑی میں جان ڈالنے جاتا ہوں۔

نفتہ جگر

خضر

(مرقومہ ۷، نومبر ۱۹۷۱ء)

نپولین بونا پارٹ کے نام ——

مخدوم و مکرم و مطاع معظم قبلۂ دیدہ و دل نپولین صاحب خلد مقام! حضرت فقیر کی کورنش و بندگی مودبانہ قبول فرمائیے گا۔ بندہ جب طفلِ نان خور تھا اور مدرسہ میں پڑھتا تھا تب سے آپ کا ذکرِ خیر اپنے والد کی محفلوں میں سنتا تھا۔ ان کے کتب خانے میں ایک کتاب انگریزی بارہ جلدوں میں بزبان انگلش بک آف نالج تھی اور میں اکثر اس کی سیر کیا کرتا۔ ایک جلد میں تاریخِ عالم کے باب میں آپ کا احوال نظر افروز ہوا۔ متن میں مختلف سنوں اور مختلف مقامات پر آپ کے حلیہ ہائے مبارک بھی چھپے تھے۔ آپ کی مکتب عسکری والی تصویر، آپ کا واٹرلو کے میدانِ جنگ سے چار گھوڑوں کی بگھی میں بھاگنے کا منظر، سینٹ ہلینا کی چٹان پر بیٹھ کر خاموش بحر بیکراں کو تکنے کا نقشہ حضور ریچ مانیے گا۔ ایک کیفیت دل پہ طاری ہوئی بے دیکھے بھالے حضرت کا آشنا گستہ ہوا۔

اس ضعفِ پیری و عالمِ بیزاری میں جو آپ کو خط لکھنے کا قصد باندھا ہے اس کی وجہ جز

میری عقیدت مندی اور آپ کی ذات والا صفات سے اُلفتِ قلبی کے کچھ اور نہیں۔ نہ مجھ کو تم سے کچھ لینا ہے نہ تم کو مجھے کچھ دینا۔ بس حضرت آپ کی مدح گستری کو جی چاہتا ہے کشور کشایانِ عالم و پادشاہانِ ذیشان کی ارادت جوش مارتی ہے۔ دل کہتا تھا تم سامنے تختِ زریں پر اجلاس فرماتے اور میں تمہارے کفِ پا سے آنکھیں ملتا۔ ایک قصیدہ کسی بیشہ ور قصیدہ گو سے جڑوا کر حضرت کی نذر گزارتا۔ تم سے خلعت اور پنشن کا حکم سنتا۔ پر یہ کیوں کر ممکن ہو۔ تم وہاں شاخِ طوبیٰ کے نیچے، میں یہاں ٹوٹے ہوئے میز پر قلم کی نب گھستا ہوا وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت فی الحال نظر نہیں آتی میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیزِ امکان سے مطلقاً باہر نہیں مگر وقوعِ فوری میں تامل ہے۔ خود کشی کو باری تعالےٰ نے حرام محض فرمایا ہے اور گمان کرتا ہوں کہ آپ بھی اس فعلِ مکروہ کے حق میں نہیں ورنہ سینٹ ہلینا کے مسکن کو مراجعت سے قبل اس پر غور فرماتے۔

حضرت میں جملہ فاتحین جہاں میں سوائے اسکندر یونانی ذوالقرنین رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے سب کا منکر ہوں۔ قیصر روم جولیس صاحب شارلیمان صاحب، اٹیلا و ہانیبل صاحبان اور قہر خداوندی تیمور لنگ خان آپ دونوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ خوشامد کو نہیں کہتا۔ آپ کے انتقال پر ملال کے بعد بہت سوں نے حضرت کے وضع کردہ آئین حرب و ضرب کو حرزِ بازو بنایا اور آپ کا نام بلند کرنے کی خاطر دنیا کے نقشے کو الٹ پلٹ کرنے کا قصد کیا۔ آپ کے ان شاگردوں میں سب سے ہونہار ملک جرمن کے حضرت فلک رفعت ہر ایڈولف ہٹلر اللقب بہ فیوہرر نکلے۔ ایک زمانہ تھا۔ تمہاری طرح ممدوح کل ممالک غرب پر قابض تھے اور اپنی مرضی سے ان کے راج پاٹ اپنے حواریوں میں تقسیم کرتے تھے۔ چھوٹے موٹے آپ کے شاگرد نپولین ثانی اور بھی آئے اور اب بھی اس عالم موجودات میں سینہ تانے پھرتے ہیں مگر ان کی سعی سعئ لاحاصل ہے وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ان میں سے ایک کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ پر لکھے ہوئے ہر رسالے کے جامع ہیں۔ جہاں کہیں کوئی کتاب آپ کی ذات قدسی صفات پر انطباع پذیر ہوتی ہے۔ اس کو

ہر جتن سے حاصل کرکے دم لیتے ہیں۔ چند ایک کی ورق گردانی بھی کر لیتے ہوں گے کیونکہ بوجہ مشغولیت امور ملکی کے اتنا وقت ان کے پاس نہیں کہ کوئی کتاب اول تا آخر مطالعہ کر سکیں۔ فقیر کی طرح حضرت کے ملنے والے ایک اور صاحب ہیں۔ پیر شیریں بیان تیز ہوش، چابکدست۔ اس ریاست کے پہلے حاکم اکبر کے عہد میں وزیر تھے اب زیر عتاب ہیں اور زندان سرکاری میں محبوس۔ افواجِ سرکار میں جرنیلی اعزاز رکھتے ہیں اور شاید کبھی لشکر کی کمان بھی کی ہو فقیر تصدیق اس امر کی نہیں کر سکا حضرت ان سے بڑا عاشق آپ کا پیدا نہیں ہوا۔ اس ریاست میں خیاط قابل نہیں، چنانچہ وہ لندن گئے وہاں ایک کوچہ سیو ائل رو میں ایک خیاط انگلستان سے آپ کی ڈھب کی عسکری وردی بمعہ سہ گوشیہ کلاہ فرنگی چوڑی دار پاجامہ کے تیار کروائی۔ ایک زرگر سے اس نمونے کے تمغے ڈھلوائے جو تم پہنتے تھے۔ بیٹن ان کے پاس جرنیلی کا پہلے سے موجود تھا۔ اس کو آبِ طلائی سے آبدار کیا۔ تب اس پوشاک کی ہیئت کذائی میں اور تمہاری وضع پر ہاتھ پیچھے باندھ کر اور بدن کو کمر سے آگے جھکا کر اپنا فوٹو گراف کھنچوایا۔ اس فوٹو گراف کی مختلف سائز کی کئی سو نقول تیار کرالیں۔ ان کو اب لندن میں اور کوئی کام نہ تھا کہ اسی مقصد سے وہاں گئے تھے۔ چنانچہ یہ کام ختم ہوتے ہی جہاز میں سوار ہو کر عازمِ وطن ہوئے۔ بندر پر اترے تو عوام الناس نے نپولین بونا پارٹ ان کو جان کر ان کی تہنیت کی۔ یہ بھی سنا کہ انگلستان سے لوٹنے کے بعد جو کوئی ان سے بغرضِ ملاقات جاتا۔ یہ اس کو بصد لطف و کرم اس لندن کے فوٹو گراف کی ایک نقل مرحمت کرتے۔ اب بوجہ مجبوری ایسا نہیں کر سکتے کہ قید میں ہیں۔ حضرت باخوش نصیب آپ کو کیوں نہ کہوں۔ ایسے پرستار صادق الوداد فی زمانہ کب کسی کو میسر آتے ہیں۔

لاحول و لا قوۃ۔ میں بھی کیا قصے لے بیٹھا۔ باتیں ذہن میں اور تھیں اور قلم کسی اور ہی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ خرافات بکتا ہوں اور یہ میرے اس اکاون باون برس کی عمر میں معمول ہوا۔ لوگ سٹھیاتے ہیں ساٹھ سال کی عمر میں۔ مجھ پر یہ وقت آٹھ نو سال پہلے آیا۔ ہائے حضرا

کوئی کام کی بات صاحبقراں نپولین سے کرو۔

حضرت کچھ روئداد اپنی مری زبانی سنئے گا کس واسطے کہ مجھ کو اس کا بیان کرکے مزہ آئے گا اور آپ کا حافظہ تازہ ہو جائے گا۔ پندرہ اگست سترہ سو انہتر سن عیسوی میں آپ کو عالم ارواح سے ایک جزیرہ کارسیکا میں بھیجا گیا۔ آپ اطالوی نژاد تھے اور جب آپ کی ولادت مسعود ہوئی آپ کے والد اپنے ہم وطنوں کے لشکر کے سالار اصغر بنے کوہستانوں میں اہل فرانس کی قابض فوجوں کو پیچھے دھکیلنے میں الجھے تھے۔ اہل کارسیکا کو ہوئی شکست کیونکہ غنیم کو بڑی کمک آ پہنچی۔ آپ کو یاد ہو گا۔ آپ نے بہت بعد کسی موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ بڑی بٹالینوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اہل کارسیکا اہل فرانس کے غلام بنے۔ شکست کے بعد آپ کے والد کاونٹ بونا پارٹ بھی اپنے خطاب اور اپنی معاش کو محفوظ کرنے کی خاطر شاہ فرانس کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ میں نہیں کہتا انہوں نے برا کیا۔ یہ نہ کرتے تو احمق ہوتے۔ کیوں صاحب تختہ دار پر چڑھ جانا اور اپنی جائداد کو ضبط کروا لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ مرین فرانس کا ایک شہر ہے۔ وہاں آپ شرفا کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ خاموش شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے چھوٹے سے لڑکے تھے۔ پلوٹارک کو پڑھا کرتے اور اپنے قطعہ باغیچہ میں کسی کو گھسنے نہ دیتے۔ ایک معلم نے آپ کے بارے میں کہا "یہ لڑکا سنگ خارا کا بنا ہے لیکن اس کے اندر کوہ آتش فشاں سلگتا ہے"۔ ایک فرانسیسی ہم مکتب نے تم کو طعنہ دیا "اگر تم کارسیکا والے ایسے ہی جری اور شجاع ہو تو تم کو ہماری ناقابل تسخیر افواج نے کیسے شکست دی؟" تم نے غصے میں بھڑک کر جواب دیا "ہم دس کے مقابل ایک تھے۔ تم ذرا ٹھہرو میں بڑا ہو جاؤں پھر میں تم فرانسیسیوں کو ناکوں چنے چبوا دوں گا"۔ شاباش حضرت۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

واہ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے۔ ایک طالب فرمایہ، اطالیہ کا رہنے والا زبان فرانسیسی میں اٹک اٹک کر بولنے والا۔ اہل فرانس کی فوج میں دس سال کے عرصہ میں مدارج طے کرتا ہوا جرنیل اور اندرون ملک کی افواج کا کمانڈر اعلیٰ ہو جائے۔ مزید آٹھ برس میں یہ

اطالوی الاصل فرانس کے تخت پر تاجپوشی کی رسم عمل میں لائے اور شہنشاہ کا لقب اختیار کرے۔ باور نہیں آتا کہ یہ ہوا کیونکہ اس نوع کی ممتنع الوقوع حیرت افزا حکایت صفحہ تاریخ میں نہ پہلے کسی نے دیکھی نہ سُنی۔

یاد پڑتا ہے کہ محاصرہ طولون میں کامرانی کے بعد ایک سال کے اندر اندر آپ کپتان سے ترقی کر کے بریگیڈ کے جرنیل کے منصب پر پہنچے اور پھر جو ملک اطالیہ پر لشکر کشی کی تو بنیلوز تک جا پہنچے کیسا لشکر چند بدحال سپاہی، گنتی کی توپیں، چند دمدمے۔ یوں کہیئے قسمت یاور تھی۔ شکست نے تمہارے اقبال کے سامنے شکست مانی، انہی اطالوی فتوحات سے حضرت نے پیش آمد اقبال کا تصور باندھا۔ ٹھاٹھ کے دربار اٹلی کے ہر شہر میں لگائے اور شاہی فرمان صادر کئے۔ حضرت فقیر کہتا ہے کہ آپ نے خود اپنے وطن اطالیہ پر چڑھائی کی اور اہل فرانس کے لشکر کا جرنیل بن کر در اصل آپ نہ اطالوی تھے نہ فرانسیسی۔ آپ کا کوئی ملک نہیں تھا۔ طالع آزما خود پرست تھے۔ عجوبہ خداوندی تھے۔ ہزاروں لشکری فرانس کے ان معرکوں میں کام آئے۔ آپ نے میدان کارزار میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا اور واقعی اس میں آپ کی کسر شان تھی۔ انجام اس تمثیل طرب انگیز کا سینٹ ہلینا کے جزیرہ میں ہونا قسام ازل سے قرار پایا۔ جب آپ اطالیہ میں اس لشکر کے جرنیل بنے تو ایک عرصہ کے لئے پیرس تشریف لائے، پچیس سال کی عمر، ولولہ شباب عروج پر تھا۔ ایک ڈومنی جوزفین بیوہارنیس کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ وہ ستم پیشہ عمر میں آپ سے پانچ برس بڑی تھی۔ مگر عشق کو ان باتوں سے علاقہ؟ وہ جبین ورنگین ادا عورت تھی اور اس کے بدن کی رنگت سانولی سلونی تھی۔ رومانِ روح پرور "جین آئر" کے راچسٹر صاحب کی پہلی پاگل بی بی طرح قوم کی "کری اول" تھی یعنی اس کا مولد جزیرہ غرب مارٹینک تھا۔ اگرچہ پلی بڑھی پیرس کے گلی کوچوں میں تھی۔ غدر فرانس کی شدت میں اکابرین انقلاب اس کی زلف کے اسیر ہوئے اس نے حضرت کو مار ڈالا اور آپ نے اس سے نکاح پڑھا لیا۔ جب آپ اطالیہ کو گئے تو روز اس کو

آتشِ شوق سے جلتے خطوط لکھتے تھے اور بستر پر کروٹیں لیتے۔ وہ ڈومنی کھلنڈری جواب نہ دیتی اور جواب دیتی تو سرد مہرانہ، رسمی۔ دراصل تم سے چاہت اس عورت کو بالکل نہ تھی کئی بار پیرس میں گانٹھ رکھے تھے اور ڈیرہ داری اس کی بلول ڈومنی کی شہر کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ تم کڑھتے تھے اور کر کچھ نہ سکتے تھے۔ جذبہ تمہارا اولیٰ اور صادق تھا۔ مالم ہا محبت میں اکثر یوں ہوتا ہے۔ نپولین صاحب!

اطالوی ریاستوں میں معرکہ آرائی سے جی بھر آپ بیڑے پر اپنے لاؤ لشکر سمیت سوار ہوئے اور امیر البحر انگلیشیہ نواب ہورشیو نیلسن کے بیڑے سے آنکھ مچولی کھیلتے سرزمین مصر میں جا اُترے۔ ابوالہول اور اہرام کی زیارت کی۔ ابوالہول کو دیکھ کر اپنے استادِ گرامی اسکندر یونانی ذوالقرنین کا سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عالم شرق میں کوئی خدائی کا دعویٰ کرے تو سب آمنا صدقنا کہتے ہیں اور خطہ یورپ اس کے مقابلے میں چیونٹی کی ڈھیری ہے۔ بازار مصر کی سیر کی۔ اغلباً فخر العشاق مارک انتونی رومی کی بی بی ملکہ قلوپطرہ مرحومہ مغفورہ کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھی۔ اس بی بی نے دو ہزار سال پہلے رحلت فرمائی۔ بقیدِ حیات ہوتی تو حضرت وہیں کے ہو رہتے فرانس کو لوٹنے کا نام نہ لیتے۔ جوزفین بیوہارنیس کی ملاحت وصباحت کو بھول جاتے۔ قاہرہ میں پاشاؤں، شیخوں سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور دین محمدی کی کل ادیان پر فضیلت کا اعلان کیا۔ مخدوم کونین پیمبر اشرف الانبیاء علیہ السلام کا دم بھرتے تھے۔ اور اکثر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اہلِ مصر نے آپ کو مشرف بہ اسلام ہونے پر تہنیت دی۔ قیاس کرتا ہوں کہ کعبہ معظمہ کی حاضری اور خلیفۃ المسلمین بننے کا خیال آپ کو آیا۔ فقیر خضر پوچھتا ہے آپ نے اس مقصد سے منہ موڑا کیوں کر؟ اے خضر کیوں پوچھتا ہے۔ جوزفین کے بغیر آپ بھلا کیونکر جیتے اور پھر انہی دنوں آپ کو ایک خبر پہنچی کہ آپ کی منکوحہ و محبوبہ ایک لشکری کے ٹھیکیدار کے ساتھ پیرس کے سیلونوں میں رنگ رلیاں مناتی ہے۔ کلیجے پر سانپ پھر گیا۔ آخر کو پیرس لوٹے اور یہ ارادہ پکا رکھا کہ کل ارض پر اپنی سلطنت قائم کر کے دم لوگے۔

آپ اور یورپ کی چیونٹی کی ڈھیری پر قناعت کرنے والے! توبہ! توبہ!

حضرت، کل حکایت آپ کی کشورکشائیوں کی نہیں لکھتا کہ ہزارہا کتب ہائے تاریخ و فسانہ میں قلم درخشاں سے مرقوم ہیں۔ القصہ مختصر ستارہ عروج اس کمال کو پہنچا کہ ریاستہائے یورپ کے نواب، راجے، مہاراجے حضرت کو دیکھنے کو پہروں آپ کے دولتکدہ ڈٹلیریز، کے کمرہ ملاقات میں بیٹھے اونگھتے تھے۔ آپ اکثر جھاڑ فانوس سے منور ایوان میں ایک بڑی گول میز پر یورپ کا وسیع و عریض نقشہ سامنے رکھے اس کا مطالعہ کرتے اور افواج کی بجائے اس میں رنگارنگ کی میخیں ٹھونک کر ان کے پڑاؤ متعین کرتے۔ اس زمانہ اوج میں اپنے بھائیوں، برادرزادوں، اعزا و اقربا کو بھولے نہیں۔ خیرات اہلِ خانہ سے شروع کی اور یورپ کے ممالک غرب کے بٹوارے کر کے ان کو ان سلطنتوں کی بادشاہت مرحمت فرمائی۔ ہسپانیہ کی یلغار سے لوٹے۔ اب زارِ قفقاز روس اسکندر صاحب کے شوقِ دیدار میں بے اختیار ہوئے۔ تمنائے وصل نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ تزک و احتشام اپنے دربار کے ساتھ جرمنی کے شہر ارفوت، کی جانب کوچ کیا۔ اسکندر بھی یہاں اپنے دارالسلطنت ماسکو سے پہنچا۔ یورپی ریاستوں کے چونتیس راجے مہاراجے ان دو شاہنشاہوں کی تکبیہ برداری کو ارفوت، میں فراہم ہوئے۔ ایک دربار دلّی میں اسی نوع کا بوقت آمد شہنشاہ ہندوستان جارج خامس صاحب کے لگا تھا۔ اوائل صدی کی بات ہے۔ اس میں ملک ہندوستان کے راجے مہاراجے، نواب، خان، صادق الاولاد سرکار کے خاندانی ہیرے جواہرات ٹانکے جارج صاحب پر نذریں گزرانے جمع ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے اسکندر کی جلیسی میں، والٹیر کی تمثیل ٹھرے اور اہل جرمن کی کئی تمثیلیں تھیٹر میں ملاحظہ فرمائیں۔ والٹیر کی تمثیل کے اخیر پر جب اوڈی پس (ODI PUS) کہتا ہے کہ ایک مرد توانا کی دوستی عطیہ یداللّٰہی ہے، تو تم دونو اٹھے اور سب مشتاقان دید کے سامنے بغل گیر ہوئے۔ ہر دو کو محبوب کی دولتِ وصال ملی۔ زار اسکندر سے حضرت نے خوب یاری گانٹھی، دل کی باتیں جتنی تھیں اس سے کھول کہ کہیں کوئی سربستہ راز نہ رکھا۔ دنیا کی سلطنت

کو منصفی سے آپس میں بانٹنے کی پیش کش کی۔ وہ سلوک تلطفانہ و محرمانہ زار سے کیا جو عاشق لوگ معشوق عورت سے کرتے ہیں حضرت وہ پسیجا، مگر آپ کے مقرب خاص، ٹیلی رانڈ صاحب نے کام خراب کیا۔ وہ فی الواقع نمک حرام منافق تھا۔ تم سے چھپ چھپ کر تمہارے خلاف اسکندر کے کان بھرتا اور وہ ناتجربہ کار، ضعیف دل، کانوں کا کچا اس کی باتوں میں آجاتا۔ شہنشاہوں کے مابین عہدنامہ کا کاغذ مکمل ہوا۔ ٹیلی رانڈ نے زار کے کانوں میں کچھ پھونکا اور زار نے اس پر دستخط کرنے سے عذرداری کی۔ زار اسکندر سے حضرت نے بجھے ہوئے دل سے رخصت لی اور اپنی بگھی میں سوار ہوئے۔ مصری ملازم خاص رستم کوچ بکس پر بیٹھا۔ چونتیس راجوں مہاراجوں نے سلام کیا۔ آپ نے التفات نہ کیا اور جرمنی کے دشت و کشت میں سے فرانس اور پیرس کے عازم ہوئے۔ ہاں حضرت یہ اسکندر نے آپ پر کیا طلسم باندھا جو آپ نے ایک مجلس میں یہ فرمایا۔ مجھ کو اسکندر اچھا لگا، کاش وہ عورت ہوتا تو میں اسے مناکحت میں لے آتا۔ ہمارے مزاجوں میں مناسبت ہے۔ ٹلار فوت میں ہی آپ کی ملاقات ریاست پرشیا کے عظیم شاعر، فلسفی گوئٹے سے ہوئی۔ گوئٹے حضرت سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ آپ نے اس کا رسالہ ورتر، پڑھا تھا۔ صاف صاف اس سے کہا کہ صاحب اس کا انجام ہم کو پسند نہیں اور اس ذہانت و فطانت کی باتیں اس سے کہیں کہ وہ آپ کے گن گاتا مرا۔ سچ کہتا ہوں میں جو تمہاری عزت کرتا ہوں تو اس واسطے کہ تم نرے پرے سپاہی ہی نہ تھے، واقع میں سپہ گری اور آداب حرب کی ماہری میں تم نے وہ رنگ دکھایا کہ اسکندر ذوالقرنین کو رشک آیا۔ لیکن اس کے ساتھ لیاقتِ ذاتی لطفِ گفتگو، خردمندی میں بھی کسی حاکم جہاں کو تمہارا پاسنگ نہیں پاتا۔ دیکھئے حضرت کبھی تو ایسی لطیف بات، اچھی بات کہتے ہو کہ مجھ کو تم پر پیار آتا ہے۔ سچ مچ عارف لگتے ہو بعض باتیں آپ کی یاد آتی ہیں اور محو حیرت ہوں ان کی دانائی پر مثلاً ایک بار کسی عورت نے آپ سے پوچھا "خوشی کیا شے ہے؟" آپ نے کیا خوب جامع جواب دیا کہ کوئی عالم مجتہد کیا دے گا۔ "بی بی۔ اللہ تعالےٰ کی خلقی صلاحیتوں کو بدرجہ کمال تک پہنچانے کی لگن کا نام خوشی ہے"۔ یہ بھی تو آپ کا فرمودہ ہے "لوگ بسیار خوری

سے گور کھودتے ہیں، کم خوری سے کبھی کوئی بیمار نہیں ہوا۔" یہ بھی آپ کا کہنا ہے "جنگ شے متروک ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ توپوں سنگینوں کے بغیر قومیں دوسری قوموں پر فتح یابی حاصل کریں گی۔" مذہب کے بارے میں کیا پتے کی بات کہتے ہوئے "مذہب۔ میں جو میں دیکھتا ہوں وہ پیدائش و موت کے رازہائے تیرہ کی واشگافی نہیں بلکہ نظام انسانی کا قیام ہے۔ تصور حیات بعد از موت سے مذہب مساوات کا سبق دیتا ہے اور جس کی وجہ سے غرباء امراء کی کھال نہیں ادھیڑتے اور صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ مذہب کا وہی اثر ہے جو ٹیکے کا،" وغیرہ وغیرہ۔ کون کون سے ارشادات حضرت کے رقم کرتا جاؤں۔

شہنشاہ ہونے کے بعد بڑا دکھ جو آپ کو ہر پل بے چین رکھتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ سلطنتِ عالم کا وارث کون ہوگا۔ ایک دو حرامی لونڈی زادے تھے اہل فرانس ان کو کیوں کر قبول کریں گے۔ جوزفین بیوپارینیس بانجھ تھی۔ عمر رسیدہ تھی۔ سلطنت کے قیام و استحکام کے لئے حضرت کو عقد ثانی کی سوجھی اور خاندان ہیپس برگ کی ایک بادشہزادی میری لوئی کو بیاہ لائے۔ حضرت نے سوچا اس سے آسٹریا سے اتحاد مستحکم ہو جائے گا اور فی الحقیقت ایک پتھر سے دو شکار مارنے کی نیت تھی۔ آپ کا خسر بوڑھا کاٹیاں تھا۔ اس کے دل میں آپ کی طرف سے میل رہی حالانکہ سعادت مند بخت آور داماد ہر کسی کو میسر نہیں آتے۔ اس کی تمہارے محبوب اسکندر زار روس سے ساز باز جاری رہی۔ جب میری لوئی حاملہ ہوئی تو حضرت خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ملکہ حالتِ زچگی میں تھی۔ طبیب شاہی ایک خبر منحوس لایا کہ بچہ ماں کے پیٹ میں صحیح صورت میں نہیں اور ماں اور بچہ ہر دو کی زندگی خطر میں ہے۔ حضرت یہ خبر سن کر آپ کے ہاتھوں کے طوطے کیونکر نہ اڑتے۔ میری لوئی ملکہ فرانس کی تو خیر تھی اگر بچہ زندہ نہ رہا، تو نپولین بوناپارٹ کی بنائی سلطنتِ جہاں پشت بہ پشت اس کے خاندان میں کیسے چلے گی۔ دو گھڑی بعد ملوک رستم خوش خبری لایا۔ مبارک ہو لڑکا ہوا۔ ملکہ کی بھی جان بچ گئی۔ اہل پیرس نے بائیس توپوں کی سلامی سے جانا کہ ولی عہد سلطنت تولد ہوئے۔ عوام الناس فرطِ مسرت

سے دیوانے ہوئے۔ ایک ملازم نے دیکھا کہ شاہنشاہ کی چشم نیلگوں میں آنسو جھلکتے ہیں۔

یورپ پھر حضرت کو چیونٹی کی ڈھیری لگا۔ شیخ چلی کہ ہم سب میں موجود ہے۔ آپ کے اندر پیدا ہوا بچے کی ولادت کے ایک سال کے اندر آپ نے اپنے محبوب دوست اور ہمارے بھائی زار روس اسکندر کی مملکت پر لشکر کثیر سے چڑھائی کر دی۔ نپولین صاحب! میرا قیاس ہے کہ یہیں سے آپ نے بخت و قسمت کو خیر باد کہی۔ خوش طالعی نے منہ موڑا۔ لشکر جرار دس لاکھ کی نفری کا مع توپ خانہ و رسالہ جس کو دیکھ کر دشمن کا زہرہ آب ہو جائے۔ قفقاز روس کے وسیع لق و دق میں برباد و تباہ ہوا خصوصاً بالتخصیص فرانسیسی گھوڑوں کو روس کی آب و ہوا موافق نہ آئی چنانچہ تین ہزار فوج کشی کے پہلے ہفتے کے اندر خلدِ اسپاں میں پہنچے۔ افواج اسکندر بھی کہیں مقابلے میں نہ آئیں بس پیچھے ہٹتی اور کشت و دشت کو نذر آتش کرتی جائیں۔ جب رسالہ کے گھوڑوں کو چارہ نہ ملا۔ سپاہ کو خوراک میسر نہ ہوئی اور وہ مرنے لگے تو تم کو فکر دامنگیر ہوئی۔ بہتیرے دانت پیسے پیچ و تاب کھائے۔ اپنے یارِ دلی اسکندر زار کو کوسا! اور اس کو ایک دو الفت کے خط تحریر کئے لیکن وہاں سے جواب ندارد۔ اب لوٹو لوٹو کس منہ سے۔ سب ہنسی اڑاتے اور رعب اور ارجمندی کا دبدبہ جو یورپ کے راجوں مہاراجوں کے دلوں پر بیٹھا تھا۔ زائل ہو جاتا اس لئے چار و ناچار آگے بڑھتے گئے۔ آخر کو مع الخیر اسکندر کے دارالسلطنت ماسکو جا پہنچے اور شہر غارت زدہ میں داخل ہونے سے پیشتر ایک ارفع مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ دستور کے مطابق متوقع ہوئے کہ اکابرینِ شہر طشتِ زریں میں شہر کی چابیاں پیش کرنے آئیں گے اور پہلی فتوحات کے طور پر مناسب رسمِ استقبال اہلِ ماسکو کی جانب سے سرانجام پائے گی۔ وہاں دھوئیں کے بادل اٹھتے تھے۔ جب چند پہر انتظار کیا اور کوئی چابیاں لے کر نہ نکلا تو آپ مرے ہوئے مرجھائے ہوئے دل کے ساتھ اس شہر سنسان میں چابیوں کے بغیر داخل ہوئے۔ اللہ اللہ کس ہو کا عالم تھا! نہ امکنہ، نہ اشخاص، کتّے تک نہیں۔ لوٹنے کے لئے یہاں کیا دھرا تھا جو فوج کو اموال غنیمت لوٹنے کا مزہ ملتا۔ محلات کریملن مکینوں سے

خالی پڑے تھے۔ اسکندر زار اپنے اہلِ خانہ کو لے کر سینٹ پیٹرسبرگ مراجعت کر گیا تھا
آپ چار و ناچار وہاں رونق افروز ہوئے۔ جب روزانہ رسالہ کے گھوڑوں کے مرنے اور
لشکریوں کی تباہ حالی کی خبریں سنتے تھے تو دل اُلٹنے لگتا تھا۔ اپنے دوست زار اسکندر کی
بے وفائی اور گریز پائی پر برہم ہوتے، کڑھتے تھے۔ آخر کومنت وزاری کا خط بالواسطہ میر دربار
کاؤنٹ طالسطائی اس کو پیٹرسبرگ بھیجا۔ مضمون یہ کہ میرے والا شان برادر حسین و فسوں خیز ماسکو
کا وجود مٹا اور یہ سب بے سود ہوا۔ یہ انہدامِ شہر سوچا بوجھا، فعل کر رہے ہے۔ جانِ نپولین کیا آپ
کا ارادہ اس سے میری افواج کو نان نفقہ سے محتاج کرنے کا تھا۔ آہ! وہ اناج کے کتنے تہ خانوں میں
بھسم ہو گئے۔ سکندر بھائی! کیوں کر آپ نے عالمِ خاک و بو کے جمیل ترین، بے مثال شہر کو اپنے
ہاتھوں نذرِ غارت زدگی کیا کہ جس کی تعمیر و آرائش عمارات میں کئی صدیاں لگی تھیں۔ فائدہ
حقیر کی خاطر کس لئے اس کی تباہی و ویرانی عمل میں لائے۔ از راہ تلطف اور آپ کے اپنے
مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس شہر تیرہ نصیب کو کہ جسے افواج روس نے خود جلا ڈالا
ہے۔ عارضی طور پر اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ مگر بھائی۔ تم کو مطابق آئین مہمان نوازی اہلکاران
بلدیہ و دستہ رضا کاران کو تو پیچھے چھوڑ جانا لازم تھا۔ صاحب یاد رکھیئے گا۔ میں اس شہر میں
بغیر چابیوں کے داخل ہوا۔ یاد کرتا ہوں کہ آپ کے اصول بلند، دل راست و رفیق مقتضی
ان ہلاکت خیزیوں اور روسیاہیوں کے ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ معرکہ آخر کے بعد ذرا سی پیشکش
مصالحت و دوستی کی کر دیتے تو یہ غریب اپنے لشکر کی پیش قدمی فوراً روک دیتا بلکہ ماسکو
میں اپنے داخلے سے دست کش ہو جاتا۔ سکندر میرے، میں پوچھتا ہوں رسمِ رفاقت کو
نبھانے کا یہ کونسا طریقہ تھا۔ ہماری پرانی دوستی، اختلاط و انبساط کی پہروں گفتگو یاد کیجئے گا۔
اور ماسکو میں تشریف لانے میں تامل نہ کیجئے گا۔ بوجہ مصلحت میرا سینٹ پیٹرسبرگ سفر کرنا حیطہ
امکان میں نہیں ورنہ دل کہتا ہے نپولین بوناپارٹ پر لگاؤ اور اپنے جگری یار اسکندر کے
پاس سینٹ پیٹرسبرگ پہنچ کر اپنے لبِ تشنہ کو اس کے گالوں پر ثبت کرو۔۔۔

زار اسکندر نے اس ہراسلہ شکایت و نصیحت کا جواب تک دینا گوارا نہ کیا ماسکو میں کچھ ماہ کے قیام کے بعد آغاز سرما میں آپ نے وہاں سے مراجعت کی۔ وہ پسپائی تباہی عظیم ہوئی۔ روس کا موسم برفاب ہزاروں کے حساب سے لشکریوں کو نگل گیا۔ توپیں برفانی دلدلوں میں پھنسیں، اسلحہ کے چھکڑے سے چھکڑے بھک سے اُڑے جمے ہوئے لاشے راستے پر جا بجا پڑے تھے۔ تم دس لاکھ کا لشکریے کر پیرس سے چلے۔ اب صرف پچاس ہزار ماسکو پہنچے۔ بدحال چیتھڑوں میں ٹھٹھرتے۔ محنت کشی اور فاقہ کشی سے نحیف و نزار۔ چنانچہ ہزاروں نے اپنے ہتھیار پھینکے۔ ایک مؤرخ نے جو شاہد اس منظر کا تھا اس پسپائی کی ایسی تصویر کھینچی کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دل دہل جاتا ہے۔

نقل: سب سے آگے لشکر کے جرنیل ہیں اور ان میں سے معدودے چند ہی گھوڑوں پر سوار ہیں۔ وہ لگتے ہیں چیتھڑوں میں ملبوس غول، دبلے نزار، داڑھیاں بڑھی اور الجھی ہوئی خمیدہ و خاموش۔ ان کے پیچھے لاٹھیاں ٹیکتے، ہولی یجین کے افسروں کی رجمنٹیں ہیں۔ ان کے سوجے ہوئے پاؤں بھیڑ کی کھال کی رسیوں میں لپیٹے ہیں۔ اس کے بعد محافظ رسالہ کے بچے کھچے لشکری اور ان کے جلو میں تین آدمی پا پیادہ۔ دائیں جانب نیپلز کا بادشاہ۔ بائیں جانب اطالیہ کا وائسرائے۔ ان کے بیچ میں اہلِ پولینڈ کا جُبہ سمور اور سرخ لومڑ کی کھال کا کلاہ اوڑھے، برچی لاٹھی کی مدد سے چلتا ایک چھوٹا سا آدمی ——— فاتحِ عظیم نپولین بونا پارٹ خود!

ہائے ہائے۔ فقیر اس منظر کا تصور کرتا ہے تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا ہے۔
خلاصہ کلام، لشکر کو پیچھے چھوڑ برفانی گاڑی میں پولینڈ میں سے ہوتے گھر آئے۔ دو سال اور اپنے غنیموں سے جنگ و جدال میں گزارے۔ آخر کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا۔ اور جزیرہ ایلبا آپکا زندان مقرر ہوا۔ اگلے ہی سال پھر وہاں سے فرار ہوئے کینس کی بندر میں اترے۔ اقبالِ سکندری نے ساتھ دیا۔ اور افواج فرانس نے استقبال کیا۔ آپ کا پھر پیرس میں ورود اور شاہنشاہی تاج کا پہننا۔ فرمانروا بوربن (BORBON) کا وہاں سے انگلستان کو بھاگنا چند ماہ حکومت کرنا اور پھر بیلجیئم

اور انگلستانی افواج سے واٹرلو کے میدان میں ہزیمت اٹھانا، داستان حیرت فزا ایسی ہے جیسی کبھی کسی نے اس سے پہلے یا آگے سنی نہیں۔ حضرت کو یاد ہوگا ایک لمحہ خوش فکری میں آپ نے اپنے ایک رفیق سے فرمایا "میری حیات بھی گویا ایک نظمِ طرب انگیز ہے" حق یہ ہے اچھا طربیہ تھا۔ خوب طربیہ تھا اس کے رقم کرنے میں البتہ لاکھوں کا خون بہا۔ ایک بار ردبار آسٹریا کا ایلچی میٹر فش آپ سے ڈریسڈن میں ملا اس پر آپ نے ڈورے ڈالے اور یہ واقعہ آپ کی قفقاز روس سے پسپائی کے آگے کا ہے۔ تم حسب معمول جنگ کا نقشہ جماتے تھے اس ایلچی نے کہا "شہنشاہی لشکر نا آزمودہ کار، نوعمر لڑکوں سے جڑا ہے۔ جب یہ گلانِ نو دمیدہ نہنگِ حرب کے جبڑوں میں نگلے جائیں گے تو کیا کیجیے گا۔" حضرت کا چہرہ اس پر غیض و غضب سے زرد ہوا اور آپ چیخے "میاں میٹر فش! تم کو سپہ گری سے کیا علاقہ؟ نہ تم خود سپاہی، نہ تمہارا والد سپاہی۔ تم کو کیا معلوم سپاہی کے دل و دماغ میں تراوش کیا ہوتی ہے۔ مجھ سا آدمی دس لاکھ انسانوں کی جانوں کے ضیاع کو پرکاہ کی وقعت نہیں دیتا۔" جھلاہٹ میں اپنے کلاہ کو میٹر فش کے منہ پر مارا۔ ہاں حضرت حرب و ضرب تمہارا فن تھا اور ہنرمند کو اپنے پیشے کے اوزار استعمال کرنے پر ملامت نہیں کر سکتے۔ میں نے مانا کہ جنگ و جدل انسانی زندگیوں سے کی جاتی ہے اور لاشے اسے حسن و شکوہ عطا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں حضرت آپ کا چہرہ ایک اسپ کے عالمِ نزع پر زرد پڑ جاتا تھا۔ ایک آدمی کا مرنا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رقیق القلب انتہا درجے کے تھے۔ پر ہزاروں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت میدان جنگ میں باعثِ ملال طبع نہ ہوتی تھی۔

واٹرلو کی ہزیمت کے بعد پیرس سے بگھی میں بے یار و مددگار بھاگے جرنیل گورگارڈ آپ کے ہم سفر ہوئے۔ بندرگاہ راچ فورٹ پر ایک انگلستانی جہاز حربیہ موسوم بہ "بیلرفان" لنگر انداز تھا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ جب وہ آپ کو لئے پورٹ ماؤتھ کی بندر انگلستان پر پہنچا تو جوق در جوق لوگ ہزاروں کی تعداد میں آپ کی زیارت کو فراہم ہوئے۔ سات دن بعد پارلیمنٹ نے حکم لگایا آپ کو سینٹ ہلینا کے جزیرہ میں محبوس کرنے کا اور اس طرح آپ اس

مسکن دل کشا و روح افزا میں تا عرصہ حیات اقامت پذیر ہو گئے چھ سال ہمارے شیر ببر نے اس لق و دق چٹان پر کاٹے اور پھر مالک قضا و قدر سے حکم رہائی آ گیا۔ واہ واہ طریہ عظیم کو وہ منقطع لاجواب و مناسب بہم ہوا کہ باید و شاید۔

اس قید میں کمال یاس استغنا بنا تصور کرتا ہوں کہ فنِ حرب کا ماہر اپنے اقتدار چھن جانے پر کیا کچھ پیچ و تاب نہ کھاتا ہوگا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ پہروں آپ اپنا سبز کوٹ پہنے لیجن آف آنر کا ستارہ سینے پر سجائے، سہ گوشہ کلاہ ہاتھ میں پکڑے، ہاتھوں کو پشت کے پیچھے باندھے ایک چٹان مرتفع پر کھڑے بحرِ پُر تموج کا نظارہ کرتے تھے محسوس کرتے ہوں گے اپنی تنہائی کو۔ اس خاکدانِ تیرہ و تار میں اپنے اجنبی ہونے کو۔ خدا کو معلوم کیسے کیسے خیالاتِ پر حسرت خانۂ ذہن میں گنہ رتے ہوں گے۔ پچیس سال کی عمر میں ملک اطالیہ میں اپنی فتح یابیاں اور عوام الناس کی تہنیت پر جوش۔ ستم پیشہ جوزفین کی کافرانہ رنگین ادائیاں اور بے وفائیاں۔ شہنشاہی کے کر و فر اور کل نوابانِ یورپ کی حاضر باشی۔ چالیس سے اوپر لڑائیاں۔ پولینڈ کی صاحبِ جمال ہوش ربا امیر زادی میری ویلیسکا کی الفتِ والہانہ۔ زار سکندر کی ہرجائیت اور ماسکو سے ہولناک واپسی۔ اپنے واحد بیٹے پسرِ حقیقی ولی عہد کی ماں میری لوئی کی بے رخی اور آسٹریا کے ایک فوجی افسر سے کھلم کھلا معاشقہ۔ واٹر لو کی روسیاہی۔ اپنے آدابِ حرب میں کمال پر اتراتے اور اس میں مار کھا جانے پر برہم ہوتے ہوں گے۔ زنہار خنداں بھی ہوتے ہوں گے کہ آخر کو طالع آزما ہی تو تھے۔ ملک کے بغیر مقصدِ اعلیٰ سے سٹغنی۔ صفحہ ہستی میں مسافر اجنبی۔ کیا کھویا کیا پایا۔ اس سے کیا مطلب اور کیسا غم۔ جس شغل کا شوق تھا یعنی فنِ حرب کا، اس میں سخت کوشی کی اور اسی کو عیش کہتے ہیں۔ ہاں یہ خواہش کرتے ہوں گے کہ اپنی سفر کی بگھی کا کوچبان، مملوک نسل کا رستم تمہارے پاس ہوتا۔ قیاس کرتا ہوں۔ وہ رستم تمہارا ایک ہی یار وفادار اس دنیا میں تھا۔ حضرت سے سگِ لیلیٰ کے طور پر چاہت کرتا تھا۔

سینٹ ہلینا میں تمہاری قید اور کیفیتِ ذہنی پر ہزاروں رسالے لوگوں نے رقم کئے۔ بےشمار

تفاسیر انطباع ہوئیں۔ پھر بھی کیسی حکایتِ دلنواز و درد مندانہ ہے جو سیریِ قلب ہوتی نہیں۔ حضرت میں آپ کے ذہن کو تازہ کرنے کی خاطر دو قصے اس میں سے نقل کرتا ہوں اور وہ آپ کے جوہرِ طبع کے اصل رنگ کے غماز ہیں۔

نقل: اس جزیرہ لق ودق پر رہنے والوں میں ایک شخص تھا قوم کا ملایا، جزائر شرق اس کا مولد، نام تو بیا۔ بچپن میں اس کو کوئی قزاق بحری اغوا کر کے لے گیا اور بطور غلام کسی فرنگی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ وہ بدنصیب اب اس دور دراز کے جزیرے پر محنت و مشقت کرتا تھا۔ آپ کبھی اس تو بیا کو باغ میں کام کرتے ہوئے دیکھتے۔ کبھی وہ آپ کو راستے میں مل جاتا۔ اس کے احوال پر توجہ کرتے تم تھکتے نہیں تھے۔ جب وہ نظر آتا اس سے دو بول کہتے ضرور، اور ایک اشرفی اس کی مٹھی میں تھما دیتے۔ وہ ملایا غلام ٹوٹی پھوٹی زبان انگلش میں آپ کا تشکر کرتا۔ "اچھا جنٹلمین!" آپ نے ایک دفعہ اپنے مصاحب گورگاڈ سے اس ملایا کی حالت پر اظہارِ تاسف و درد مند نوازی کیا اور خود کو اس کی جگہ تصور کیا۔ "بے چارہ تو بیا اپنے اہل خاندان سے دور، اپنے گھر سے بچھڑا، فروخت شدہ غلام۔ آہ! گورگاڈ اس سے بڑا ظلم بھی کوئی ہوگا۔ اگر کسی بحری کپتان نے یہ فعل کیا ہے تو وہ سخت سفاک بدمعاش ہوگا۔ لیکن اگر جہاز کے ملاحوں نے مل کر اسے پکڑا تو ان کو ہم قابلِ تعزیر گمان نہیں کر سکتے۔ بہیمیت و سفاکی، فردِ واحد سے سرزد ہوتی ہے۔ نہ افراد مجموعہ سے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے برادر اُن کو مارنے کے بارے میں ارادہ پختہ نہیں کر سکے۔ لیکن یہوداہ نے اپنے آقا یسوع کو چند دینار کے عوض بیچ دیا۔" جب اس کے بعد تو بیا سے ملاقات ہوئی تو زبانِ مبارک یوں سر گفتار آئی "بھائی گورگاڈ۔ کلِ انسانی بھی کیسی بے کل کل ہے۔ اصلاً ترحم انگیز، ایک کی ساخت بدنی و پوشش جسمانی دوسرے سے نہیں ملتی۔ ایک کا ذہن و طبیعت کا رنگ دوسرے سے الگ اور مختلف ہے۔ وہ لوگ کہ صداقتِ اصلی کو جاننے میں توغل کرتے ہیں۔ بڑے قصور کر بیٹھتے ہیں۔ اگر یہی شخص تو بیا طبع و مزاج میں بروٹس رومی ہوتا تو وہ اب تک ان چٹانوں سے سمندر میں چھلانگ لگا کر جان دے چکا ہوتا۔ اگر وہ ایسیپ

یونانی ہوتا تو سینٹ ہلینا کا گورنر بنا ہوتا۔ اچھا صلح نصرانی ہونے کی صورت میں اپنے سلاسل پہننے پر دعائے تشکر کے ہاتھ اٹھاتا۔ مگر گورگاڈ۔ وہ نہ بروٹس ہے، نہ ایسپ اور نہ ہی یسوعی راہب وہ محض غریب تو بیلا ہے اور اس لئے سادہ دلی میں اپنا سر نیچے ڈالے باغ کی کھدائی کرتا ہے۔"

شہنشاہِ شکستہ دل آپ نے اس سیاہ فام بھجنگ غلام تو بیا سے وہی انسیت دیکھائی وموانست محسوس کی جو ایک وقت اپنے کوچبان وفادار رستم مملوکی سے تھی۔ فقیر کے نزدیک آپ کا اس امر کا احساس واقرار کرنا کہ کل بنی آدم کا خمیر ایک ہے اور تو بیا اور شہنشاہ فرانس میں فرق کچھ نہیں ماسوا ذہن وطبع کے امتیازِ اتفاقی کے، آپ کی آگہی کی دلیل ہے۔ دل آپ کا اصل جوہرِ انسانیت سے خالی نہ تھا۔

آخر میں آپ نے اس غلام کو خریدا۔ چاہتے تھے اس کو کسی طرح اپنے وطن کو اور اپنے اعزا کے پاس واپس بھیجو۔ پر گورنر انگلستان جزیرے کا سنکی المزاج تھا۔ اس نے غلام تو بیا کو وطن بھیجنے سے عذر داری کر دی۔ یعنی تو بیا غریب ایک دور دراز بیابان جزیرہ میں تمہاری طرح قیدی غلام ہی رہا۔

نقل: آخری ایام آپ پر بڑے سخت گزرے۔ موروثی مرض جان لیوا جگر متورم نے زور کیا۔ معدہ وامعاء میں ایک گونہ آگ جلتی تھی۔ مستقل تپ رہتی تھی۔ جب دورہ کی شدت ہوتی تو درد سے بے حال ہو کر فرش پر لوٹتے تھے۔ تب ہی آپ نے فرمایا: "اپنے بستر سے مجھ کو محبت کمال ہوئی ایسی کہ تخت وتاج لعل وگہر کے لئے اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔" واہ حضرت فقیر کے دل کی بات آپ نے کہی سابقہ میں کب تخت وتاج واموال رکھتا تھا جو اب ان کا متمنی ہوں۔ بہ فخر مجھ کو حاصل ہے کہ تمہارا ہم مرض ہوا۔ انشاء اللہ العزیز یہی بہانہ تمہارے پاس پہنچنے اور باعث حضرت کے دیدار کا بنے گا (دیکھ خضر احمق! کیوں فرشتہ اجل کو یوں دعوت دیتا ہے۔ اس نے سن لیا تو دیر نہیں کرے گا۔)

ہاں ایک دن آپ کے ملازم خاص نے اطلاع دی کہ ایک ستارہ دمدار سطح فلک پر

نظر آیا ہے۔ آپ بولے "قیصرِ روم کی رحلت پر بھی یہی علامت فلکی نمودار ہوئی تھی"، لیکن جب آپ کے طبیب نے حضرت کی تشفی کی "کوئی دمدار ستارہ نظر نہیں آیا تو آپ نے فوراً جواب دیا "درست! لوگ ستارہ ہائے دمدار کے بغیر بھی مر جاتے ہیں۔"

رفتہ رفتہ سب رفیقانِ خاص آپ کو چھوڑ کر فرانس چلے گئے۔ صرف پانچ تمہارے مولد کارسیکا کے باشندے تمہاری خدمت میں رہ گئے۔ اور ان میں سے دو ہی کسی کام کے تھے۔ ایک مالش کرنے والا اور دوسرا باورچی، طبیب انٹامارچی جوان سال تھا۔ ناآزمودہ کار، ڈیننگ یا زباقی دو پادری تھے۔ ان میں ایک بہرہ پیر سال آدمی تھا۔ فالج زدہ اور قوت گویائی اس کی عارضے سے متاثر تھی۔ دوسرا تازہ تحصیل شدہ کندہ ناتراش اور اجہل مجہول تھا۔ پھر بھی اپنے وطن، اپنے جزیرہ اور اپنی نسل کے لوگوں کی دید سے آپ کے وہ جذباتِ حبِ وطن بیدار ہوئے جن کو آپ نے فرانسیسی کہلانے کی خاطر گھونٹ ڈالا تھا۔ نپولین صاحب! آپ اطالوی ہی پیدا ہوئے اور اطالوی ہی مرے۔ اب ان آخری ایام میں آپ اپنے جزیرے کی بولی اطالوی میں اکثر متکلم رہتے تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے آپ نے اپنے طبیب انٹامارچی سے اپنے وطن سے لگاؤ کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"آہ طبیب! میرے کارسیکا کا جمیل آسمان کہاں ہے؟ کاش میں فرار ہوکر وہاں پہنچ جاتا۔ میرے وطن کے لوگ مجھے اپنے کھلے بازوؤں میں لیتے اور میرا کنبہ بن جاتے انٹامارچی کیا تم سمجھتے ہو اتحادی دشمن میرے کارسیکا میں مجھ پر غلبہ پا سکتے تھے۔ تم ہماری پہاڑیوں کو جانتے ہو۔ ان کا جگر، ان کی جرات، ان کا غرور۔ انٹامارچی۔ میں اپنے جزیرے کی ایک ایک وادی۔ ایک ایک گھاٹی۔ ایک ایک نالے سے واقف ہوں۔ ہر شے وہاں کی ساری دنیا میں سب سے اچھی ہے۔ وہاں کی زمین کی بو کتنی سوندھی اور میٹھی ہے۔ میری آنکھیں بند بھی ہوں تو میں اس زمین کو پہچان لوں۔ یورپ کے کسی خطے میں وہ بو باس نہیں۔ انٹامارچی۔ اپنے جنم

کے گھر کا والی نہ رہنا اور بے خانماں آوارہ ہو جانا بھی تو جلاوطنی ہے۔"

آپ نے ایک طویل وصیت رقم فرمائی۔ . . . آپ کے آخری الفاظ ہذیان کی حالت میں آپ کے ملازم خاص نے سُنے "فرانس ــــ آرمی۔ ٹی آر می ــــ جوزوفین" دن ڈھلنے میں ایک پہر باقی تھا جنوب مشرقی ہوا غضب ناکی میں آپ کے لگائے ہوئے باغیچے کے درخت اکھڑتی تھی۔ اس وقت تم پر عالم نزع طاری ہوا اور اُدھر آفتاب آبِ بحر میں غوطہ زن ہوا، اِدھر تمہارے سانس پورے ہوگئے۔

حضرت اعادہ ان تفصیلات کا آپ کے حافظے کو تازہ کرنے کے لئے کرتا ہوں اور یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے جو پندرہ سال خطۂ یورپ میں اودھم مچایا اور ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں اور گھوڑوں کو اپنے فن حرب کی مشق کی بھینٹ چڑھایا تو اس سے آپ کی غرض و غایت کیا تھی۔ کونسا مقصد ارفع اس سے حاصل ہوا میرا قیاس اس کا مقتضی ہے آپ کو فقط نمود و شہرت مطلوب تھی سکندر ذوالقرنین یونانی اور چنگیز خاں رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو گرد کرنے کی ٹھانی تھی، حصول کمال فنِ حرب میں منظور تھا اور ملک فرانس کا دارالحرب بن جانا محض اتفاق۔ رفقا از روس کی فوج میں لیفٹیننٹ ہوتے تو وہاں بھی کسی طور اپنے ملکۂ فنِ حرب کا اظہار کرتے اور زار روس بن کر مشرق و مغرب کو تہ و بالا کر کے دم لیتے۔ در انحالیکہ میں فن سپہ گری سے بے بہرہ ہوں۔ آپ کے احوالِ دل اور مجبوری طبع کا اندازہ کرتا ہوں۔ فن خواہ کوئی بھی ہو اس میں سخت کوشش کرنے والا مرد اب معراج کمال کو پانے کے غم میں مرتا ہے۔ صاحب فن حرب سے کمتر درجے کا ایک فن سخن گزاری کا ہے۔ والٹیر اور گوئٹے اور شیکسپیئر کا فن۔ جس بد قسمت کو اس فن سے مناسبتِ طبع ہو۔ اس کو کوئی قرار اس دنیا میں نہیں۔ پیسٹوا یانِ فن کو نیچا دکھانے ایک لاثانی داستان نظم تمثیل لکھ کر حیاتِ مدام پر کمند ڈالنے کی تمنائے خام میں وہ جی ہلکان کرتا ہے۔ بہتیرے اس غم میں دنیا جہان سے گئے اور اپنے واٹر لو کو پہنچے۔ اس فن میں محویت سے البتہ ہزاروں لاکھوں جانوں کا ضیاع نہیں ہوتا صرف بال بچے بھوکے مرتے ہیں اور اپنی جان

ہر لمحہ خون دیدہ جگر رہتی ہے۔

معاف کیجیے گا۔خط بے جا طویل ہوا۔آپ کے قلب کو جلایا اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔پھر بھی کئی باتیں جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں سکا اور کئی جو نہیں کہنا چاہتا تھا کہہ ڈالیں۔جگر متورم کے عارضہ نے ہوش و حواس کہاں برقرار رکھے ہیں۔

حضرت یہ خط آپ کو بھیجوں کیوں کر۔تمہارا جنت میں مسکون ہونا اس لئے قرین قیاس ہے کہ تم مذہب اسلام اور اس کے پیمبر مخدوم کونین کو اچھا جانتے تھے،کعبہ کے کبوتروں کو دانہ کھلانے کی آرزو رکھتے تھے،ایک وسیلہ سوجھا ہے،دو ولی صاحب کرامت قدرت اللہ اور مفتی عہد ممتاز مفتی اس قلمرو میں رہتے ہیں۔سالک مجذوب چند برس سے ہیں،ان کی منت کرتا ہوں وہ کوئی صورت اس خط کی ترسیل کی نکال لیں گے۔

حضرت کے لا تعداد پیرو کاروں کا جرگہ آپ کے حضور میں مجرا عرض کرتا ہے قبول فرمایئے گا۔ان کو خرسند کیجئے گا۔

نواب زادی میری و بلسکا کی خدمت میں سلام شوق۔رستم خاں مملو کی سابق کوچبان اور رملایا غلام نو بیا کو بندگی۔

بندۂ درگاہ

خضر اعظم

(۲۰ ؍ نومبر ۱۹۷۲ء)

مختار مسعود کے نام ــــــــ

جناب عالی!

آداب بجا لاتا ہوں۔آپ کی تصنیف کا رسالہ "آواز دوست" نظر افروز ہوا۔سبحان اللہ!

نثر اردو زبان کو لباس مکلف اور زیور سخن سے آراستہ کر کے رد کش ماہ تمام بنایا ہے۔ پر سچ تو یہ ہے کہ تم کو سخن طرازی میں ید طولیٰ حاصل ہے اور الفاظ کے طوطا مینا اس صناعی سے تراشے ہیں کہ دل الجھنے لگتا ہے۔ ہزار کوشش سے شاہدِ معنی ہاتھ نہیں آتا اور یہی وجہ ہے دیدہ وروں کی نظر میں اس نگارش کے آناً فاناً کارنامۂ اردو کا درجہ حاصل کرنے کی۔ صاحب! تم نے نثر گلفشاں میں وہ رنگ دکھایا کہ ابوالکلام آزاد نے خلد میں پانی بھرا اور نیاز فتحپوری نے سر پر دھول ڈالی۔ یہ رسالہ فن تاریخ نویسی و سوانح نگاری کا اعجاز ہے اور اس فن کا اس سلطنتِ پاکستان میں آج تمہارا مثیل نہیں۔ جیتے رہو۔ تمہارا اور تمہارے مداحوں کا دم غنیمت ہے سنتے ہیں اس رسالہ کے نقشِ اول کے انطباع کے دو ماہ بعد سب نسخے ختم ہو گئے اور نقش ثانیہ کی نوبت آئی۔ خدا کرے اس رسالے کے پے بہ پے نقوش صفحہ دہر پر ثبت ہوں اور اس کے ساتھ تمہارا نام چہار دانگ عالم میں پھیلے۔ کیوں کر نہ کہوں فقیر کو اس مقبولیت پر رشک نہیں آیا کہ فقیر کا ایک رسالہ موسوم بہ "کھویا ہوا اُفق" پانچ سال ہوئے کسی نہ کسی طور سے چھپ کر بازار میں آیا تھا، وہ اب تک مہتمم مطبع کے گودام میں پڑا اسڑتا ہے۔ میرا کیا منہ کہ پوچھوں کہ رمز، اردو کتابوں کو سپید چکنے کاغذ پر طبع کرانے اور ہاتھوں ہاتھ بکوانے کی کیا ہے۔ یہ رمز کس ولی باکرامت نے تم کو سجھائی۔ باور کرتا ہوں کہ جو مصنف بلند منصب ہوگا اس کی نگارش بھی بلند ہو گی۔ اخوان باصفا بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گے۔ صف آرا ہو کر مجرے عرض کریں گے جو کچھ حضرت کے اس صحیفۂ دانش و آگہی کے بارے میں البعاض اشخاص نے لکھا ہے اسے پڑھتا ہوں اور اپنا سر پیٹتا ہوں۔ خلل دماغ کی کئی صورتیں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس عمر میں میرے حواس بجا ہیں۔ البتہ تمہارے ثنا خواں اگر فی الواقع صادق الوداد ہوشمند ہیں اور ان کے دعوے سچے ہیں تو اس سال کے ادب کے نوبل پرائز کا تمغہ تم کو ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ ایک صاحب آسٹریلیا کے پیٹرک وہائٹ لے اڑے۔ وہ سعادت حسن منٹو کی طرح جھوٹی سچی داستان طرازی کرتے ہیں یعنی فضول بیکار کی قصہ گوئی

جس سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ فن تاریخ نگاری اور مردم پرستی سے بیگانہ محض ہیں۔ اس دنیلٹے دوں کی پرفریب نظارگی سے بادہ مست جھومتے ہیں۔ ہر آدمی کو والہانہ محبت سے گلے لگاتے ہیں اور قوم و ملت، کالے گورے، ہندو عیسائی میں تمیز نہیں کرتے۔ ان بے چاروں کو تاریخ امم سے کیا علاقہ، ضوابطِ اخلاق کی تعلیم سے کیا تعلق۔ خلاصہ کلام یہ کہ ادب کا نوبل پرائز ملا تو ایک افرنگی اہل نصاریٰ کے یاوہ گو شخص کو جو فسانہ فسوں کہنے میں اپنا اور دوسروں کا ضیاع اوقات کرتا ہے۔ خیال باندھتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو شراب کی بوتل چوپے کی جیب میں ڈالے، سر پر تولیہ لئے۔ تم کو ٹھنڈی سڑک پر ملا۔ تم اپنی پتلون کوٹ، اینٹھے کالر میں اکڑے۔ ایک نگاہِ تمسخر انگیز، تحقیر آمیز اس شرابی کبابی پر ڈالی اور اپنا منہ پھیر لیا۔ مابعد اس کے عدالت عالیہ کے سامنے ایک نیم تلے رُکے، بڑی نفاست سے واسکٹ کی جیب سے اپنی مطلّا آٹوگراف بک نکالی اور پارکر کے قلم رواں سے اس کے ایک ورق پر خود اپنا ایک آٹوگراف لکھا۔ پھر اپنی بلندئ ذوق پر مسکراتے چھڑی ہلاتے اپنے ڈھنگ کے کسی بڑے آدمی کی پیہم جستجو میں ٹھنڈی سڑک پر رواں دواں ہوئے۔

سنو صاحب! آوازِ دوست وہ ہوتی ہے جس کو سن کر دھڑکن تیز ہو، کون و مکاں کے بیچ کے پردے اٹھیں، ہمدمی، دردمندی کے احساسات سینے میں جاگیں۔ تمہاری "آوازِ دوست"، میرے دوست کی آواز نہیں۔ میں اس کو نہیں پہچانتا مگر اغلباً کان میرے اس سے ناآشنا نہیں کہ یہ اس طور کی ندائے پر فصاحت بہزار آہنگ اکثر اس سلطنت کے ہر منبر و محراب، دفترِ اخبار، جامعہ کے شہ نشیں سے سامع نواز ہوتی ہے۔ فقیر کے کانوں میں ایسی نداؤں سے خراش لاحق ہوتی ہے، دل ملول ہو جاتا ہے۔ تم نے البتہ بات کہنے کا ایک اپنا ڈھنگ ایجاد کیا ہے۔ الفاظ کے روپ کو غازے کی تابانی دے کر شاہدِ نگارش کو سنہری روپہلی پیرہن پہنایا ہے، ہم نشینان محفل کو شاید تمہارا یہ انداز پسند آئے گا اور پسند آیا ہے جو انہوں نے اسے گھوڑے کی باگ کی مانند اٹھایا۔ میرے لئے تمہاری بات میں لطف

نہیں، مزہ نہیں۔ جامعہ کی سند کے حصول کی خاطر جیسے مضامین اختراع کئے جاتے ہیں۔ ویسا ہی
تمہارے رسالے کا اوّلین مضمون "مینارِ پاکستان"، فقیر کو لگا۔ فرق یہ کہ اس میں علم تاریخ کی خود نمائی
اور دھوم دھام کی عبارت آرائی بدرجہ کمال ہے جو ہر کتاب کی دسترس میں نہیں۔ اس مضمون
کو پڑھتے ہوئے فقیر کو اس طور احساس ہوا کہ گویا کوئی نک سک سے درست، جامہ زیب اعلیٰ مقام
شخص مینارِ پاکستان کے اوپر چڑھ کر اپنی رونمائی کرتا ہے، ساتھ یہ خیال میں رکھے ہے
کہ کہیں پتلون میں سلوٹ نہ پڑ جائے اور گردن میں پڑی "ٹائی" کی گرہ کھسک نہ جائے۔
صاحب، کاش تم "مینارِ پاکستان" پر یہ شاہکار مضمون بے روح لکھنے کی بجائے اس
غریب سخت کوش مزدور کی کہانی لکھتے جس نے اپنے کئی سو رفیقوں کی معیت میں اینٹ اور
گارے سے اس مینار کو سربلند کیا۔ ملنئے گا گارے اور اینٹ کا مینارِ پاکستان خوبصورت
مینار نہیں اور آپ کا اس کے باب میں ہندی کی چندی نکالنا بالکل عبث اور بے حصول حضرت
آپ کی نظر سے پاکستان کے وہ ہزاروں لاکھوں چلتے پھرتے انسانی مینار کیوں اوجھل ہوتے
جو اس مملکت کے ہر قریہ اور گاؤں میں اپنے عرقِ بدن سے دن کی روٹی کماتے ہیں، صبر و شکر
سے معاش کی چکی میں پستے جاتے ہیں۔ کیسی آوازِ دوست مجھ کو سناتے ہو۔ میں اس کو سننے کا
حوصلہ نہیں رکھتا۔

دوسرا مضمون بھی اس رسالے کا فنِ تاریخ اور فن سوانح اور فن خود پرستی کا اعجاز ہے۔
اللہ اللہ کیسے آپ کو یقین دلاؤں کہ اردو کی نثر میں یہ مضمون گراں بہا و لاجواب ہے۔ گو کہ ہر
دو مضامینِ منثور ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں۔ دوسرے میں کہ کتاب نے اس سے نام پایا
آپ نے چشم بد دور کشتِ زبانِ اردو میں وہ چمن آرائی کی ہے کہ باید و شاید۔ اساطیر اہلِ یونان کی
حیرت افزا ابتوں کے بارے میں کس تحقیق و کاوش سے لکھا ہے کون ہے جو یہ حصہ پڑھ کر حضرت کے
وسیع المطالعہ، معلوماتِ زمانہ کے خزینہ ہونے سے منکر ہوگا۔ بالتخصیص علم اساطیر میں اس ملک میں
ماسوا عبدالعزیز خالد کے اور کسی کو آپ کا ہم پلّہ نہیں گردانتا۔ مگر عبدالعزیز خالد شاعر ہیں اور نثر د

شاعری کے روپ اور آہنگ مختلف ہیں۔ ویسے زبان کے انشا پردازوں میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب بھی علم اساطیر پر عبور رکھنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا میدان مخصوص چین اور ہند کی سلطنتوں کے اساطیر ہوتے۔ یونان کے اساطیر سان کو سروکار نہیں۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ اس مضمون موسومہ "آواز دوست" میں یونانی اساطیر کا نزول کس ضمن میں ہوا۔ کیونکہ فقیر کے گمان کے مطابق بیشتر مضمون آپ کی آٹوگراف کی کتاب کی کارفرمائیوں کا صحیفہ ہے۔ جس طرح افریقہ میں بگ گیم کے شکاری رائفل و بندوق سے ضیغم اِبال دار اور نہنگ دریائی کا شکار کرتے ہیں۔ اس طرح تم اپنی آٹوگراف کی کتاب کے ہتھیار سے عظیم ہستیوں کے جان لیوا ہو۔ آٹوگراف البتہ کسی خوش نصیب کا اس وقت تک نہیں لیتے جب تک تم کو اس کی عظمت کے بارے میں اطمینانِ کامل نہ ہو جائے۔ صاحب۔ اس میدان میں کیا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہو۔ یہ نہیں کہ ہرا یرے غیرے کے سامنے آٹوگراف کی کتاب کھول کر رکھ دی کہ صاحب اس میں دو حرف اپنی منشا کے تحریر کردو۔ پہلے اس ہستی کی عادات و خصلات، علم و اخلاق، عقاید دینی و سیاسی وغیرہ کے بارے میں بالتفصیل کوائف جمع کرتے ہو اور پھر غالباً اس کو مختلف صفات کے بدرجہ فضیلت نمبر دے کر اس کے عظیم یا حقیر ہونے کا فیصلہ کرتے ہو۔ ماشاء اللہ آپ کا کسی کی عظمت کا تعین کرنے کا معیار از بس کڑا ہے۔ غلطی اس میں ہو نہیں سکتی۔ اہلِ ہنود خواہ قابل اور اچھے ہوں اور اکثر اہلِ نصاریٰ، آپ کو آٹوگراف دینے کی حسرت دل میں لئے اس جہان سے گزر گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو آپ نے گھاس نہ ڈالی ہر چند کہ ان کی تمنائے دلی آپ کی آٹوگراف بک میں اپنا نام لکھنے کا اعزاز حاصل کرنے کی تھی۔ بی بی سروجنی نائیڈو کو طوعاً کرہاً آٹوگراف بک اس لئے پیش کی گئی کہ وہ اہلِ اسلام کی طرفداری ہر معاملے میں کرتی تھیں اور حافظِ قرآن تھیں۔ صاحب انگلستان عالی شان کے ٹائن بی مصنف تاریخ دنیائے عالم نے آٹوگراف کی کتاب میں اپنے دستخط کرنے کی سعادت پائی۔ آپ اور ان میں تاریخ دانی قدرِ مشترک تھی۔ ان کے خیالات اہلِ اسلام کے بارے میں تعصب سے بالا تھے۔ خوشا نصیب کہ حضرت قائداعظم محمد علی جناح بانی

پاکستان بھی آپ کے عظمت کے پیمانے پر پورے اترے۔ انہیں بھی آٹو گراف میں اپنا نام لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ اقبال بے چارے رہ گئے، واحسرتا! وہ آپ کی نظروں کو جچے نہیں۔ فقیر منش، درویش صفت، قلندرانہ وضع کے شاعر تھے میورروڈ پر اپنی شکستہ حویلی کی ایک کوٹھری میں پڑے حقہ پیتے رہتے تھے اور اکثر گھر پر میلی بنیان اور چادر پہنے رہتے۔ یوگوسلاویہ کے صدر الصدور مارشل ٹیٹو سرکاری دورے پر پاکستان آئے اور شہر لاہور میں ایک دن قیام کیا۔ آپ تب حسن اتفاق سے لاہور احاطے کے کمشنر صاحب بہادر تھے۔ آپ کے فرائض میں مارشل ٹیٹو صاحب کی مہمان نوازی اور لاہور شہر کے تاریخی مقامات کی سیر کرانا داخل تھا۔ وہ اشتراکی دہریے عقیدے کے، آپ ان سے آٹو گراف بھلا کیوں لینے لگے۔ مارشل ٹیٹو ایک ہی کائیاں آدمی، سرد گرم چشیدہ وہ آپ کی نیت کو بھانپ گئے اور آپ کی آٹو گراف بک دیکھنے کی درخواست نہ کی۔ جب مارشل ٹیٹو بادشاہی مسجد دیکھنے گئے تو انھوں نے اور ان کی بیگم نے خوش دلی سے جوتے اتار کر موزے چڑھائے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ ان کی نگاہ اٹھی تو مسجد کے تجمل و شکوہ کی نظارگی سے ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جب قدرے ہوش میں آئے تو آپ کو ساتھ لے کر موزہ چڑھے پاؤں میں ایک گھنٹہ گھومتے رہے۔ ان کی یہ ادا، اہل اسلام کے شعائر سے دلچسپی آپ کو بھائی۔ وہ عظیم ہستیوں کے زمرے میں آگئے۔ آپ نے آخر اُن کو اپنی آٹو گراف بک پیش کر ہی دی۔ اور وہ مارشل ٹیٹو کے دستخطوں سے اب تک گہربار ہے جن اشخاص کو اس میں شک ہو وہ آپ کی آٹو گراف بک کے ایک ورق پر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اور ہاں صاحب! حسرت موہانی کے سامنے آٹو گراف بک کیوں کر رکھ دی۔ کیوں کر آٹو گراف ان سے لینے پر خود کو آمادہ کیا۔ ان کی ناموری، سیاست ہندوستان میں اہمیت، شعائر اسلام کی پابندی سب تسلیم لیکن مولانا عمر کا بیشتر حصہ کھرے کانگرسی رہے۔ اہل ہنود کے معتبرین سے ان کا یارانہ تھا۔ پھر لباس کی طرف سے بے پروا تھے۔ سوٹ اور ٹائی کبھی نہ پہنا۔ بکس کی بجائے پرانے ٹین کے کنستر میں کپڑے اور سامان رکھ کر اور ہاتھ میں لوٹا لے کر ریل کا سفر کرتے۔ ریل میں تھرڈ کلاس

کے ڈبے کو دوسرے ڈبوں پر فوقیت دیتے۔ وہ عظیم آپ کی نگاہِ ژرف نگاہ میں کس رو سے ہو گئے۔ صاحب! وہ ورق پھاڑ نہیں سکتے؟

جستہ جستہ یہ مضمون دیکھنے سے مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ آج کل آپ نے اپنی آٹو گراف بک ٹھپ کر رکھی ہے۔ اس واسطے کہ چار سوئے عالم میں آپ کو کوئی عظیم آدمی نظر نہیں پڑتا جو آٹو گراف دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔ فقیر کو آپ کے اس فیصلے سے سخت حیرت ہوئی۔ یہ کیسے تم سمجھتے ہو کہ عظیم آدمی سب مر گئے۔ فقیر تا حال جیتا ہے۔ ایک عرصہ سے ملتان میں محلہ شمس آباد میں قیام پذیر ہے۔ حال ہی میں ایک دوست کی عنایت سے قیمتی لارنس پور ٹویڈ اور گرے فلالین کا جوڑا خرید کر ایک درزی کو دیا ہے وہ چند دنوں تک سل جائے گا۔ دیکھو! آٹو گراف بک کو ہوا دو اور جب دل چاہے آکر گراف لے جاؤ۔ میں بالعموم گھر پر ہی موجود ہوتا ہوں۔ کہیں آتا جاتا نہیں لیکن تم کو جلدی کرنا پڑے گی۔ خدا جانے کب بارگاہ ایزدی سے حکم رہائی آئے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔ چار پانچ اور عظیم اشخاص بھی فقیر کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ وہ بھی آٹو گراف دینے میں تامل نہیں کریں گے۔ دو اُن میں سے صرف اپنے انگوٹھوں کے نشان لگائیں گے۔ میں نے ان کو کہلا بھیجا ہے کہ چند دن ملتان سے باہر نہ جائیں۔ خدا جانے تم کب آٹو گراف لینے وارد ہو جاؤ۔

واہ! واہ! ہمارے حضرت مختار مسعود صاحب دام اقبالہٗ نے عظمتِ انسان کو پرکھنے کی خاطر کیسی کسوٹی بنائی! اول آدمی کا مشہور ہونا، اس کا اہل اسلام ہونا یا اہل اسلام سے مہر و محبت رکھنا، سوم خوش پوش ہونا اور پوشاک میں اعلیٰ ذوق رکھنا، چہارم جامعہ علی گڑھ کا سند یافتہ ہونا، پنجم... مگر کہاں تک شمار کرتا جاؤں علامہ محمد اقبال لاہوری رحمۃ اللہ علیہ میں دو اوصاف تو کچھ کچھ موجود تھے۔ بقیہ دو کے باب میں وہ کورے تھے آپ کی نگاہ میں وہ چڑھتے کیوں کر۔ حکیم الامت کہلائے مگر خالی خولی باتیں بنانے والے، شعر گھڑنے والے، عمل سے کوسوں دور۔ ہر چند کہ وہ مردوں کو شاہین ہی متصور کر کر پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے پر اکساتے

رہے مگر خود لاہور کی میو روڈ کی کوٹھی میں اپنی چارپائی سے نہ سرکے۔ دراصل یہ بات بھی ہے کہ مردمان باعمل و باجبروت تم کو پسند ہیں شعرا و ادبا کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس واسطے کہ عمل سے گریزاں رہتے ہیں۔ آپ کو اپنا عظمت کا معیار مبارک! ایک رند مشرب سعادت حسن منٹو کا معیار عظمتِ انسانی کے بارے میں جداگانہ تھا۔ اس مرحوم نے ایک بار نشۂ شراب میں فقیر سے کہا "یار بابو گوپی چند بہت بڑا آدمی تھا ــــــ" جو باتیں اس نے مجھ کو اپنے یار گوپی چند کی سنائیں۔ تم ان کو سنو تو غضب سے لرزنے لگو۔ اس سعادت حسن منٹو کے نزدیک بمبئی کی ایک ادھیڑ عمر کی طوائف موذیل بھی عظیم عورت تھی۔ سنو صاحب! آپ کس لئے منہ بناتے ہو۔ وہ شخص بھی تو اسی ڈھنگ و قماش کا تھا۔ تماشا گاہِ عالم میں بے راہ روی سے سیر کرنے والا۔ اوباشوں، اچکوں میں مہر و وفا ڈھونڈنے والا۔ آٹو گراف بک اس نے ساری عمر جیب میں نہ رکھی اور نہ کسی کو پیش کی۔ وہ ملاقاتی کی ظاہری اور باطنی آٹو گراف اپنی لوحِ ذہن پر محفوظ کر لیتا تھا اور ایک عالم کو انہیں بے باکی سے دکھلاتا تھا۔ الغرض حضرت! یہ آوارہ مزاج، عیاش طبع شخص ہنسنے سے اکھڑا تھا۔ توبہ! توبہ!! توبہ!!! بابو گوپی چند ذات کا کھتری یا کسبی موذیل آتش پرست پارسن! یہ عظمت انسانی کا تاج ان زندیقوں کے سر پر دھرتا ہے!

بہرحال کتاب تم نے دھوم دھام کی لکھی ہے۔ گلشنِ فصاحت کی باغبانی اس طور کی آگے کسی نے کی نہیں۔ بلند پردازی و نازک خیالی اس روپ کی مولانا ابوالکلام کو کہاں میسر۔ حساس طبع لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس نگارش میں سراسر تصنع و آورد ہے اور خیالات اس کے کم نظری اور خود بینی کے مظہر ہیں تو وہ بکتے ہیں یقین مانیے گا۔ فقیر تمہارے اس رسالے کو تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر پڑھتا ہے۔ وائے حسرت! اگرچہ رہ گزارِ ہستی کی تمام منزلیں طے کر چکا۔ آج تک کسی کو فقیر سے آٹو گراف لینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ماسوا ایک موقع پر شیخی بگھارنے کی خاطر نہیں کہتا۔ میں ایک بار جہاز میں سوار ہو کر انگلستان عالیشان میں گیا۔ وہاں چند طالب علم، ممالکِ شرق و غرب و حبش سے آئے ہوئے۔ ویلز کے صوبے

بس بغرض سیر گئے۔ میں اس جماعت میں شامل تھا۔ ہمارے ٹور کے منصرم ہمیں ایک کوئلہ کی کان میں کام کرنے والوں کے گاؤں میں لے گئے۔ بچوں کی ایک فوج ہمیں عجوبے گمان کرکر ہمارے جلو میں ہوئی۔ انہوں نے غالباً گمان کیا کہ ہم اہلِ حبش کے مطرب و نوا سنج ہیں جو وہاں کے اسکول میں بینڈ باجہ بجاکر بچوں کے دل شاد کریں گے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چلبلی ناک والا لڑکا میری صورت سے متاثر ہو کر میرے پاس آیا اور کہا "معاف کیجئے۔ کیا آپ مجھ کو آٹوگراف دیں گے"؟ اس نے اپنی آٹوگراف بک میرے سامنے کر دی۔ میں نے مسرت سے فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیا۔ حضرت، یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے آٹوگراف کی درخواست کی۔ میں چاہتا تھا اس چھوٹے لڑکے کو سینے سے لگا لوں، کندھوں پر بٹھاؤں۔ جب میں آٹوگراف بک میں دستخط رقم کر رہا تھا، وہ بھنبھنا بولا "پلیز۔ کیا آپ اس بینڈ کے ماسٹر ہیں؟" باور کیجئے یہ سن کر ساری سرخوشی پر اوس پڑ گئی۔ جذباتِ دلی سخت مجروح ہوئے خیر یہ تو دل لگی ہے۔ تم بتاؤ، آٹوگراف دینے میں وہاں خود پہنچوں یا تم یہاں آؤ گے؟ اس شہر کے ریسٹ ہاؤس میں قیام وطعام کا اچھا انتظام ہے۔

جواب آنے پر اگلا خط لکھوں گا۔

زیادہ حدِ ادب

طالبِ کرم

خضر قطب

ایک چھوٹے لڑکے یعقوب کے نام ——

میرے چھوٹے معصوم فرشتے! آپ کیسے ہیں؟ اچھے تو ہیں ہمارے یعقوب میاں؟

جس دن میں کراچی سے چلا، میری نگاہوں نے آپ کو ڈھونڈا۔ میرے دل نے چاہا آپ سیڑھیوں پر سے میرے ہمراہ نیچے موٹر تک آئیں۔ میں آپ کو گلے لگاؤں۔ کلمہ دلاسے اور حوصلے کا کہوں اور آپ کے کدو سر پر دستِ شفقت پھیروں اور یہ بھی کہ اپنی بیوی اور دوسرے گھر والوں سے آنکھ بچا کر کچھ پیسے خرچے کے آپ کی قمیص کی جیب میں ڈال دوں۔ آپ مجھ کو کہیں نظر نہ آئے۔ شاید کوئی سودا لینے گئے تھے۔ شاید میرے جانے پر کسی کونے کھدرے میں چھپ کر رو رہے تھے۔ بھولے بھٹکے لڑکے! باور کرو۔ گھر سے اسٹیشن تک سارے راستے تمہارے متعلق سوچا کہ جاتے وقت تمہاری صورت نہ دیکھی اور یہ کہ اب کون پُرشفقت مسکراہٹ سے تمہارا ننھا دل بڑا کرے گا۔ کون تم کو چوری چھپے اپنی بغل سے لگا کر اپنے ساتھ بھینچے گا۔

ابھی جب میں یہ سطور لکھتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے قلم ہاتھ سے دھرا اور دروازے تک گیا۔ آپ کا والد تھا۔ ننگا پنڈا، چادر باندھے، محنت مزدوری کے پسینے سے چمکتا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور تمہارا پوچھا کہ تم کب آؤ گے۔

"صاحب ہم کو اپنے پتر کی بڑی مونجھ ہے۔ یعقوبے کی ماں تو روتی رہتی ہے"۔

" وہ بالکل خوش۔ ٹھیک ٹھاک تھا۔ پانچ دس روز تک بی بی اور بچے لوٹ آئیں گے فکر نہ کرو۔"

"صاحب ہماری تانگ نہیں جاتی۔ کل آپ کراچی ٹیلیفون کریں۔ یعقوب نے کہا تھا میں ٹیلیفون پر خود بولوں گا۔ ہماری تسلی ہو جائے گی۔ میں کل اس وقت مزدوری سے فارغ ہو کر یعقوبے کی خیریت پوچھ جاؤں گا۔"

" میں فون کروں گا۔ وہ میرا بھی پتر ہے۔"

میرا شکریہ تمہارے والد نے ادا کیا اور چلا گیا۔ لڑکے میں نے تمہارے والد سے وعدہ تو کیا تم سے ٹیلیفون پر بات کرنے کا۔ لیکن اب اس طور پر سوچتا ہوں کہ ٹیلیفون کروں گا تو کس منہ سے

اور کہاں۔ اور وہ لوگ تم کو ٹیلیفون پر بلائیں گے کیونکہ۔

آپ میرے بچوں کی خدمت کرنے والے ان کو کھلانے والے نوکر ہیں۔ نوکر بچے آقا بچوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس ملک میں کوئی نہیں سمجھتا کہ سب بچے خواہ وہ مالک کے اپنے ہوں یا ان کی خدمت پر مامور، ان کے جذبات واحساسات، ایک سے ہوتے ہیں، وہی شفقت کی طلب، وہی کھلونوں کا لالچ، وہی کھیل کود کا شوق۔ ہائے یہ کوئی احساس نہیں کرتا۔ سب بچوں کے دل آبگینوں کی طرح نازک ہوتے ہیں اور سب ہوتے ہیں اپنی ماؤں کے لال۔ ان کے راج دلارے شہزادے، غریب امیر کا اس میں امتیاز نہیں اور لڑکے کا کسی امیر کے محل میں تولد پانا یا غریب کے گھر پیدا ہونا محض حسنِ اتفاق زمانہ ہے۔ یہ بات تمہارے چاچا خضر کے نزدیک بعید از رحم وانصاف ہے کہ ایک کو تو بوجہ اپنے اتفاق ولادت کے دنیا جہاں کے چاؤ چونچلے، عیش وآرام میسر ہوں اور دوسرے کو بجز دھتکارے جانے اور محرومی کے کچھ نہ ملے۔

جس صبح میں نے ملتان جانے کا قصد باندھا۔ اس سے گزشتہ رات میں قدرے دیر سے لوٹا یعنی کوئی دوپہر دن ڈھلے بعد پاس ہی سوسائٹی کے محلے میں اپنے ایک دو جگری دوستوں سے غپ شپ کرتے شطرنج کے مہرے پیٹنے پٹانے دیر ہوگئی اور میں سمجھتا ہوں اتنی دیر بھی نہیں۔ وہ مجھ کو فلیٹ کے دروازے کے پاس موٹر کار میں چھوڑ گئے میں ڈرتا سہما دبے پاؤں اوپر چڑھا اور اندر آیا۔ تم راستے کی چھوٹی غلام گردش میں گھٹڑی بنے سوتے تھے۔ خوابیں دیکھتے تھے جس کمرے میں میری بی بی اور بچے سوتے ہیں اس میں بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ میں مجرموں کی طرح اندر داخل ہوا۔ شب خوابی کے کپڑے پہنے اور سونے سے پہلے چاہا کہ چند ہیلنے والی بتی کو گل کردوں۔ میں تیز روشنی میں سو نہیں سکتا۔ تمہاری مالکن میری بی بی جاگتی تھیں۔ آتش غضب میں جلتی تھیں۔ جھٹ بولیں "قمقمے جلتے رہیں گے۔ نونو اور ہارون کو اندھیرے میں ڈر لگتا ہے۔" میں نے جواب دینا مناسب خیال نہ کیا اور چپکے سے تکیہ اٹھا کر کمرے سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے میں میری ساس اور سالے سوتے تھے۔ کہاں سوؤں، نہ سوؤں

تو کہاں بیٹھ کر اونگھوں۔ اس تخت پوش پر، جس پر میرے شہزادے، تم پڑے سوتے تھے۔ تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اتنی البتہ نہیں کہ تکیے کی گنجائش نکل آئے۔ مجھ پر نیند کا غلبہ تھا۔ تکیہ رکھا ایک کونے کی کرسی پر اور تمہارے ساتھ ہی کہنی پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ تمہارے جسم کی گرمی بھی وہی تھی جیسی میری جگر گوشہ سائرہ بی بی کی حدت تھی۔ دبر لیٹا سمٹ سمٹا کر لیکن جگہ تھوڑی تھی۔ نیند نہ آئی۔ میں اونگھتا رہا مگر اپنی بے سکونی میں خوش تھا کہ مالک اور نوکر بچہ ایک بستر میں سوتے ہیں۔ تم کو پتہ نہ چلا۔ پتہ کیونکر چلتا۔ پچھلی رات میں اٹھا اور باورچی خانے میں رکھی بنگالی خانساماں لڑکے زین العابدین کی چارپائی پر جا سویا۔ وہ نیچے ایرانی کے ہوٹل کے برآمدے میں سوتا ہے اور مجھ کو یہ پہلے معلوم نہ تھا۔

میں وہاں تھا تو حتی الامکان خیال کرتا تھا کہ تمہارا ننھا سا دل نہ دکھے۔ ایک بار تم کو ڈانٹ ملی یا تمہارا دل ماں کی یاد میں اُٹھا۔ تم ایک دیوار کے کونے میں لگ کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگے۔ میرا کلیجہ ہلا اور مجھ کو اس طور لگا کہ جیسے میرے اقلیم قلب کی مہارانی سائرہ بی بی روتی ہیں۔ میں بھاگا گیا اور تم کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ الفت اور تسکین کی باتیں کیں۔ میری نیک بخت بی بی اور تمہاری مالکن جن کے جگر گوشوں کو کھلانے پر تم مامور رہو۔ ان کو میرا آپ کو یوں پیار کرنا برا لگا۔ وہ جھٹ بھاگی آئیں اور تم کو بازو سے پکڑ کر لے گئیں۔ کلمات تندو تیز کہے اوے اب یہاں روتا کس لئے ہے۔ تیری ماں نے تو خود منت کر کے تجھ کو ہمارے ساتھ بھیجا۔ موٹر میں بیٹھ کر کراچی کی سیر کرتا ہے۔"

میں غصے میں تلملاتا تھا، پر اپنے کو بے بس پاتا تھا۔ میں نے گمان کیا کہ موٹر میں سیر کی خوب کہی۔ سب سے پیچھے موٹر میں گھسنے اور پاندان پہ بیٹھنے کا حکم۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے پر ڈانٹ ڈپٹ کہ بچوں کا خیال رکھنے کو وہ لے کر آئی ہیں باہر کیا دیکھتے ہو۔ تم کتنے سہمے ہوئے چپ چاپ بیٹھتے تھے اس موٹر گاڑی میں جب ہم گئے کلفٹن اور میرے بچے بار بار چڑھے جھولے میں اور پھر ڈوجن پارک میں بجلی کی موٹر گاڑیوں میں۔ تو تم ان کو حسرت ناک نگاہوں سے تکتے تھے۔

مجھ کو ہمت نہ ہوئی تم کو ٹکٹ لے کر دینے کی۔ ہاں بھائی۔ تمہارا چاچا خضر ہے خوب شرارتی۔
تمہاری جیب میں پیچھے سے آٹھ آنے ڈال دیئے اور میرے شہزادے نے ان پیسوں سے ٹکٹ
لے کر اپنے مالک کے بچوں کے ساتھ جھولے کی سیر کی۔ پر شہزادے یعقوب کی ڈوحین پارک میں
خوب سبکی ہوئی۔ بجلی کی موٹر گاڑی کا ٹکٹ ڈیڑھ روپیہ ہے اس میں چاہے ایک شخص بیٹھے
چاہے دو بیٹھیں، دام وہی ہیں۔ جب میرا بڑا بیٹا منصور اکیلا موٹر گاڑی میں بیٹھا تو ہمارے
میاں یعقوب خاں بہادر سے رہا نہ گیا۔ دل چاہا ہوگا ہم بھی موٹر میں سوار ہو کر اُڑتے میں ٹکر لگائیں
ٹکر کھائیں۔ صاحبزادے بھول گئے کہ ملازم بچوں کو اپنی حیثیت جاننی چاہیئے وہ جاکر منصور کے
ساتھ مزے سے ہو بیٹھے۔ ہماری بی بی بھلا یہ برداشت کرتیں کیونکہ وہ فوراً باڑ پھاند کر
چوبی فرش مدورہ میں جا وارد ہوئیں اور رنگ کا سارا فاصلہ طے کر کے آپ کو بازو سے پکڑ
کر لے آئیں۔ تمہارے بھولے چہرے پر سے سب بشاشت غائب ہوئی۔ واہ کیسی سیر کی ہمارے
یعقوب میاں نے! جب ہم اپنے بچوں کے لئے پلے لینڈ کے قصر کے سامنے بیٹھے دکانداروں سے
سیپ کے کھلونے خرید تے تھے۔ تم کس حسرت سے ان کھلونوں کو تکتے تھے۔ چاچا خضر غریب پوک
لے ہمتے۔ وہ بھلا جرأت تم کو کھلونا لے کر دینے کی کرتے تو کیونکر! قصے کیا کیا نہ بنالے جاتے۔
وہ ڈر گئے اس واسطے کہ کھلونا ان کا تم کو لے دینا قیامتِ عظیم بپا کر دے گا۔ ہائے ہائے
بیٹے اس چمنستان پاکستان میں کہ تم اس کے ایک گلِ نو دمیدہ ہو، یا دِ زہرناک کے جھونکے
ہر سمت چلتے ہیں تم کھلنے نہیں پاؤ گے کہ مرجھا جاؤ گے۔ یہاں کے مسلمین پاکبانہ کے دل سنگ
ہیں اور مہر و محبت سے کورے۔ البتہ اخوت اسلامی کا جس قدر ورد اس خطے میں شب و روز ہوتا
ہے۔ اتنا اس کرہ عالم میں کسی جگہ نہیں ہوتا۔ کیا امراء صاحبِ جائداد اشخاص، کیا مرد کیا عورت
جوہرِ انسانیت ان میں نہیں۔ بالتخصیص طبقہ اناث اس ریاست کا مال و دولت اور موٹر کار کی
طلب و ہوس کو مدعائے حیات جانے ہے کوئی صاحب فرماتے ہیں:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

افسوس انسان نے اس سے واسطہ نہ رکھا شقی القلب بھیڑیا بنا بڑا رونا یہی ہے یعقوب میاں!

جب میں وہاں تھا تو ہمارے درمیان انسیت و ہمرازی کی مسکراہٹ جس کو سب بھانپ نہیں سکتے تھے۔ آپ کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ سوکھی ہوئی، پژمردہ کشت روح کی آبیاری کرتی تھی۔ میرے آئے پیچھے تم پر کیونکر گزرتی ہوگی؟ ٹیلی ویژن دیکھتے وقت خوش بخت بچوں سے الگ بہانہ ان کے پاس بٹھلاتے ہوں گے۔ بچہ کوئی کسی وجہ سے رونا ہوگا تو اس کے ذمہ دار تم ٹھہرتے ہو گے کہ خیال تم نے نہ رکھا۔ دیکھو لڑکے! تم ہو ملازم۔ میری بی بی نے تم کو اس لئے رکھا ہے کہ تم ان کے بچوں کا خیال رکھو۔ ان کو گرنے نہ دو۔ ان کو کھلاؤ۔ اس خاطر نہیں کہ تم ان کے ساتھ کھیلو۔ تمہارے ماں باپ غریب ہیں نا۔

جلتے جاتے ایک کہانی سن لو کہ میرے ایک دوستِ دلی امریکہ نژاد سادھو ہنری ڈیوڈ تھوریو صاحب نے اس کو اپنے ایک رسالہ مسمیٰ بہ والڈن میں درج کیا ہے فرماتے ہیں۔

"میں بادشاہ کی ملاقات کو گیا۔ لیکن اس کے وسیع ایوان میں دوسرے سائلوں کے درمیان پہروں بیٹھا کیا اس انتظار میں کہ کب باریابی ہوتی ہے۔ بادشاہ کا فعل و عمل مثل اس شخص کے تھا جو خوئے تواضع و مہمان نوازی سے ناآشنائے محض ہو۔ میرے پڑوس ہی میں ایک آدمی ایک درخت کی کھوہ میں گھر بنا کر رہتا تھا۔ اس کا اخلاق صحیح معنی میں شاہانہ تھا۔ میں نے سوچا بادشاہ کی بجائے مجھ کو اس آدمی کو ملنا چاہیئے تھا۔ وہ آدمی گھر پر موجود نہ تھا گزشتہ یک شنبے اپنے وطن چلا گیا تھا۔"

آؤ شہزادے یعقوب میاں! تم اور ہم اور تمہارا عرق محنت سے تاباں باپ باہم یکجا ہو کر برلبِ دریا ایک جھونپڑے میں رہیں اور اپنے جیسے غریب سادہ لوح آدمیوں کے درمیان جن کی خو خسروانہ ہے اور ادا ہم گسترانہ ہے۔ یہ اشخاص جو اینٹ اور پتھر کی عالی شان حویلیوں میں رہتے ہیں ان کے دل بھی اینٹ اور پتھر ہیں۔

ان پر ایسا فالج گرا کہ حسِ دردمند نوازی ناکارہ ہوئی۔ یہ نام کے بادشاہ بخیل اور بے رحم پرلے درجے کے ہیں۔ چلو میرے لال اپنے قبیلے کے لوگوں میں چل کر رہیں یہاں ہم کو کوئی جانتا نہیں پہچانتا نہیں'' بیت:

آؤ نکل چلیں، آؤ بھاگ چلیں　　یہاں سانس ہمارا گھٹتا ہے

تمہارا چچا

خضر

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے حق نواز کے نام ——

برخوردار میرے یار حق نواز۔ یہ آپ کے دل میں بیٹھے بیٹھے کیا آئی جو جیل خانے میں جا رہائش اختیار کی۔

گزشتہ دوشنبہ پیر کے روز میں اپنی چچی کے گھر گیا۔ وہی بڑا آہنی پھاٹک، وہی اشرف الوکلاء میرے عم مرحوم کی حویلی کہ ہمارے پردادا علامۃ الدہر حضرت مولوی محمد عالم کے اسم بابرکت سے مسمّٰی ہے۔ وہی عم زادوں اور بھانجیوں کی پر اشتیاق خاطر تواضع۔ چچی نے بلائیں لیں اور حسب معمول دیوان خانے میں بٹھلایا۔ میری آنکھیں اپنے یار کو ڈھونڈتی تھیں۔ ہر دم متوقع تھا تمہارے نمودار ہونے، میرے قدم لینے اور بالمشافہ دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا اس واسطے کہ آگے جب بھی وہاں گیا تم کسی نہ کسی طرح میری آمد کی ٹوہ پا لیتے اور بلاناغہ مذکورہ رسم مشایعت عمل میں لاتے۔ اب کہ تم نظر نہ آئے، سچ بات کہتا ہوں کہ چچی کی حویلی میں میں جاتا ہی تمہاری ملاقات کی خاطر تھا۔ دیر تک تمہاری راہ دیکھا کیا۔ جب تم برآمد نہ ہوئے تو چچی سے پوچھا کہ آج حقو کدھر کو چلا گیا۔ اُن سے معلوم ہوا کہ تم نے گھر میں سے گھڑی کی چوری کی، جس پر کوتوال کی طرف سے حکم جس ہوا اور تم جیل خانے پہنچے۔ نہیں بھائی حقو۔ مجھ کو برا نہ ٹھہراؤ۔ حاشا و کلا میں نے اس الزام تراشی

کو سچ نہ جانا۔ کیونکہ جن دنوں میں لاہور سے تبدیل ہو کر پہلے پہل جچی کی حویلی میں تین ماہ کے عرصہ تک رہا۔ میری چیز بس روپیہ پیسہ کوٹھری میں اوپر تلے پڑا رہتا تھا اور تم میری غیر موجودگی میں اس کوٹھری کی صفائی کرتے تھے، میری اس مدت میں کوئی شے نہ گئی، بلکہ تم میرے گرے پڑے درہم و دام سنبھال لیتے اور میرے آنے پر میری امانت میرے حوالے کرتے۔ تم سا سیر چشم لڑکا میں نے دیکھا نہیں تم بیدوں اور حریصوں کے جرگے سے جدا ہو حقیقت اصل مجھ پر اب تک مجہول ہے۔ غالباً سال ڈیڑھ سال سے تم جچی کے ملازم رہے اور اس میں ان کی کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ دھری گئی۔ تم پر معلوم تھا کہ اٹھانا گھڑی کا بے حصول اجازتِ صاحب احتمال ضرر بالعموم رکھتا ہے اور ایسی چوری بزبانِ اہلِ پنجاب پچ نہیں سکتی۔ تمہارا اس چوری میں ماخوذ ہونے کو میرا دل ماننے تو کیوں کر! بالفرض محال میں نے تسلیم کیا۔ تم نے کسی مجبوری کے تحت گھڑی اٹھائی۔ یہ کونسی ایسی بات تھی جو گھر والوں نے قیامت برپا کر دی۔ تم کو سپاہیوں کی تحویل میں دیا۔ یہاں اس قلمروئے پاکستان میں عوام و خواص دن دہاڑے ریل کے انجن، افواج کے دمدمے، برقی رو کی ترسیل کے تار چرا لے جاتے ہیں۔ کھلم کھلا، بے باکانہ اہلِ وطن کے ناموس، مال و متاع پر ڈاکے ڈالتے ہیں کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ ان کی شرافت ذاتی پر حرف نہیں آتا۔ حوالات۔ بس چلتے ان اکابر کو کبھی سُنا نہیں۔ صاحبزادے! غلے کی گرانی، حیاتِ آدم کی ارزانی۔ بلائے جانی، سعی ضائع، یہ نہ سمجھو، سبب ان آفات کا آسمانی ہے۔ اصلاً انہی بزرگانِ حرص و آز کے طفیل ملکِ مسلمین میں فتنہ و فساد کا دروازہ باز ہے۔ خیال باندھتا ہوں اس طور کا کہ مفسد و بدمعاش یہاں افتخار و اعزاز کے متولی ہوئے۔ سنو یار حقو! یہ خضر میاں بھی کیا خرافات بکنے لگے۔ تم سے جو قصہ ہوا۔ اس سے بھلا ان باتوں کا کیا علاقہ!

اس خبر سے دل تمہارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ میرا دل جانتا ہے کہ تمہارے دیکھنے کا میں کس قدر آرزومند ہوں۔ دعا کرتا ہوں، حکم رہائی تمہارا جلد از جلد ہو، خدا کوتوال کے قلب میں رحم و انصاف ڈالے۔ تمہاری صورت ہر دم نگاہِ تخیل کے سامنے پھرتی ہے۔ او خانزادے آزاد قلم کے دلدادہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے رہنے والے اپنی ماں کے اکلوتے لاڈلے بیٹے۔ تمہارا یار

محمد خالد خاں خضر تمہارا کتنا ممنون و شاکر ہے۔ ان ایام میں جب بیج جی کا مہمان تھا اور آلام بدنی و ذہنی سے میرا سراپا چھدا تھا۔ تم ایک جگری دوست کی طرح میرے ارد گرد منڈلاتے۔ میری کوٹھری میں آنے کا بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے۔ میرا جی بہلاتے۔ میرا جی بہل جاتا۔ بجھے ہوئے دل ٹوٹے ہوئے دل، مرے ہوئے دل میں تمہاری مہر و محبت کی بھولی باتوں سے رونق آجاتی۔ تمہاری ٹیڑے کی زبان سے نکلے ہر کلمے سے الفت ٹپکتی تھی۔ تم میری غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتے۔ پہروں انبساط و اختلاط کی باتیں ہوتیں۔ مدعا یہ کہ تعلق خاطر جو تم کو میری ذات سے تھا۔ میرے بحیثیت تمہارے ہم نفس و دمساز ہونے کے طفیل تھا۔ نہ بوجہ تمہارے صاحب و مخدوم ہونے کے۔ تم میری روٹی لاکر، مجھ کو کھانا کھلا کر کتنے خوش ہوتے۔ تمہاری باتوں کا مزہ جب یاد آتا ہے۔ تو دل اُلٹنے لگتا ہے۔ "سائیاں! میرا دل فلم بنتے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے"۔ "سائیاں اور کوئی خدمت ہو تو بتاؤ"۔ اِدھر کی بات، اُدھر کی بات! واہ کیا لطف اٹھاتا تھا۔

میں فلم دیکھتا نہیں۔ فلم دیکھنے کے لئے اُمنگ چاہیئے۔ دل چاہیئے۔ وہ سامان اب کہاں میسر ولولہ آغاز شباب کہاں۔ چارپائی پر لیٹا داستان گوئے سکاٹ لینڈ نواب سر والٹر سکاٹ بہادر کے "دیورلے" قصوں کی سیر کرتا رہتا کہ بیس سے کچھ اوپر مجلدات کے بڑے عم زادہ محب حمیدالدین کے کتب خانے میں موجود تھے اور یہ قصے میں نے پڑھے نہ تھے۔ ہر چند کہ اس سحر بیان کا کلام گرانبہا ہے لیکن خشک بے رس ضرور ہے۔ عبارت انگریزی مغرق ہے۔ تم حیرت سے میرے استغراق مطالعہ کو دیکھتے "سائیاں! اتنا نہ پڑھا کرو"۔ میں نے تمہاری بات مانی۔ اس واسطے کہ میرے یار حق نواز نے سچ کہا۔ ادب خواہ تابدار کتنا ہو، بدل تب و تابِ زندگی کا ہو نہیں سکتا۔ کیا سمجھے میاں حق نواز سلمہ تعالیٰ! حاصل کلام یہ کہ تم مجھ سے کہیں خوش نصیب ہو۔ مکتب کا منہ تم نے دیکھا نہیں۔ کتابوں کے کیڑے چاٹنے سے بچ گئے۔ تم نے مجھ کو فلم دیکھنے کی لت خوب ڈالی اور میں تمہاری دلجوئی کی خاطر تمہارے ساتھ ہو لیتا۔ میاں تم کو یاد ہوگا۔ تم مجھ کو جب پہلی دفعہ ایک پنجابی فلم دکھانے چلے ٹکٹ کے دام، وہ بھی بالا خانے کے تم نے اپنی گرہ سے

دیئے۔ حویلی سے تم مجھے دو پہیہ رکشا میں بٹھا کر لے گئے۔ حالانکہ خانہ فلم صرف آدھ فرسنگ کے فاصلے پر تھا وہاں مجھ کو ایک دوکان پر شربت کوکا کولا بالاصرار پلایا۔ میں نے بڑھیا سگرٹ مسمّی گولڈ لیف کا ڈبہ خریدا۔ جب دام دینے لگا۔ تم نے میرا ہاتھ روکا اس واسطے کہ تم نے میرے دام دینے کو وضع آئین مہمانداری کے خلاف متصور کیا۔ اس دن تم کو تنخواہ ملی تھی۔ پچیس روپے! تم امیر تھے۔ تم نے پہلے روز ہی نصف سے زائد تنخواہ مجھ پر خرچ کر ڈالی کیسی شادمانی اور خوشی تمہارے چہرے پر چمکتی تھی۔ بھڑکدار، رنگین قمیص اور تہبند میں میرے یار کی سج دھج ایسی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو اشارے کر کر مسکراتے تھے۔ ہمارا غریب حقو اس موقع پر اپنے میلے کپڑے اتار برات کا دولہا بن کر آیا تھا۔ وردی وزارت اس لباسِ فاخرہ کے مقابلے میں ٹاٹ ہوئی۔

میاں لڑکے اور سنو! ایک بار تم نے چچی سے ہفتہ بھر کی چھٹی لی اور اپنی والدہ کو ملنے اپنے وطن کے عازم ہوئے۔ تم نے سامان سفر کیا۔ وہ بھڑکدار رنگین لباس پہنا، ایک بقچہ جس میں تمہارے کپڑے تھے کندھے پر ڈال حویلی سے نکلے۔ میں نے کچھ روپے تم کو زادِ راہ کے دیئے۔ تمہاری مراجعت کا منظر دیدنی تھا نہ شنیدنی۔ ہم سب یہ سمجھے تم بسیل ریل ڈیرہ اسمٰعیل خاں اپنی والدہ کے پاس پہنچے۔ ایک ہفتہ کے بعد ایک کارڈ تمہارا موصول ہوا اس میں خبر تمہارے کسی آدمی کا خون بہانے اور اس جرم میں ماخوذ ہونے کی درج تھی۔ ہم سب تمہارے بارے میں مشوش ہوئے۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ صاحبزادے نے ارتکابِ قتل کیا تو آخر کیوں اور کس غایت سے کسی نے کارڈ پر ڈاک کی مہر نہ دیکھی۔ اس خط کے آنے کے چار روز بعد تم بقچے سمیت صحیح سلامت لوٹ آئے۔ تمہارے کارڈ کا عقدہ پھر رفتہ رفتہ کھلا معلوم ہوا کہ تمہارا ڈیرہ اسمٰعیل خاں جانا ڈھکوسلا تھا۔ ہماری آنکھوں میں دھول ڈالی۔ ملتان ہی میں کسی یار کے ہاں پڑے رہے۔ شاہ شمس تبریز کے عرس کے موقع پر جو میلہ لگتا ہے اس کی جی بھر کر سیر کی۔ شہر کے سارے فلم ملاحظہ کیجئے۔ وہ پوسٹ کارڈ بھی کسی سے لکھوا کر ملتان ہی سے ڈاک میں ڈالا کیوں میاں یوں قتل کرلے کی خبر آخر کس مقصد

سے تم نے اڑائی خضر کہتا ہے کہ تم ملازمت کی کڑیاں توڑ کر حویلی سے بھاگے۔ چند روز آزادی اور من مانی کی موج لی۔ پوسٹ کارڈ مرقومہ مضمون کا اس خاطر بھیجا کہ حویلی والے آپ کو رو دھو بیٹھیں۔ لوٹ آنے کے امیدوار نہ ہوں۔ یہی بات تھی نا حضرت یا کچھ اور۔ وہ جو مثل مشہور ہے۔ "گھر کے بدھو گھر کو آئے" تم پر صادق آئی۔ میاں جی! یہ دنیائے آب و گل بھی مثل زنداں کے ہے۔ طوق گلے میں ہتھکڑیاں کلائیوں میں۔ بیڑیاں پاؤں میں۔ پاؤں تلے دلدل ایسی دہشت ناک کہ جتنے ہاتھ پاؤں اس سے نکلنے کے واسطے مارو اسی نسبت سے دھنستے جاؤ۔ مجھ سے پوچھو تو شرارت تمہاری دلفریب تھی۔ ایسی کہ جس کے کرنے والے پر پیار آئے۔

پھر آپ سچ مچ وطن گئے باضابطہ طریق پر اور ہماری چچی صاحبہ سے دعائیں لے کر۔ لوٹنے پر آپ کا مع الخیر ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچنا اور والدہ اور بزرگوں کی قدم بوسی اور دوستوں، ہم شیروں کے ہم آغوش ہونا، سنا۔ سلامت رہو خوش رہو۔ تمہارے منہ سے یہ داستان ملاقات و فراق کس لطف سے ادا ہوئی۔ زبانِ اردو میں تمہارے کلام دلچسپ کے آہنگ، اور رنگ کو ڈھال دینا، ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے، رودِ چناب کی منجدھار کو مشکیزے کے بغیر پار کرنا ہے۔ ہاں صاحب تم ریل میں پہنچے دریا خاں۔ وہاں سے شکرم میں بیٹھے اور راہ میں کتنی بار اُترے اور کتنی بار پھر دوسری شکرموں میں سوار ہوئے بیشتر مسافت ہاتھ میں جوتیاں پکڑ کر۔ شلوار کا لنگوٹ کس کر طے کی۔ خلاصہ یہ کہ سنگ وحشت و خاک پائمال کرتے غروب آفتاب سے پنج ساعت بعد ڈیرے میں وارد ہوئے۔ والدہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ غریب پہلے ٹھاکے سے ڈر گئی۔ پھر کچھ توقف کے بعد شمع لئے آنکھیں ملتی دروازے پر آئی۔ اپنے لال کو پہچانتے ہی اس سے لپٹ گئی، بلائیں لیں۔ آنسو بہائے۔ خوب آزادی و بے فکری کے لمحات تم کو اپنی والدہ کے گھر میسر آئے۔ ہم شیر کے ساتھ فلم رنگا رنگ کے دیکھے اتنی خاطر بھلا کب کسی ماں نے اپنے دُور دراز سے آئے بیٹے کی کی ہوگی۔ جب تم نے لوٹنے کا قصد کیا تو وہ مع تمہارے ہم شیر کے اپنے لختِ جگر کو دریا خاں کی سڑک تک چھوڑنے آئی۔ تمہاری والدہ نے لڈو اور تودہ ہائے حلوہ

سوہن ایک گھڑی میں باندھ کر ساتھ کر دیے۔ تم نے آدھے لڈو تو رستے میں کھلائے یار رفیقوں کو بانٹے۔ بقیہ نعمتوں کو بچایا۔ حویلی میں داخل ہو کر پہلے میرے حجرے میں آئے۔ ایک دلکشا پاسِ محبت سے بھرپور مسکراہٹ سے میرے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور پر تپاک مصافحہ کر کر حلوہ سوہن کلہم میری نذر کیا۔ وطن کی سوغات تم لے کر آئے صرف اپنے یار کے لئے۔ کسی اور کو تو تم نے وہ دیا نہیں اور مجھ کو حلوہ سوہن کا ذکر نہ کرنے کا پابند کیا۔ ایک تو وہ تم نے مجھ کو اپنے سامنے زبردستی کھلایا کھاتا میں، خوش تم ہوتے جاتے۔

یارِ من حق نواز خاں! بادشاہ سے بلند نظر! حاتم سے بڑھ کر وسیع القلب! مجسّم خیر محض! میں تمہیں بھول نہیں گیا۔ تمہارے گئے پیچھے وہ ملتان شہر کی رونقیں کہاں، وہ محبت کی لو کہاں ہائے ملتان! وائے ملتان! بھاڑ میں جائے ملتان! کاش پھر میری اور تمہاری ملاقات ہو۔ اکٹھے مارکٹائی کے فلم دیکھیں۔ یا ہم حرف و حکایت کریں۔ انشاء اللہ العلیم العظیم!

یہ خط نوکلت علی اللہ داروغہ جیل کی معرفت بھیجتا ہوں۔ تم اگر جیل میں ہوئے تو وہ پہنچا دیں گے۔ ورنہ لفافہ میرے پاس ڈاک میں واپس آ جائے گا۔ داروغہ جیل کو سلام۔ آپ کے ہم جلیسوں کو دعائیں!

خضر بے تاب

رئیس امروہوی کے نام ـــــ

قبلہ و کعبہ۔ جزائے خیر

ایک بات مسلم ہے۔ امروہہ کی خاک سے جس کا خمیر اٹھا۔ ولایت اس کو میراث میں ملی۔ صاحبِ وجدان اور قطب ہونا اس کی خصلت قرار پایا۔ تسخیرِ جنات، ٹیلی پیتھی، ستارہ شناسی اور اس قماش کے منجملہ علوم اس کو قسامِ ازل سے نگوڑے میں ہی ودیعت ہو گئے۔

الغرض امروہے سے نکلا تو ایک لشکرِ جنات اور غولوں کے جلو میں چلا۔ صاحب! امروہہ ولی خیز خطہ ہے اور دوسرے قصبوں کے اولیاء جو تھوڑے بہت ہیں امروہہ والوں سے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ویسے تو فقیر بھی ایک عرصے سے اس کیفیتِ روحانی و سرمدی سے دوچار ہے، سوتے جاگتے جنات اور چڑیلوں سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑتے ہیں۔ حقیقت بیان کرتا ہوں اور حاشا وکلا بوجہ حسد یہ دعویٰ نہیں کرتا چنانچہ میں نے خود کو قطب گردانا کہ اس سے انکار کفرانِ نعمت کے مصداق ہوتا۔ آپ کو جلانا یا ہنسی مخول کرنا میرا مقصود نہیں، یہ بلاء فیاض کا انعام ہے۔ ورنہ جبلت میں گھر سے لے کر تھوڑا آیا تھا۔ باور کیجیے گا گزشتہ برشگال میں میں نے حضرت کو خواب میں دیکھا۔ حلیہ مبارک عین بین وہی تھا جو ہر اتوار کی صبح کو کراچی کے اخبار جنگ میں تیسرے صفحے پر نظر افروز ہوتا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا اور وہ بات میرے پلے پڑی نہیں۔ مابعد اس نصیحت کے حضرت ایک جاروب طلائی پہ سوار ہو کر فضائے محیط میں مائل بہ پرواز ہوئے اور پلک جھپکنے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں کیا کہوں، کیوں آئے، کیوں گئے۔ جلوہ نمائی سے کیوں شاد بامراد فرمایا۔ اور مدعائے اصلی اس ملاقات سے کیا تھا۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے میں حضرت کے عالمِ رویا میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ایک بات اور کہہ دوں اس زمانے میں قلمروئے پاکستان میں باستثنائے میرے اور حضرت کے صرف تین قطب اور ہیں باقی کو میں نہیں مانتا۔ اور ان کے دعوے اس بارے میں جھوٹے ہیں۔ ایک قطب قدرت اللہ المتخلص شہاب ہیں۔ غالباً عملداری اسلام آباد ان کا علاقہ ہے۔ گو ولایت ان کی ممالک مشرق و غرب شمال و جنوب تک ان کے ساتھ رہتی ہے۔ دوسرے ممتاز مفتی صاحب اور تیسرے حیدر آباد صوبہ سندھ کے جام سومار صاحب جو راہ چلتے جنات اور ارواح سے محوِ گفتگو ہو جاتے ہیں اور شاہِ جنات کی بارگاہ میں رتبہ خاص اور حق شفاعت کا ان کو حاصل ہے۔

میرے سمیت مذکورہ اصحاب امروہہ کے ہرگز نہیں ہیں۔ یہ امر مصدقہ ہے میں نہیں جانتا ان کا مولد و مسکن کس دیار میں ہے بہر حال امروہہ سے ان کا تعلق نہیں۔ اور حضرت کی ہم توبی ہموطنی کے شرفِ سعادت سے محروم ہیں آپ خواب میں مجھ سے ملے ہیں۔ امروہہ کے ایک اور مردِ باصفا سے میری ملاقات ایک داستان طراز خاتون کے دولت کدے پر ہوئی۔ وہ صاحب بھی شکل و صورت سے عارفِ کامل تھے اور بے بادہ بادہ مستِ الست تھے۔ پوچھنے پر انہوں نے اپنا مولد امروہہ بتایا اور مجھ کو حیرت نہ ہوئی۔ اس واسطے کہ ایسے دُرِ بے بہا سلطنت ہندوستان میں خاکِ پاک امروہہ ہی میں بافراط پڑے ملتے ہیں۔ ایک بی بی ستم پیشہ خدا جانے کہاں کی رہنے والی۔ کٹے بال، تیکھی چتون۔ اہلِ فرنگ کے فیشن کی دلدادہ ان کی مصاحبت میں تھیں۔ خاتونِ خانہ نے کھانا اُن کے آگے چُنا کہ دوپہر کا کھانا وہ بوجہ نسیان گھر پہ کھانا بھول گئے تھے اور بھوک سے نڈھال تھے صُورت سے فاقہ مستی ان صاحب کا مقدر تھی۔ اب تماشا عجب دیکھا کھانا آیا تو وہ ستم پیشہ کہ جس کو دیکھ کر فقیر کے سینے پر سانپ پھرنے لگتا۔ اپنی جگہ سے اُٹھی اور امروہہ کے ان سالک مجذوب کے پہلو میں جا بیٹھی۔ وہ مست ناتواں اور سست تھے۔ یہ بی بی روغنی روٹی کو بھور کر اور شوربے میں تر کر کر نوالہ بناتی اور اُن کے دہانِ مبارک میں دیتی۔ وہ لُقمہ زہر مار کرتے جاتے۔ میں نے سوچا کاش حضر کوئی مجھ کو بھی یوں کھلاتا۔ ہر چند کہ خود قطب، ولی ہوں۔ امروہے کے ولی کی خوش بختی پر رشک کے مارے دل ڈوبتا جاتا تھا۔ یہ صاحب سخنور نہیں۔ ہم آپ کی طرح جنات وحشرات الارض سے واسطہ ظاہری ان کو نہیں البتہ مصوری کی طرف طبیعت مائل ہے۔ وہ تصویریں رنگا رنگ کی کھینچتے ہیں کہ فان گاگ اور پکاسو دیکھیں تو چلّو بھر پانی میں ڈوبنے کی ٹھانیں۔ انہوں نے اب نقاشی اور کلامِ پاک کی خطاطی کا جیرت فزا ڈھنگ ایجاد کیا ہے۔ تصویریں اب نہیں بناتے۔ صاحب! یہ شعار ادبیا اور صوفیا کا ہے۔ میرا گمان ہے کہ اس طور پہ آئندہ سال تک انشاءاللہ مطلّا بو قلم سے تعویذ اور گنڈے رقم کرنے لگیں گے کہ شکل انسانی و حیوانی کا

کھینچنا مذہب اسلام کی رُو سے تکفیر ہے۔ یہ طرّہ بھی خص امروہہ والوں کو حاصل ہے کہ وہاں کے سُخن گزار، مصوّر، مطرب۔ فن پرست وقتِ رہائی سے چند سال پہلے اپنے کئے کرائے پر نائب ہو جاتے ہیں اور آناً فاناً مشق فن سے کنارہ کر کر دربارِ رسالت کے شیدائی اور مستغرق رویت و روحانیت ہونے کا پیکر دھارتے ہیں۔

فقیر کے لئے حضرت کا کلام خواہ نظم خواہ نثر نور افزائے نگاہ، سرمۂ بصیرت و عبرت ہے جب سے آپ کی نگارش کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ جنّات، غولوں، چڑیلوں، بدروحوں اور اس قبیل کی دوسری موجودات سے ناآشنائی۔ بیگانگی۔ بدگمانی ان کے میرے درمیان میں نہیں رہی۔ آپ کے فیضِ سُخن کے صدقے اب اکثر ان غولِ مردوزن کا شریکِ صحبت رہتا ہوں۔ پہروں اختلاط و انبساط کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں ان کو جاننے لگا ہوں اور قیاس ہے کہ وہ بھی مجھ کو پہچانتے ہیں۔ خود کو آپ کا نیاز مند کہلانا میرا فخر ہے۔ ثناخواں ہونے کا بھلا میرا کیا مقام۔ میرا کیا مُنہ کہ آپ کی گوہر افشانی کی داد دوں۔ اس داد کا دینا جنّات وغیرہُم کا حق ہے۔ میں تو عاشق ہوں آپ کے قطعات کا۔ جنگ میں آپ کے روحانی مضامین کا۔ یوں سمجھو تمہارا عاشق صادق ہوں۔ میرے حسبِ حال حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

حضرت آپ میرے لئے کج کلاہ ہوئے۔ اگرچہ جنگ میں جو تصویر تمہاری چھپتی ہے اس میں سر مبارک پر کلاہ وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ سارے لوگ نوکیلی مخروطی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ آپ نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں سمجھتا ہوں۔ ننگے سر بات بنتی نہیں۔ آخر عدالتِ عالیہ کے قاضی القضاۃ بھی کرسی انصاف پر جبہ اور موٹے اسپ کا کنٹوپ پہن کر دادرسی کرتے ہیں۔ ٹوپی پہن کر شان دونی ہوگی۔ ویسے آپ کی مرضی۔ میں کون جو اپنے مشفق، رفعت درجت

کو آداب اس راہ کے سکھلاؤں۔ تو یہ اتو یہ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ کے نثر اور نظم کے کلام کا فقیر پچھلے دس سال سے جامع ہے جو کچھ آپ کی صورتِ عز و شرف کے ذیل میں اخبار میں چھپتا ہے۔ اس کے تراشے بحفاظت تمام ایک لوہے کے تار میں پروتا جاتا ہوں اور ان اوراقِ پاک کا انبار دیوان خانے کی چھت کو چھونے لگا ہے میرا اندازہ ہے کہ ۱۵ سطر کے مسطر سے چار سو جز و یعنی لگ بھگ پانچ ہزار صفحات کی کتاب بن جائے گی۔ آپ اجازت دیں اور طباعت و اشاعت کا خرچ کلہم اپنے ذمہ لیں تو انطباع کی فکر کروں۔ ورنہ ڈر ہے کہ یہ مسائلِ حکیمانہ کا خزینہ ضائع ہو جائے گا اور توحید و روحیت کی شمع فروزاں ہمیشہ کے لئے گُل ہو جائے گی حضرت ارشاد فرمائیں تو یہ ننگِ اقطاب دو ہزار نسخوں کی کتابت اور اشاعت کی لاگت کا تخمینہ آپ کی خدمت میں معروض کرے بتمامے اس رقم کے بذریعہ منی آرڈر یا ہنڈوی بھجوانے پر اس کارِ خیر کا بیڑہ اٹھاؤں گا اس میں دیر نہیں ہو گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ میری طرف سے کچھ خدشات آپ کے ذہن میں ہوں تو ان کو جگہ نہ دیجئے گا۔ خدا نخواستہ دغا یا غبن کا سوچا ہو تو دیدے پھوٹیں۔ ایمان نصیب نہ ہووے۔ اُردو کا دیوان بیس ہزار قطعات کا۔ دافع بلیات مسمریزم۔ یوگ کے متعدد رسالے یہ نسخے آپ نے مرتب کر لئے ہوں گے۔ وہ بھی مجھ کو چھاپنے کے لئے ارسال فرمائیے گا ایک مطبع کا مہتمم میرا ہم مکتب تھا۔ امید ہے وہ لحاظ و مروت کرے گا اور یہ کام حضرت کی منشا کے مطابق سر انجام پائے گا۔

بہ رہا اس دفترِ بے مثال در خواب و طلسم و ساحری کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا مسئلہ جو بخوبی حل ہوا اب مریدانہ عجز و انکسار سے دیگر امورِ غور طلب معروض ہیں ان کا تعلق علم الارواح و ما بعد الطبیعات سے ہے اور ان علوم میں فقیر ہنوز ابھی گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہے۔ فنونِ تسخیرِ جنات و عملیات سے لگاؤ ضرور رکھتا ہوں مگر مشق نے اتنی ترقی نہیں کی کہ جنات بہ زور چلاؤں اور ان کے منہ کو آؤں۔ اس مخلوق کو مائل بہ اطاعت و

نیازمندی کرانا اور ہر کام اپنی مرضی سے کرانا فی الحال میرے بس میں نہیں۔ ایک ماہنامہ کتاب اردو میں لاہور سے چھپتا ہے۔ گزشتہ ماہ کے پرچے میں آپ کی شبیہہ قدوسی صفات کے تحت آپ کے خیالات اور ارشادات ایک صاحب نے رقم کئے ہیں۔ اُن کی آپ سے غالباً کراچی میں ملاقات ہوئی اور یہ اس کا بیان ہے۔ سبحان اللہ جیسا سمجھتا تھا ویسا ہی پایا۔ اس بیان کا ایک ایک لفظ آپ کے پرتوِ جمال سے روشن ہے۔ جنات وارواح اسے پڑھیں تو حظ اُٹھائیں۔ میں نہ کہتا تھا کہ مریخ اور ایک ستارہ فلکی نے جس کا نام میں نہیں جانتا مل کر ایک صورت پکڑی ہے اس کا اسم رئیس احمد اور تخلص رئیس ہوا۔ ارض پاک امروہہ اس کی ہستی سے سُرخرو ہے۔

فیض مآب۔ جامع مداح۔ رئیس صاحب یہ مضمون لاجواب اور مابعد الطبیعات پر حرف آخر ہے۔ گو بیشتر حصہ اس کا لاعلمی وکوتاہ فہمی کے سبب فقیر کے پلے نہ پڑا۔ کیوں نہ کہوں اپنی جہالت پر مجھے رونا نہ آیا۔ میرا ذہن بچپن سے کچھ کچھ ماؤف ہے اور میرا باپ مجھ کو کُند ذہن تسلیم کرتا تھا۔ چونکہ یہ معذوری موافق رضائے الٰہی ہے۔ اس کا گلہ کیا۔ اس عبارت کی جس کی مجھ کو سمجھ نہ آئی اب وضاحت چاہتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اس گستاخی سے آپ کے چہرے پر ملال نہیں آئے گا۔

آغازِ مضمون میں آپ نے بسبیل ارتکازِ توجہ لطائف ستہ کی طاقتوں کو بڑھانے کی ہدایت کی ہے۔ میں لطائف سے وہ ہنسی مذاق کے چٹکلے سمجھا جیسے شیخ چلّی صاحب مرحوم ملا نصر الدین رحمتہ اللہ علیہ اور کھتری بیربل نے وقتاً فوقتاً کہے ہیں۔ یا لوگوں کا گمان ہے کہ انہوں نے یہ کہے۔ اردو، فارسی لغات میں بھی یہی معنی درج ہیں۔ آگے چل کر مجھ کو معلوم ہوا کہ یہ لطائف زیرِ ناف، سر، خفا، روح، مرکز دماغ وغیرہ کے ہیں۔ خوب ارتکازِ توجہ کو مراقبے کا نام دیتے ہو اور مراقبہ فقیر کو پسندیدہ ہے۔ آج کل پہروں مجھ پر کیفیتِ مراقبہ طاری رہتی ہے۔ اہلِ ہنود کے بیراگیوں کے مثل ہر صبح چارپائی پر آلتی پالتی مار کر

بیٹھتا ہوں۔ اس طور کہ دایاں پاؤں بائیں زانو پر اور بایاں پاؤں دائیں زانو پر۔ سانس کھینچنے اور دم روکنے کی مشق بڑھاتا ہوں۔ نگاہِ توجہ زیرِ ناف پر مرکوز کرتا ہوں۔ افسوس تا حال کشف یا نروان نصیب نہ ہوا۔ میرا گمان ہے کہ میرے مراقبہ زیرِ ناف میں کسر ہے۔ اس واسطے کہ کہ مرد و زن کا پچاس فیصد جسم یا دھڑ زیرِ ناف رکھا گیا ہے اور ٹانگیں بھی اس میں شامل ہیں۔ اب زیرِ ناف کس حصے پر غور و دھیان خصوصی کیا جائے۔ حضرت نے کہ دانائے رموزِ مراقبہ ہو، اس نکتے کو اخفا میں رکھا ہے بلکہ بوجہ شرم و حیا گول کر گئے ہو۔ میں پوچھتا ہوں آپ کو کشفِ زیرِ ناف کس جزوِ بدن پر استغراق سے ہوا۔ اگر صاف صاف بتلایئے گا۔ تو بندہ تا حیات آپ کا احسان مانے گا اور پاؤں دھو دھو کر پئے گا۔ تم کو حالتِ کشف میں آفتاب کے نور کا سیلِ رواں رگ رگ میں دوڑتا معلوم ہوا۔ اِدھر میں ہوں کہ باوجود مراقبہ متواتر کے اندوہِ ناکامی جاوید کشف کا صلہ نہ ملا مفت مراقبوں میں عمر گنوائی۔ ایک بار میں محوِ مراقبہ تھا کشف کے کچھ آثار پیدا بھی ہو چلے تھے۔ کہ دروازہ آہستہ سے کھلا میں متوقع تھا اہلِ جنات کی قوم سے کسی فردِ ہمدرد و نجیب الاصل کا۔ نو وارد ایک بھورا بلا نام بنیٹو نکلا۔ یہ جہانیان جہان گرد ایک عرصے سے درویش کے کلبۂ احزاں میں مقیم ہے اور میں دفتر جانے سے پہلے اسے تھالی میں بھوڑا دودھ پلاتا ہوں۔ مراقبے نے طوالت اختیار کر لی تھی اور بنیٹو کے ناشتہ کا وقتِ معمول تھا۔ غالباً وہ دیکھنے آیا ہو گا کہ اس کا والی جیتا ہے یا چل بسا۔ میری حالت نے اُسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور وہ جست لگا کر اور کرسی نشین ہو کر مجھ کو تعجب و خشونت سے گھورنے لگا۔ محوِ مراقبہ اس فقیر کو دل ہی دل میں احمق، جنونی کہتا ہو گا۔ بہر حال کشف آتے آتے رُک گیا۔ اس کیفیتِ سرمدی سے بیگانہ رہ گیا۔ وائے بدنصیبی! ایک واقعہ اور سُنو۔ یہ چار روز پہلے کی بات ہے۔ میں برلبِ سڑک حجامت کرانے کی خاطر اپنے خاص گیسو تراش کے پاس گیا۔ پانچ مہینے سے حجامت نہیں بنوائی تھی۔ میں آلتی پالتی مار کر بصورتِ مراقبہ اس کے روبرو بیٹھ گیا۔

زیر ناف پر توجہ کی اور اپنے سر اور چہرہ کو اس کے حوالے کیا۔ اس نے پہلے کنگھے قینچی سے گنتی کی جھاڑی ہموار کی۔ پھر یہ کہہ کر کسی مقصد سے استرے کو اپنے چمڑے کے پٹے پر کھٹا کھٹ تیز کرنے لگا۔ اسوقت مجھ پر نیم کشف کی روشنی بن رہی تھی۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ اب میرے کان کاٹے گا اور یہ مراقبے کا فیض تھا۔ اس احساس نے شدت پکڑی۔ خیال کو حقیقت میں تبدیل ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ معاً اس کی چادر پھینک وہاں سے اُٹھ بھاگا سو وہ استرا لیے کر چند قدم پیچھے بھاگا۔ کہتا گیا ہے کہ خط نہیں بنواتے تو پیسے تو دیتے جاؤ۔ یوں اب تک جلتا ہوں۔

اسی کشف کے بیان میں آگے لکھتے ہو کہ کثرتِ مطالعہ کتب عامل کاشف کے لیے سمِ قاتل ہے اور کتابوں کو مسکن خواب آور دوائی کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ آج کل واجد علی شاہ کا عہد، رسالہ اردو کی حصول مقصد کی خاطر ہر رات سیر کرتے ہو اور ایک صفحہ رسالے کا دیکھنے کے بعد آنکھیں نیند سے مُندنے لگتی ہیں۔ اس فقیر کا معاملہ اُلٹ ہوا۔ میں سونے سے پہلے کیخسروئے قلم و مباشرت حضرت کیسانووا کی یادداشتیں بالعموم دیکھتا ہوں اور گاہے گاہے فرینک ہیرس۔ ہنری ملر صاحبان کی داستانیں۔ کام شاستر، فینی ہل وغیرہ سے استفادہ کرتا ہوں۔ سچ مانیے کہ نیند آنا تو کجا وہ اصلاً غائب ہو جاتی ہے۔ میں پہر رات گئے تک بحالت بے چینی و بے قراری پلنگ پر تڑپتا ہوں اور پہلو بدلتا ہوں۔ آنکھیں پھوٹ جائیں اگر جھوٹ کہتا ہوں۔ سبحان اللہ۔ جسمِ مثالی و روحی کی تفریق۔ روحیت و روحانیت کا تذکرہ۔ معدوم کو موجود کرنے کا حال۔ یہ موضوع کس لطف سے ادا ہوئے ہیں۔ تحقیق و دقیقہ رسی آپ کی ان فنون میں گو کہ اکثر پریشانی دماغ اور بے ربطی تحریر سے ملوث ہے۔ انصاف کی رُو سے لائقِ صد ستائش ہے۔ کسی اور صاحب کو اس خاندان میں آپ کا ہم پلہ نہیں پایا۔ مجھ ناکندہ تراش جاہل کا فہم البتہ ان مطالب کو سمجھنے سے قاصر ہے اور پڑھتے وقت خیال آیا کہ یا تو میرا دماغ چل چکا ہے اور یا تو تم اول فول کہے جاتے ہو۔ حضرت اس کو گستاخی۔ دریدہ دہنی پر محمول نہ کیجیے گا۔ تم خود اس بات سے آگاہ ہو کہ ذہن انسانی وسوسوں کی آماجگاہ ہے اور ہر قسم کے خیالات، ڈھکوسلے۔ گورکھ دھندے اس میں آتے ہیں۔

میں بھی آدمی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں جسم انسانی میں دو اجسام مرکب ہیں۔ ایک جسم مثالی۔ دوسرا جسم روحی یعنی ایک طریق سے ایک آدمی یا عورت کے تین نفوس ناطقہ ہوتے ہیں جسم انسانی سے جسم مثالی ایک باریک ریشمی دھاگے سے منسلک ہے اور یہ دھاگا عارفانِ کامل کے نزدیک رشتہ حیاتِ انسانی کا ہے۔ جسم مثالی خارق العادات قوتوں کا گہوارہ ہے۔ جو چلہ کشی، حبس دم اور راجیہ یوگا کی مشقوں سے بیدار ہوتی ہیں۔ جسم مثالی جسم انسانی کے مرجانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور ارواح نیک و بد کی شکل میں پسماندگان و ورثا کو پشت در پشت دق کرتا ہے۔ اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ بھی مستنبط ہوا کہ جسم انسانی یعنی نفس ناطقہ لاہور میں دکان یا دفتر میں بیٹھا ہوا اور اس کا جسم مثالی لندن یا پیرس کے نائٹ کلب میں معشوقۂ پری پیکر کو گود میں بٹھائے وسکی کے جرعے اُنڈیلتا ہو۔ آپ کے ان مطالب و مباحث سے میں جو کم عقلی میں سمجھا وہ میں نے عرض کیا۔ اگر میں غلطی میں ہوں تو تم فرماؤ کہ تم نے کیا کہا اور میں نے کیا سمجھا۔ میرے سمجھنے میں فتور نہیں تو اس باب میں آپ کا ہم مشرب اور ہم خیال ہوں۔ چنانچہ اپنے اور دوسرے اصحاب کے محیر العقول تجربے تفنن طبع کی خاطر گوش گزار کروں گا۔ مزید توضیح و تشریح صرف آپ کر سکتے ہیں۔

ایک شخص ممتاز مفتی نام غالباً گوجرانوالہ کے پاس علی پور کا رہنے والا ہے۔ ماخذ صحیح اور طبع سلیم رکھنے کی بدولت اولیائِ باکرامت و عارفانِ کامل کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا شیدائی ہوا۔ اب ایک قطبِ اسم مبارک قطب اللہ کا مقرب خاص ہے اور ہر تحریر میں اپنے پیر و مرشد کی مدحت میں چند جملے لکھ دیتا ہے۔ اس کا ایک مضمون سال گزشتہ میں فقیر کی نظر سے گزرا کہ وہ لاہور یا کسی اور شہر میں ایک مقدمے کے سلسلے میں گیا۔ وہ چوراہے پر کھڑا عدالت پہنچنے کے لئے ٹیکسی رکشا کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں لاہور کے رکشا والے بگڑے دل ہیں ہرا یرے غیرے کو نہیں اُٹھاتے۔ عدالت کا وقت قریب۔ سواری ناپید۔ بے چارہ کرے تو کیا کرے جب مایوسی کے عالم میں پیدل چلنے کا قصد کیا ہی تھا کہ ایک بلیی موٹر گاڑی

پاس آکر رُکی اور گاڑی بان نے آواز دی۔ ممتاز مفتی بیٹھ جاؤ۔ آواز جانی پہچانی اور صورت آشنا لگی۔ غور سے دیکھا تو یہ گاڑی چلانے والا اس کا پیرو مرشد قدرت اللہ تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ یہ کیا کرامت ہے کہ اس نے پچھلے روز قدرت اللہ کو راولپنڈی چھوڑا اور وہ یہاں موجود ہے۔ اس کو کیونکر علم ہوا کہ اس کو سواری نہیں ملی۔ عارفوں سے بعض باتیں پوچھنا خلاف دستور ہے۔ شخص مذکور چپ چاپ گاڑی بان کی پچھلی نشست پر جا پڑا۔ عافیت اسی میں جانی کہ خاموش رہو۔ قدرت اللہ نے خود ہی گاڑی عدالت ضلع کے اندر ٹھہرائی اس کو اُتار کر گاڑی جہاں سے آئی تھی وہاں روانہ ہوئی۔ اس شخص کو کھد بد ہوئی کہ اس اسرار کا پتہ لگانا چاہیے ایک مجسٹریٹ اس کا دوست تھا اس کے کمرے سے جھٹ راولپنڈی قدرت اللہ کو فون کیا۔ گھنٹی بجنے پر فون کا چونگا اٹھایا تو دوسری طرف سے خود قدرت اللہ بولا:

"کیوں ممتاز مفتی کیا بات ہے عرض کیا آپ ابھی لاہور میں موجود تھے"

قدرت اللہ نے ارشاد فرمایا:

"کیا بکتے ہو۔ میں تو تین دن سے انجائنا کے درد شدید میں معذور پلنگ سے لگا ہوں۔ گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔"

میں اس واقعے میں شک نہیں کرتا اس واسطے کہ یہ شخص ممتاز مفتی صادق القول ہے۔ اسے دروغ بافی کی عادت نہیں۔ لو ایک اور حیرت افزا واقعہ اسی قماش کا سنو۔ فقیر نے خود اپنے کانوں سے اسے بائیسکوپ کی ایک مطربہ سے سُنا۔ جب میں چند روز اس کے ہاں مہمان تھا آپ کو نام بتلانے کی ضرورت نہیں کہ کشف سے بیٹھے بٹھلائے معلوم کر لو گے اس کا کہنا ہے کہ خاموش بائیسکوپ کے زمانے میں کوئی ایکٹر رحمان یا فرمان بڑا مشہور اور جمہور کا منظورِ نظر تھا۔ جوانی میں چھب اس کے دیکھنے کی تھی۔ نٹ کے کرتب اس کو آتے تھے۔ اس لئے اُسے اکثر فلموں میں ہیرو کا پارٹ مل جاتا ــــ اس مطربہ کی جس نے مجھے یہ قصہ سُنایا۔ ایک بھا بجی ہے۔ زمانہ سب کے پیچھے ہاتھ دھو کر لگا ہے۔ اس ایکٹر فرمان کو شراب و چرس کی لت پڑ گئی۔ اور چونکہ

آمدنی معقول تھی۔ خوب کمایا خوب اڑایا۔ آخر صحت جواب دے گئی۔ کنپٹیوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور قویٰ میں اضمحلال آگیا۔ وہ رنگ روپ نہ رہا۔ جس کمپنی میں وہ ملازم تھا وہ اگلی فلم بنانے لگی۔ اور یہ متوقع تھا حسب معمول اس میں ہیرو کا پارٹ کرنے کا۔ ہر آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ خود کو اپنے زعم کے مطابق گردانتا ہے۔ کمپنی والے تو اس سے خلاصی پانے کی فکر میں تھے۔ ہیرو کا پارٹ کرنے کو کیوں پوچھتے۔ یہ کمپنی کے مالک اور فلم بنانے والے سیٹھ کباڑی مل کے پاس پہنچا۔ اور اس سے اگلی فلم میں ہیرو بننے کا تقاضا کیا۔ اس نے ٹکا سا جواب دیا۔ کہا "تم کو ہیرو رکھ کر فلم کا ستیاناس کیوں کراؤں۔ اب تم ہمارے کام کے نہیں۔ چھوٹا موٹا پارٹ کرلو"۔ اس کھرے جواب سے اسے رنج وملال بے انداز ہوا۔ سیٹھ کباڑی مل پر پتیل کا گلدان مارنے کو لپکا کہ ٹھوکر کھائی اور چاروں شانے چت۔ اس کے فوراً بعد بیماری نے آن گھیرا۔ خون تھوکتا تھا اور سیٹھ کو گالیاں دیتا تھا۔ مرنے سے دو روز پہلے پلنگ سے کھسل پڑا اور بھتیجی کی مدد سے پوشاک تبدیل کی۔ بالوں کی پٹی درست کی۔ غصے میں بھرا سیٹھ کباڑی مل کے دفتر میں وارد ہوا۔ وہ اس کوزہ پشت مردے جنونی کے تیور دیکھ کر لرزنے لگا۔ یہ بولا:

"دیکھو کباڑی مل میرا نام بھی ماسٹر فرمان ہے۔ تم نے مجھ کو اپنی فلم میں ہیرو نہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔ میرے دن پورے ہو چکے ہیں مگر مرنے کے پیچھے بھی تم کو ستاؤں گا۔ ایسا زچ کروں گا کہ تم یاد کرو گے"۔

یہ کہہ کر وہ گھر واپس آیا۔ دو دن کے بعد اس نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ کمپنی والوں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کی خدمات کے صلے میں اس کی بھتیجی کو معمولی تنخواہ پر بچی کے رول کے لئے رکھ لیا۔

اب رئیس صاحب جو مابعد طبیعاتی وقوعے ظہور میں آئے ان کو سُن کر آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ یہ باتیں مصدقہ ہیں۔ خود اس ایکٹر کی مطربہ بھتیجی نے مجھ سے ان کا ذکر کیا۔ شک وشبہ کی کیا توجیہہ ہے۔

سیٹھ کباڑی مل نے نئے ہیرو سے ایک نور دار فلم "پروانہ محبت" تیار کی۔ اس کو یقین تھا کہ فلم پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے گی۔ لکشمی دیوی روپوں کی تھیلیاں بھر کر اس کے گھر اُتریں گی۔ عوام النّاس کو فلم دکھانے سے پہلے اس کے پرنٹ پردہ بائیسکوپ پر ایک خاص کمرے میں فلم والے خود دیکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ کوئی کسر نہ رہ جائے سیٹھ اور اس کے کارندے مع چند عالی مقام اشخاص کے کہ اس فلم کی خرید میں بولی دینے پہنچے تھے کمرے میں بیٹھے۔ سیٹھ کباڑی مل کا چہرہ اس کامیابی خوشی اور شادمانی سے روشن تھا۔ فلم کی ریل چلی۔ سبھی صاحبان نے واہ واہ کی۔ ہر جانب سے مبارکباد کا غُل اُٹھا۔ فلم کے مناظر یکے بعد دیگرے سرتاسر دلکشا، رُوح افزا۔ سیٹھ پھُولا نہ سماتا تھا۔ تیسری ریل میں ایک منظر ہیرو اور ہیروئن کا آیا کہ ایک درخت پر بیٹھ کر عشق و محبت کی چہلیں کرتے ہیں۔ یہ منظر گویا فلم کی جان تھا۔ اور حُسن و عشق کی گرمی ہنگامہ دیکھ کر کس کے دل پر چھُرے اور گلاب نہیں چلتے۔ ناگاہ اس منظر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہیروئن کے عقب میں ایک دوشاخے کے بیچ میں ایک شخص کی داڑھی۔ بڑھی ہوئی۔ نحیف و نزار، کُوزہ پشت نمودار ہے اور منہ چڑاتا ہے۔ سب دیکھنے والے دم بخود۔ یہ حضرت اس منظر میں کیوں کر آن ٹپکے۔ فلم میں کہاں اور کیسے آئے جب کہ منظر کی تصویر کشی کے وقت وہ موجود نہ تھے۔ دیکھنے والے پہلے ٹھٹھک گئے۔ پھر دہشت سے سُکڑے۔ یہ مسخرا کون ہے میری مطربہ ماسٹر فرمان کی بھتیجی کی تو چیخ نکل گئی۔ وہ بولی:

"یا اللہ یہ تو عین مین میرے مرحوم چچا کی شکل صورت ہے"،

اب سب نے ماسٹر فرمان کو پہچانا کئی بیبیاں دیکھنے والی غش کھانے لگیں۔ قصہ مختصر وہ منظر ریل سے کاٹنا پڑا۔ اور دوبارہ اس کی تصویر کشی کی گئی۔ دوشاخے کو عقب سے ہٹا دیا۔ ایک ماہ کے بعد دوبارہ کمرے میں فلم کے پرنٹ کا معائنہ ہوا۔ تیسری ریل تک خیریت رہی اور وہ منظر بھی ٹھیک ٹھاک گزرا۔ جب چوتھی ریل چلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی کُوزہ پشت ماسٹر فرمان کھیس نکالے گھوڑے بجلی پہ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان بیٹھا ہے۔ سیٹھ کے ہاتھوں

کے طوطے اُڑ گئے۔ اب ہوتا یہ کہ وہ فلم کے ایک منظر کو کاٹتے تو ماسٹر فرمان بہ لبِ خنداں کسی دوسرے منظر میں آن موجود ہوتا۔ سال گزر گیا اور فلم مکمل ہونے میں نہیں آتی تھی۔ سیٹھ نے پانچ سو پنڈتوں کو بھوجن کرایا۔ انہوں نے کمرہ فلم میں اشلوک، جنتر منتر پڑھے۔ بنگالے کے جادوگر عامل پہنچے۔ عمل ہر طرح کے کئے۔ جھاڑ پھونک کی مگر سب بے سُود۔ ماسٹر فرمان نہ مانا۔ سیٹھ اپنے دھن کو یوں جلتے دیکھ کر تلملاتا تھا۔ شدتِ یاس و نا امیدی میں کسی نے صلاح دی کہ دلی جا کر حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر حاضری دو۔ دان پُن کرو۔ اور حضرت کی جناب میں گڑگڑاؤ کہ کوزہ پشت کو راہ راست پر لائیں اور اس کو فلم میں گھُسنے سے منع فرما دیں چنانچہ سیٹھ جی اپنی دھرم پتنی سمیت درگاہ پر گئے۔ دونوں نے رو رو کر التجا کی۔ حضرت نے سُن لی۔ اور ترس کھا کر منظور اور مستجاب فرمایا۔ میری مطربہ کہتی تھی کہ اس کے بعد اس کے چچا نے سیٹھ کی فلم میں آنا بند کر دیا۔ چار فلمیں اس نے اور بنائیں ان کے بعد وہ دیوالیہ ہوا۔ اور کاشی بنارس میں جا کر بحالتِ بیراگ پران تیاگے۔

اب فرمائیے! کیوں حضرت ہے نا نہلے پر دہلا۔ جسم مثالی کا بعد از مرگ کاروبارِ عالم میں دخل در معقولات دینے کی اس سے بہتر حکایت میں نے نہیں سُنی۔ تم تو دانائے حال ہو جانتے ہو کہ یہ واقعہ من گھڑت نہیں۔ ایجادِ بندہ نہیں۔ عینی شاہد کے سامنے گزرا۔ میں آپ کے بارے میں باور کرتا ہوں۔ بلکہ ایمان رکھتا ہوں کہ اس دیارِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی تمہارا جسمِ مثالی ماسٹر فرمان کے ڈھنگ پر سرگرم کار رہے گا۔ اور اخبار و رسائل میں تمہاری روح پرور خامہ فرسائی جاری رہے گی۔ آمین۔ ثم آمین۔

حضرت کے اس بیان میں مباشرت و مجامعت کی اہمیت پر بھی خیال آرائی اور گلفشانی ہے اور صاحبوں کے دل کی دوسروں کو کیا خبر۔ فقیر کو تو یہ باتیں دل سے پسند آئی ہیں۔ مجھ کو اس مسئلہ میں اپنا ہمنوا جانئے گا۔ ایک بات البتہ اُلجھاوے کی ہے۔ فرماتے ہو عورت کا بحالتِ خواب سانپ یا شہر پیسا کے بُرجِ خمیدہ کا دیکھنا علامت جنس کی ہے۔ مرد خواب میں سانپ دیکھے تو

وہ علامت ابدیت کی ہوتی ہے۔ یہ آپ کی منطق اگر میری سمجھ میں آئی ہو تو خدا مجھ سے سمجھے!
آگے اپنے مطالعہ کتب کے احوال میں فرماتے ہو کہ دوسروں کی شاعری سے تمہارا دل شاد و خرسند نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ خود شاعر ہو۔ یہاں میں اور آپ ہم خیال ہیں۔ فن شعر گوئی و قطعہ گوئی سے بے بہرہ ہوں۔ نثر اُردو ٹوٹی پھوٹی لکھ لیتا ہوں۔ اور میرے یہ رقعے ایک مہربان وفا نبھانے کی خاطر اپنے رسالے میں چھاپ دیتے ہیں۔ جب رسالہ چھپ کر آتا ہے تو میں اور نہیں پڑھتا سوائے اپنے نثری مضمون کے۔ اپنی نثر کو بار بار پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں۔

بیان کے آخری حصے میں آپ کی دلی تمنا کی کیفیت مزہ دے گئی۔ کہتے ہو میری دلی تمنا یہ ہے کہ میں کراچی سے کوئی چالیس میل دور چلا جاؤں۔ جہاں ایک خانقاہ ہو۔ چالیس فقیر میرے ساتھ ہوں اور اس خانقاہ میں غذائی پابندیاں ہوں۔ سب لوگ روزہ رکھیں۔ چرس پینے کی اجازت ہوگی۔ بھنگ پینے کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ اعتدال کے ساتھ پی جائے۔ کھانے میں ان کو ہر چیز خود پیدا کرنی پڑے گی۔ یعنی ترکاریاں مولی، گاجر وغیرہ۔ گوشت بالکل ممنوع ہوگا۔ دودھ کے استعمال کی طرف توجہ زیادہ ہوگی۔ ہال میں سب کو جمع کیا جائے گا مغرب کے وقت اور روشنی گل کر دی جائے گی۔ اور یہ کہا جائے گا کہ آپ سب حضرات قلب کی طرف توجہ کریں۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد بانسری بجائی جائے گی۔ قلب کی طرف توجہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں بند کر لیں اور بائیں طرف سینے کے نیچے سننے کی کوشش کریں کہ قلب کے دھڑکنے کی آواز آ رہی ہے یا دھڑکن بند ہے۔ شروع شروع میں یہ ٹریننگ دی جائے گی سب کو۔ روشنی قاتل ہے حیات کی! اگر کسی جگہ کیڑوں کو مارنا ہو تو دھوپ سے بھی اُنہیں مارا جاتا ہے۔ حیات ہمیشہ تاریکی اور تنہائی میں پیدا ہوتی ہے۔"

سبحان اللہ! میرا گمان ہے کہ عارفانِ باکرامت اور عاملانِ ہپناٹزم کی خواہشیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ نثر اُردو جس لطف و صفائی سے بولتے ہو ویسے ہی لکھتے بھی ہو۔ ماشاءاللہ کلام میں

استقام واغلاط و بے ربطی کا شائبہ تک نہیں چالیس فقیر جن کو ساتھ لے جاؤ گے ان میں اس فقیر کا نام بھی لکھو۔ فقیر نے کشکول، بوریا سنبھال رکھا ہے۔ زادِ راہ اور کرایہ کی رقم کا منی آرڈر ملتے ہی فوراً ریل پر سوار ہو جاؤں گا۔ اور شرفِ قدم بوسی سے سرفرازی پاؤں گا۔ موٹر گاڑی ریل کے چھاؤنی اسٹیشن پر بھجوانا نہ بھولئے گا۔ موٹر گاڑی کا نمبر مجھ کو معلوم ہے۔ آپ اپنے رئیس خانے میں ٹھہرا کر درویش پروری کریں تو مجھ پر احسان عظیم ہوگا۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ بھنگ ایک دفعہ پی تھی اور جو حال میرا اس کو پی کر ہوا وہ بھولتا نہیں بستر پہ لیٹے لیٹے چاند تک تیرتا جاتا تھا۔ اور واپس پلنگ پر تیرتا آتا تھا۔ صغریٰ اور کبریٰ دیکھتا تھا اور لبوں پر اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون کا وِرد جاری تھا کسی طور اس دنیا میں مزید دھکے کھانے کے لئے رہ گیا۔ مصلحت خداوندی یہی ہوگی۔ یہ زمانہ شباب کا واقعہ ہے اور اس کے بعد بھنگ کے نزدیک نہیں گیا۔ چرس تین ماہ ہوئے میرے رشتے کے بھانجے عبدالرحمٰن رکن شیرازی کی صحبت میں پی۔ وہ سگرٹ کے خول میں تمبا کو اور چرس ملا کر بھر دیتا تھا۔ اور میں دم پر دم لگاتا جاتا۔ واقعی معرفت اور وجدان کے حصول کا آسان ذریعہ یہ ہے۔ خوب کیف ملا۔ یہ نہیں کہتا کہ چاروں طبق روشن ہو گئے، ہاں باصرہ اور سامعہ کو رونق ملی۔ جسمِ مثالی جسمِ انسانی سے چار پانچ فٹ اوپر اٹھ آیا۔ ہم اس وقت ٹیپ ریکارڈر پر گانا سنتے تھے۔ ایک اہلِ ہسپانیہ کی مطربہ دلنواز دھن میں گاتی تھی۔ مجھ کو ایسا لگا کہ وہ فتنہ سامانِ الغوزہ لے کر میرے پہلو میں بیٹھی ہے اور ہم الحمرا کے قصر میں ماہِ کامل کے روبرو عیش کرتے ہیں۔ بھنگ اور چرس کی جو اجازت آپ فقیروں کو دیتے ہیں میں اس کا راز جانتا ہوں۔ ابتدا میں ان ادویہ کے بغیر یزداں تک پہنچنا امرِ محال ہے۔

قبلہ روحِ رواں یہ بتایئے گا کہ خانقاہ کونسی آپ کی نگاہ میں ہے۔ چالیس کے ہندسے میں کیا برکت و روحیت پنہاں ہے کہ خانقاہ ۴۰ میل دور ہوگی اور فقیر بھی چالیس ہوں گے۔ فقیروں کو خانقاہ تک پہنچانے کا انتظام کیا ہوگا۔ آٹھ موٹر گاڑیاں درکار ہوں گی۔ کشت میں کھیتی کر کے سبزی اگانے میں چند ماہ لگیں گے۔ اس عرصے میں فقیر کیا کھائیں گے۔ اور فقیروں

کوگشت بونے ہل جوتنے سے کیا مطلب؟ آپ کو فن باغبانی آتا ہوگا۔ فقیر ایسے کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ دودھ بھینس گائے کا آج کل ڈھائی تین روپے سیر ہے۔ آپ کو چھوڑ کر چالیس فقیروں کا ایک سیر فی فقیر کے حساب سے ایک سو بیس روپے میں آئے گا۔ متوقع ہوں کہ یہ خرچ آپ اپنے ذمہ لیں گے لیکن دودھ اجاڑ خانقاہ میں آئے گا کہاں سے۔ اغلباً بھینسیں مع چارہ ساتھ لے جانا پڑیں گی۔

فرماتے ہو مراقبے و مکاشفے کا عمل ہال کمرے میں ہوگا۔ اکثر خانقاہوں کے ہال کمرے نہیں ہوتے۔ ہال کمرہ اس نقشے کے مطابق جو آپ کے ذہن میں ہے کسی معمار سے پہلے بنوانا ضروری ہے۔ ہال میں روشنی گل کرنے سے فقیروں کو سانپ بچھو سے ڈسے جانے کا خطرہ ہوگا۔ اور ان کی تعداد تبدریج گھٹنے لگے گی۔ چالیس سے چار فقیر رہ گئے تو کیا کرو گے۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد بنسری بجانے کا کام مجھ کو سونپئے گا۔ نے نوازی کی مشق ایامِ طفولیت میں کی تھی۔ پھونک مار سکتا ہوں۔

آپ کے اس بیان سے مجھ پر معلوم ہوا کہ ہر روز صدہا عورتوں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہو۔ کیوں نہ کہوں مجھ کو رشک نہیں آیا۔ رشک آیا اور صاحب عجب آیا بلکہ پتنے انگاروں پر لوٹا۔ خوش بختی اس کو کہتے ہیں اپنا یہ حال کہ دنوں تک گھر کی جمعدارن کے سوا کسی استری سے پالا نہیں پڑتا۔ اور اس سے باتیں یہ ہوتی ہیں۔ بی بی جنت اس کمرے میں جھاڑو لگا دو۔ پاخانے کا کموڈ صاف کر دو۔ وائے تیرہ بختی۔ آپ کو شک وشبہ نہیں اور مجھ کو شک وشبہ کیوں ہو کہ کم و بیش ڈیڑھ لاکھ اشخاص سے خط و کتابت براہِ راست نہ بر سبیل جن واشراق (ٹیلی پیتھی) کر چکے ہو۔ شاباش۔ اولیاء کا یہی کام ہے اولیا ایسا ہی کرتے ہیں۔ فقیر نے ساری زندگی میں چالیس کے لگ بھگ خط لکھے ہوں گے۔ اور آدھے ان میں قرض خواہوں کے تقاضوں کے جواب میں تھے۔ حضرت! کیوں قلم گھسانے اور خطوں کو ڈاک میں ڈالنے کا دردِ سر اٹھاتے ہیں۔ پچاس ساٹھ خط جو روز لکھتے ہو تو تم نہیں لکھتے ہو گے۔ آپ کے اجسامِ مثالی و روحی یا مرید بھوت پریت

بہ مشقت بھوگتے ہوں گے۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ ایک خط کے لکھنے میں پندرہ منٹ بھی لگیں۔ تو ساٹھ ملفوف کے لکھنے کے لئے پندرہ گھنٹے درکار ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے۔ اس بات کو کہ دانایانِ مغرب نے شب و روز کو چوبیس گھنٹے میں تقسیم کر رکھا ہے۔ فرماتے، ہو چار پانچسو مغلوب الجنات لوگ ہر روز تم سے ملتے ہیں اور جنتر منتر پوچھتے ہیں میں سوچتا ہوں پانچ منٹ بھی ایک مرد اور بی بی کو دو تو چار سو کے معائنہ ملاقات میں کم و بیش چالیس گھنٹے صرف ہونے چاہئیں۔ مانا کہ خورو خواب و حاجات ضروری سے بے نیاز ہو۔ اور ان میں ضیاع اوقات نہیں کرتے پھر بھی پندرہ گھنٹے خطوط نویسی کے اور چالیس گھنٹے ملاقاتوں کے مل کر پچپن گھنٹے ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا کرامت ہے۔ کیا حیرت آور قدرت ہے۔ شب و روز کو طول دے کر پچپن گھنٹے کا بنا دیا۔ اہلِ مغرب کی جنتریوں کو موقوف کر دیا۔ کس حوصلے کے آدمی ہو جو دعوی خدائی نہیں کرتے۔ حضرت نے یہ کبھی کیا ہو تو راز میں لکھ کر بھیجئے گا۔ فقیر عرصے الحاد و دہریت کے پھیر میں پڑا ہے۔ فی الفور ایمان لے آؤں گا۔

یہ خط شیطان کی آنت بن گیا ہے اور باتیں بہت سی لکھنے کی رہ گئی ہیں اب بس کرتا ہوں اور خط کو لفافے میں اور لفافے کو سر بمہر کر کے آدھ گھنٹہ مراقبہ کروں گا۔ ادم مانی پدمے ہُم کا ورد کروں گا حضرت سلیمان شاہ طلسم کی ان دنوں مکاشفے میں زیارت ہو تو فقیر کی بندگی عرض کیجئے گا اور یہ بھی عرض کیجئے گا کہ کوئی جن فارغ البال اور مسکین میری خدمت میں مامور فرما دیں۔ آج کل چاول دال خود پکاتا ہوں۔

طالبِ نگاہِ کرم

خضر بدبخت

رشید ملک کے نام ـــــ

شفیق مکرم رشید ملک صاحب ۔ درویش کا سلام و دعا قبول فرماؤ۔

تم نے میرا حال پوچھا اور یہ یاد آوری تمہاری کرم گستری اور عنایت ہے۔ مجملاً میری حقیقت سنو۔ میں مع الخیر وطن پہنچا۔ ٹرک میں گھر کا سب اثاثہ لدا ہوا تھا۔ ایک یار باصفا ساتھ میں تھے۔ دریا کا پل عبور کر کے بہاولپور داخل ہوئے تو پو پھٹ رہی تھی۔ مرغان سحری نوا سنج تھے۔ طالب علمی کے ایام کے آشنا راستوں اور سڑکوں اشجار و اثمار کو دیکھ کر دلشاد ہو اچونگی پر رکے۔ محرران چونگی نے بے جا باز پرس کی۔ ان کو بتایا کہ پنشن پلنے کے بعد لاہور سے آتا ہوں اور یہ گھر کا سامان ہے۔ محصول چونگی ایسے سامان پر قابلِ ادائیگی نہیں۔ آخر ردو قدح اور تلخ کلامی کے بعد ان سے نجات پائی۔ آگے روانہ ہوئے۔ لاریوں کا اڈہ۔ اسٹیڈیم و شیر باغ۔ بیکانیری گیٹ۔ ان کی صورت اب بدلی ہوئی دیکھی۔ لاریوں بسوں کا اڈہ پہلے کہاں تھا۔ اسٹیڈیم میرے زمانہ ملازمت میں ریاست کے وزیر اکبر عالی جاہ مخدوم زادہ حسن محمود بہادر نے بنوایا تھا۔ شیر باغ اب جانوروں کا چڑیا گھر اور ایک عجائب گھر قائم ہے۔ اللہ اللہ ہمارے وقتوں کا بیکانیری دروازہ، فرید گیٹ ہو گیا نہ دروازہ نہ گیٹ۔ نہ اس کی گمٹیاں کنگرے۔ اس کے پاس حاجی عبدالرحمٰن اینڈ سنز کی عالی شان حویلی نما دوکان تھی۔ وہاں شرق و غرب کا مال خریداری پٹا ہوتا۔ رؤسا وہاں آکر اشیائے ضرورت خریدتے تھے اور حاجی صاحب حاجی لٹ کے عرف سے مشہور تھے۔ اس دکان کا اب پتہ نہیں۔ حبیب بنک اور نیشنل بنک کا وہاں تصرف ہوا۔ قصہ مختصر اپنی حویلی پر پہنچے۔ اس پر کس مپرسی کا عالم طاری تھا اور وہ بھوت پریت اور غول بیابانی کا مسکن بنی تھی۔ ملک صاحب! پانچ چھ برس سے یہ خالی اور ویران پڑی تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے میرے والد مرحوم و مغفور کی زندگی میں اس کی شان اور چہل پہل دیکھی تھی۔ اب اس کے سامنے سے گزرتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اس واسطے کہ اس کے اجڑنے

کا منظر دیکھ نہیں سکتے۔ یہاں سامان ٹرک سے اتارا گیا۔ ہم نے آس پاس کے چند آدمیوں کی مدد سے اس حویلی کے ایک کمرے میں الم غلم ڈھیر کر دیا۔ پھر امن و چین کا سانس لیا کہ ایک مرحلہ جو درپیش تھا بخیر و خوبی اس کو سرانجام کو پہنچایا پھر بجلی پانی کے پیچھے بھاگے۔ بارے ان کا بھی انتظام ہو گیا۔

تین چار مہینے پنشن کے باب میں اُلجھا رہا۔ میرے اللہ نے عنایت کی کہ یہ مسئلہ ایک عزیز کی معاونت سے حل ہو گیا۔ محو حیرت ہوں کہ کیونکر اتنی جلد ہوا۔ پنشن چھ سو اسی روپے ماہانہ منظور ہوئی ہے۔ یہ روپیہ خزانہ سے فقیر کو ماہ بماہ ملا کرے گا۔ خوش ناخوش گزارا ہوتا رہے گا۔ اقبال سیالکوٹی کہتا ہے۔ بیت

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

تم کو معلوم ہو کہ قوتِ حیدری کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی اور اس عمر میں وہ کہاں سے آئے گی۔ بدن میں حرارتِ غریزی قائم رہے چلتا پھرتا رہوں یہی غنیمت ہے۔ دو وقت کی روٹی چار پیالے کافی کے ایک ڈبہ گولڈ لیف سگرٹ کا اور کتابوں کا مطالعہ۔ ملک صاحب اسی کو میں عیش گردانتا ہوں۔ اس سے سوا اگر یارانِ ظریفیت و با مروت کی صحبت میسر آجائے جن سے اختلاط و انبساط کی باتیں ہو سکیں تو آدمی اس دنیا میں اور کیا چاہے۔ سو یہ نعمتیں مجھے اس شہر میں میسر ہیں۔ حرفِ شکایت اپنے لبوں پر لا کر کیوں احسانات ایزدی کی ناشکری کا سزاوار ٹھہرایا جاؤں۔

اس بار ماہ صیام میں میں نے کل پندرہ روزے رکھے اور چودہ روزے کھا کھا کر کاٹے اس مہینے میں میرا یہ معمول تھا کہ گھڑی کے الارم پر ایک پہر رات رہے جاگ جاتا۔ بجلی کے چولھے پر کافی بناتا اور اُسے گھونٹ گھونٹ سرکتا۔ دو سگرٹ گولڈ لیف کے مزے لے لے کر پیتا۔ جب سحری کا وقت ختم ہو جاتا اور پاس مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو میں اپنے موڑھے اور

جاگر بوٹ چڑھاتا۔ ایک بید کی چھڑی میں نے ان دنوں خرید لی تھی۔ اسے ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکل آتا۔ میرے بھائی کا السیشین کتا جوڈی میرے برآمد ہونے کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوتا (میرے بھائی کے بچے بھی اب یہاں آگئے ہیں اور نصف مکان ان کے پاس ہے۔ رمضان کے مہینے میں وہ لاہور گئے تھے جہاں میرا بھائی محکمہ آبپاشی میں نوکر ہے)

اس حیوان کی والہانہ الفت اور دمسازی کا مجھے اپنی زندگی میں اوّلین بار تجربہ ہوا۔ یہ میرے دروازے سے نکلتے ہی خوشی سے دھیمی آواز میں گڑگڑاتا۔ اگلے پنجے اٹھا کر مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کرتا اور میں ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اپنے سے دور کرتا۔ یہ پھر اسی طرح گڑگڑاتا ہوا میرے قدموں میں لوٹتا اور جب تک میں برآمدہ عبور کرتا یہ فرطِ مسرت سے اُچھلتا کودتا کدکڑے مارتا حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ پھاٹک کھلتے ہی جوڈی اور میں بجلی کے قمقموں سے روشن سڑک پر مکاں سے باہر ہوتے۔ جوڈی مجھ سے دس قدم آگے ہوتا اور پھر رک کر شوخ آنکھوں سے میری راہ دیکھتا۔ جوڈی ان دنوں بڑا صحت مند اور شوخ طبع کتا تھا۔ محبت کے پر جوش اظہار میں میں نے کیا جوان کیا انسان کسی کو جوڈی سے آگے نہیں پایا۔ اُسے اس بارے میں کوئی جھجک نہ تھی۔ وہ لوگ جو محبت میں شدتِ جذبات کے قائل نہیں جوڈی کو بلائے بے درمان اور مصیبت عظیم گمان کرتے۔ ان کی بدسلوکی اور ردِ الفت کی روکھائی پر جوڈی کے دل کو ٹھیس ضرور پہنچتی ہو گی۔ مگر اس نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی۔ میں اور چھوٹا لڑکا شادی اسکے چہیتے تھے اور وہ ہمیں عاشقانہ نظروں سے تکتا تھا لیکن ہم بھی اُسے تھپکنے یا اس سے الفت جتانے سے جھینپتے کہ کہیں وہ فرطِ مسرت وانبساط سے دیوانہ نہ ہو جائے۔

کتا اور میں سڑک پار کر کے سامنے کے چھوٹے سے پھاٹک میں سے صادق پبلک لائبریری کے ملحقہ سبزہ زاروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پگڈنڈیوں پر چلتا اور جوڈی گھاس پہ پودوں کی جڑوں کو سونگھتا اپنی دم کو منہ میں لینے کی غرض سے چک پھیریاں اور عجیب

مضحکہ خیز حرکات کرتا جن کو دیکھ کر ہنسی آتی۔ کبھی وہ کوّوں اور ہوا میں کلیلیں بھرتی چڑیوں کے پیچھے دوڑ لگاتا۔ وہ یہ سب کچھ لطف طبع کی خاطر کرتا، ورنہ یقین جانو جوڈی کو طائروں کی مخلوق سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ جوڈی کو کوؤں اور چڑیوں سے کیا واسطہ امیں بتانا بھول گیا کہ جب جوڈی رحیم یار خان میں تھا تو اسے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے ایک جاتے ہوئے ٹریکٹر کو سامنے سے جا کر لینے کی کوشش کی تھی نتیجہ یہ کہ بائیں ٹانگ ٹریکٹر کے پہیے کے نیچے آگئی اور کچلی گئی۔ اب جوڈی اپنے پنجے کو اٹھائے تین ٹانگوں پر پھدک پھدک کر چلتا دوڑتا ہے۔ قسم لے لو جو اس کتے نے اس سانحے سے سبق سیکھا ہو۔ بلکہ تب سے سب ٹریکٹر والوں، لاریوں اور مشینی گاڑیوں کو اپنا دشمن جانتا ہے۔ انہیں دوڑتے دیکھ کر اس کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ کتنا ہی روکو، منع کرو۔ وہ ان کو امن سے نہیں گزرنے دیتا۔ بے قابو ہو کر ان کو عین سامنے سے جا کر لینا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

یہاں اس علاقے کے مختلف قد و قامت رنگ و نسل کے کتوں کی ایک ٹولی ہمارے جوڈی کے سواگت کے لئے تیار ہوئی۔ یہ کتے غالباً جوڈی کو اس کے نووارد اور بدیسی ہونے کی بنا پر ناپسند کرتے تھے۔ جوڈی خطرے کو بھانپ کر میرے قریب آجاتا۔ وہ مختلف سمتوں سے جبڑے وا کئے غراتے جوڈی کی طرف لپکتے۔ مگر ایک فاصلے پر رک کر بھونکنے پر اکتفا کرتے۔ علم حیوانات میں مجھ کو شغف نہیں۔ پھر بھی جہاں تک میرا خیال ہے۔ جوڈی اس دھاوے سے بے طور متوحش نہ ہوتا۔ وہ ان بازاری کتوں کو خاطر میں نہ لاتا۔ کبھی کبھی وہ جواب میں بھونکتا ضرور اور نبرد آزمائی کے لئے دشمن کی جانب قدم بڑھاتا ضرور۔ مگر پھر کھڑے ہو کر ان کے نازیبا کرتوتوں کو مدبرانہ اور کسی قدر حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا۔ اس وقت اس کے وضع وا منہ سے ایک ٗ بخ ہنک نہ نکلتی۔ میں نے بید کی چھڑی اس ٹولی اور دوسری ٹولیوں کو جوڈی سے دور رکھنے کے لئے خرید کی تھی۔ یہ خوب کام آئی۔

ملک صاحب افسوس اس وقت کا جوڑی۔ اب کا جوڑی نہیں۔ اس کی رنجوری ذلت وخواری کا قصہ لمبا ہے۔ پھر کبھی سناؤں گا۔

صادق پبلک لائبریری سے ہوتے ہوئے ہم پرندوں کے نغمے سنتے ایک ہرے بھرے راستے سے کچہریوں کے علاقے میں آن نکلے۔ یہاں نور کے تڑکے میں قبرستان کی سی خموشی ہوتی اور وکیلوں کے لکڑی کے کابک یکسر ویران۔ جوڈی مجھ سے کچھ دیر کے لئے بچھڑ کر کابکوں میں سونگھتا پھر مجھ سے آن ملتا۔ کمشنر بہادر کے نئے دفتر سے آگے کلب روڈ گزرتی ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب آئی۔ جی بہادر کے دفاتر اسی سڑک پر ہیں۔ جب کوئی اکا دکا ٹرک یا ٹریکٹر سڑک پر سے گزرتا جوڈی کا جذبہ انتقام جوش میں آجاتا اور وہ میری ڈانٹ کو ان سنی کر کے دشمن کو سامنے سے جاللکارتا۔ وہ بال بال بچ جاتا۔ جوڈی کے بے حد احمق ہونے میں کلام نہیں۔ اس کی حکم عدولی پر مجھے طیش آتا اور میں اس کے سر اور جسم پر بید سے تڑاک تڑاک ضربیں لگاتا تو وہ بید کھاتے ہوئے بچھ جاتا اور التجا کی نگاہوں سے مجھے دیکھتا۔ اب ملک صاحب میرا گمان ہے کہ جوڈی کو خوب معلوم تھا کہ میں نے اُسے بید کیوں مارے مگر ایک ناقابل اصلاح بچے کی طرح اس کے طور طریقے وہی رہے۔ تب ہی سے اس کے دل میں سمائی کہ میں نے بید کی چھڑی اسے سزا دینے کی خاطر حاصل کی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کچھ دہشت زدہ رہنے لگا اور جب وہ گھر پر چھڑی کو میرے ہاتھ میں دیکھتا وہ مجھ سے فاصلے پر رہتا اس کے دل معصوم میں میرے لئے رنجش پیدا ہوئی۔ میرے بلانے پر بھی وہ مجھے مڑ مڑ کر تکتا ہوا دور بھاگ کھڑا ہوتا بعد میں میرے بھائی نے مجھے کہا کہ کتے بچوں کی مانند ہوتے ہیں اور میرا جوڈی کو بید مارنا غلط تھا اس نے مجھے جوڈی کی عادتیں بگاڑنے کا قصور دار ٹھہرایا اور سمجھایا کہ مجھے اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر سدھانا چاہیئے تھا۔ ملک صاحب تم نے کتے رکھے ہیں! تم بتاؤ! کتوں کی تربیت کیونکر کرتے ہیں میں اس مضمون میں نابلد محض ہوں۔ خیر جوڈی اور میری سیر کی داستان تھوڑی اور سن لو۔ کلب روڈ چوراہے پر جا کر ملتی ہے جو

فرید گیٹ سے نہر کے دفاتر اور آگے بغداد کے ریل کے سٹیشن پر جاتی ہے۔ کلب روڈ سے ہم فرید گیٹ اور اپنے گھر کا رخ کرتے ڈویژن کے حکام اعلیٰ کے دولت کدے جرنیل صاحب کا فلیگ سٹاف ہاؤس، جنرل پوسٹ آفس، بنک، ہائی سکول یہ سب چوراہے اور فرید گیٹ کے درمیان واقع ہیں۔ صاحب کمشنر بہادر کی اقامت گاہ کے پھاٹک پر گارڈ متعین ہے توپوں کے دو پیتل کے دہانے کنکریٹ کے ستونوں پر نصب ہیں جوڑی یہاں ضرور رکتا اور توپوں کے دہانوں کو غور اور حیرت سے دیکھتا۔ وہ اقامت گاہ میں اندر جانے کی کوشش کرتا مگر گارڈ اُسے دھتا بتاتے۔ ڈاک میں ڈالنے کے خط میرے پاس ہوتے تو ہم ڈاک خانے میں جاتے جوڑی مجھے دلچسپی سے لیٹر بکس میں خط ڈالتے دیکھتا۔ ڈاک خانے سے ہم اپنے پرانے جامعہ کے کھیل کے میدانوں میں سے چلتے اپنی حویلی تک پہنچ جاتے۔ جامعہ کی کنگوروں پیازی گنبدوں والی عمارت اب گورنمنٹ ہائی سکول بنی ہے اور ہاسٹل اے کی چوکور عمارت جس میں ہم ہاسٹل کے مانیٹر احمد شاہ سے اس کی تازہ بتازہ نظمیں سننے جایا کرتے تھے۔ وہاں اب گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹ ہے دیواروں پر کالی سیاہی سے اس طور کی عبارتیں اردو اور انگریزی میں رقم ہیں "سلامتی کی ایک ہی راہ الجہاد الجہاد روس کو کچل دو"۔ ملک صاحب تم یہاں پڑھے نہیں اس کا حال تم کو بتانے سے فائدہ! تم کو دلچسپی ہو تو اپنے رفیق اور غمخوار اور ہم مکتب احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں میں نے یہ سارا رونا رویا ہے ان کے پاس جا کر اس میرے خط کو دیکھو۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا اور کیا رونقیں تھیں۔ ہاسٹل اے کی عمارت پر نکبت وادبار کے آثار دیکھ کر جگر میں جو گھاؤ پڑے وہ کس کو دکھاؤں جوڑی اور میں حویلی میں داخل ہوتے۔ گھر کی خادمہ جس کا نام منظوراں ہے ابھی تک اپنے چھوٹے بچے شادی کو سینے سے چمٹائے لان میں بڑی کھاٹ پر محو خواب ہوتی وہ بے چاری زندگی کے دکھوں کی ماری ہے اور بے حد لاغر اندام۔ نسوار کے نشے کی عادی چنانچہ نسوار کا ایک ڈبہ دن رات اس کے سرہانے پر موجود ہوتا ہے وہ پہر دن چڑھے جاگتی ہے اور میں اس کو نہیں جگاتا میرے بھائی کے

بچے یہاں آئے تو یا پنے بچے شادی کو گود میں اٹھائے خود ہی آن وارد ہوئی۔ چند سال پہلے میری بہن کے پاس ملازم تھی اور میری بہن کہتی ہے کہ اپنی جوانی میں سلیقے سے گھر کی جھاڑ پونچھ کرتی اور سلائی کڑھائی کے کام میں تو اتنی طاق تھی کہ محلے والیاں اس کے پاس کپڑے لے کر آتیں اور اس کی منتیں کرتی پھرتیں۔ وہیں خلل دماغ کا شکار ہوئی اور کسی کو کچھ کہے سنے بغیر یوں چھوڑ کر غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ملک صاحب منظوراں اور اس کا چھوٹا سا کاکا شادی دونوں کی باتیں لکھنے بیٹھوں تو یہ خط ختم ہونے میں نہ آئے۔ کاش میرا محسن میرا یار سحر نگار یکتا سعادت حسن منٹو زندہ ہوتا وہ اس زمانے کی ستی بادلی عورت اور اس کے چھوٹے بچے شادی کو دیکھتا تو ان دونوں کو اپنے کمالِ قصہ گوئی سے حیات دوام بخش دیتا۔ میرے پاس سعادت مرحوم کا قلم کہاں ہیں تو اس میدان میں گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہ سیکھ سکا۔

جوڑی کو پاؤڈر کا دودھ اور دو توسٹ کھلا کر میں دوپہر تک آرام کرتا۔ میرے جاگتے ہی شادی صاحب آن موجود ہوتے اور سرِ شام تک میری جان نہ چھوڑتے۔ یہ بچہ بڑا ذہین بڑا گنی ہے۔ ملک صاحب اس کی صحبت میں میں اپنے بچپن کے ایام میں دوبارہ جیتا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں پیٹر سن کی طرح ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی بڑے نہیں ہوتے اور ساری زندگی بچے ہی رہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو بڑوں کی صحبت مجھے کبھی راس نہ آئی۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہنستے بولتے میں نے سدا خود کو غیر مطمئن سا پایا۔ کس واسطے کہ مسرت قلبی کا تعلق بڑی حد تک حیرت اور معصومیت سے ہے۔

مشفق من یارِ طرحدار محمد کاظم لاہوری نے مجھے دانٹا لا کہ اور کچھ نہیں کرتے تو اپنی آپ بیتی ہی لکھ ڈالو۔ آپ بیتی خاک لکھوں کیوں لکھوں؟ آپ بیتی وہ لکھے جس نے زندگی میں کوئی معرکے سر کئے ہوں۔ دنیا جہان کی مٹی چھانی ہو۔ سترہ اٹھارہ فتنہ سامان ڈونیوں سے عشق لڑائے ہوں۔ چڑھے دریا تیر کر پار کئے ہوں اور ماؤنٹ ایورسٹ پر جھنڈا گاڑا ہو۔

بس محروم و مغموم آدمی میری زندگی میں ہے ہی کیا جو اس کے واقعات کو رقم کرنے کی زحمت مول لوں اور دوسروں کو اس سے بھلا کیا فائدہ ؟ حقیقت یہ ہے کہ لکھنے کے عمل کو مجھ سے اور مجھے لکھنے کے عمل سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ ماسوا چند خطوط کے حرام ہے جو گزشتہ ڈیڑھ دو برس میں کچھ لکھا ہو۔ قصہ و داستان ہو۔ طنز و مزاح کا مضمون ہو۔ آپ بیتی و جگ بیتی ہو۔ اس کے لکھنے کو دل چاہیئے۔ ظرافت چاہیئے۔ جوش و ولولہ چاہیئے۔ میری باسٹھ برس کی عمر۔ بازار میں جاؤ تو بہاولپور کے سائیکل رکشا والے گدی کو تھپتھپا کر کہیں "باباجی آؤ رکشا میں لے چلو"۔ اس عمر میں ادب میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی سعی لاحاصل اور بے منفعت سے بہتر ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسولؐ سے لو لگائے اور کسی سے قرض لے کر حج کا قصد کرے۔ آپ بیتی لکھو تم جو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ ہو جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ برملا اور دن دہاڑے عشق کئے ہیں یا محمد کاظم لاہوری لکھیں کہ حقیقت حال مرقوم کرنے میں یکتا ہیں اور میں ان کے دلفریب فن کا مداح اور قائل عمر بھر میں دو ہی عشق تو انہوں نے بھی کئے ہیں اور ایک کا ذکر انہوں نے مجھ سے بھی کیا تھا۔ یہ عشق انہوں نے اپنی صغر سنی میں کیا جب ان کی عمر گیارہ برس کی تھی اور ایک بیس بائیس برس کی فتنہ جہاں ڈومنی نے ان پر ڈورے ڈالے۔

ملک الشعراء رئیس المتغزلین ظہور احمد المتخلص بہ نظر لدھیانوی سے یہاں گاہے گاہے صحبت ہوتی رہتی ہے۔ اس باغ و بہار شخص کے پاس سے اٹھ کر آنے کو جی نہیں کرتا۔ پہروں اس کی شیرینیٔ گفتار کے مزے لوٹتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ بڑے ہی زندہ دل بزرگ ہیں گو خود کو کل امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور گردانتے ہیں۔ میرے علم میں وہ ایک مدت سے نیند کے عارضے میں مبتلا ضرور ہیں۔ ان کا دولت کدہ میرے مسکن سے ایک تیر پرتاب کے فاصلے پر محلہ غوث پورہ میں ہے جاؤ تو اکثر سوتے ملتے ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں گیارہ بارہ بجے دن سے پہلے نہیں اٹھتے ہیں۔ ان کو کچی نیند نہیں جگاتا۔ ان کے

کبوتروں کو دانہ کھلا کر حویلی کو لوٹ آتا ہوں۔

ملک صاحب۔ تم کیا کرتے ہو۔ محمد کاظم عید کے موقع پر لاہور سے بہاولپور آئے تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے معرکتہ الآرا مضمون "طلائی تثلیث" پر دبستانِ سرگودھا میں صفِ ماتم بچھی ہے اور وہ لوگ تمہارے ٹکڑے اڑانے کے درپے ہیں تم دل پر میل نہ لاؤ اور خم ٹھونک کر معترضین کا مقابلہ کرو۔ ان کا رویہ معقول اور راست نہیں براہین کا رد براہین سے ہونا چاہیئے۔ صاحب میں نے تم کو کام کرتے دیکھا ہے تم بلا شبہ میدانِ تحقیق کے شہسوار ہو۔ خدا تمہیں اس معرکہ میں سرخرو کرے۔

حضرت مجھے لاہور بلاتے ہیں، جلدی کیوں نہ آؤں گا؟ یہ دیکھو سردی آگئی ہے لحاف توشک کا انتظام کر لوں تو اُدھر کا رُخ کروں۔

یا رب! جب تک لاہور میں اپنے دوستانِ غمگسار اور یارانِ وفا شعار کو نہ دیکھ لوں اور ان کی ہمراہی میں گلچھرے نہ اڑا لوں فرشتۂ اجل میرے قرب و نواح میں نہ پھٹکے۔ ہائے ملک صاحب! بہت یاد آتے ہو۔ وہ لاہور کی صحبتیں میں ان کو اصل سرمایہ زندگی جانتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔ محمد کاظم کی جناب میں سلام۔ سیاح خوشدل ضمیر احمد خاں کو مجرا۔ اخوانِ عالی شان معین صاحب اور رشید چغتائی کو بندگی۔ ہماری لائق و فائق بیٹی منصورہ کو ہماری دعا کہنا۔

صبح جمعرات۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء

بابے غلام محمد کے نام ــــــ

بابا جی کرم فرمائے من! ہائے تم کو اپنے پاس سے کیوں جانے دیا۔ دروازے سے باہر تم کو کس جگرے سے کیا۔ اگرچہ جانتا تھا کہ تم کو اس حالتِ کسمپرسی اور معذوری میں سنبھالا دینے

والا کوئی نہیں۔ زبان تمہاری قوتِ گویائی سے محروم، غوں غاں کرتی، حواس مختل بخیف ٹانگیں لڑکھڑاتی۔ میں نے دو باتیں سخت کہیں، تم نے سلام علیکم کہی، اپنا چرمی تھیلا کہ جس میں کل متاعِ دنیوی رکھتے تھے، ہاتھ میں لیا اور چل دیے۔ اب کے وہ پہلے سی رسمِ مشایعت عمل میں نہ آئی کہ جب میں آپ کو گلی کے نکڑ تک چھوڑ کر آتا تھا، راستے میں اختلاط و انبساط کی باتیں ہوتی تھیں جب حضرت کی زبان کو فالج نے گنگ نہیں کیا تھا ہر دم چہکتے تھے۔ نہ جانے دوستِ دیرینہ کی اس بے رخی سے تمہارے دل پر کتنی چوٹ لگی ہوگی۔ اب تم کیوں آنے لگے۔ بھلا ادھر کا رخ کرو تو کس واسطے؟ شیوہ دوستی میں وہ چوک ہوئی کہ اب تا حیات ہاتھ ملتا رہوں گا یا در کھیے گا کہ انگاروں پر گویا بعض اوقات میں لوٹتا ہوں اور جب تمہارے جانے کی تصویر آنکھوں میں بھرتی ہے تو خون کے آنسو روتا ہوں۔ ہائے میرے یار رنجش لے کر تم نہیں گئے بلکہ میرے روبرو بینائے دل چکنا چور کر کے بر ملا رخصت ہوئے۔ میں کم نصیب، تیرہ بخت، تمہارے پیچھے نہ گیا۔ تم کو جانے سے نہ روکا — اور اب میں تمہاری راہ زندگی بھر دیکھتا رہوں گا، پر میرا دل جانتا ہے کہ تم آؤ گے نہیں۔ پھر اُس دہقانی صافے، میلے بھورے کوٹ اور چادر میں ملبوس دبلے چھریرے دوست پر میری نگاہیں نہیں پڑیں گی۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

رٹھڑے یار کدیں منیندے ان

(روٹھے ہوئے یار بھلا کبھی ملتے ہیں)

اور یہ مصرع کتنا درست ثابت ہوا ہے۔

تمہارا پتہ بھی میرے پاس نہیں۔ خط کہاں لکھوں؟ دو تین مقامات کے پتے کہ وہاں تم کچھ مدت اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے پاس رہے تھے، تم نے کبھی مجھ کو لکھوائے تھے۔ وہ اب میرے پاس موجود نہیں۔ تمہارا فرزند جو کراچی میں نوکر ہے اس کا پتہ بھی تم نے بتایا تھا اور میں نے اس کو اپنی یادداشت کی ڈائری میں لکھا تھا، پر جب اُس کو اگلے روز کونوں کھدروں میں

ڈھونڈا تو وہ نہ ملی۔ بابا گامے صاحب! وہ تمہارے ذہن کی جودت اور تیزی میں کہاں سے لاؤں کہ نعمتِ خداوندی ہے اور یہ نعمت صرف آدمیت سے بہرہ مند کو عطا ہوتی ہے۔ یہاں ایامِ شباب سے، حواس کا یہ عالم رہا ہے کہ کوئی نام، کوئی پتا، کسی کا ٹیلی فون نمبر، یہاں تک کہ محبوب کی حویلی کا کوچہ تک، حافظے میں نہیں رہتا۔ پہلے پتے اگر دستیاب ہو بھی گئے تو بھی بے کار ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ تم نہ اپنے بیٹے کے پاس پہنچے ہو گے، نہ کسی اور عزیز کے پاس تم سڑک پر اپنی راہ، تنہائی میں چلتے چلتے، اُفق سے پرے، کہیں دور جا پہنچے ہو، سب کی دسترس سے باہر۔

سو حضرت یہ فرمایئے کہ حکیمِ افرنگ شیکسپیر رحمتہ اللہ علیہ نے جو یہ کہا ہے کہ "حیاتِ انسانی احمق آدمی کا سنایا ہوا قصہ ہے، شور و غضب و کڑک سے پُر، جس کا مطلب کچھ بھی نہیں"، تو کیا یہ واقع میں سچ ہے؟

حضرت یاد کیجئے گا۔ بیس سال پہلے کنارِ صحرا پر ایک بستی موسوم بہ چشتیاں شریف میں تم سے ہماری صورت شناسی ہوئی۔ میں یہاں سرکار کی طرف سے بجلی گھر بنانے کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔ تم میرے پاس میرے والد کے ایک جاننے والے کا سفارشی رقعہ لے کر آئے تھے۔ تب پچاس پچپن کے پیٹے میں ہو گے۔ جسم کسرتی گٹھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ سیاہ رنگت کی گول ٹوپی سر پر اور شلوار قمیص زیبِ تن۔ آپ کے بولنے کا بے باک مبنی تکلف انداز مجھے بھایا اور میں نے آپ کو ساٹھ روپے ماہوار مشاہرے پر بجلی گھر کا چوکیدار رکھ لیا۔ آپ گیٹ پر چھوٹی سی بیٹن نما سوٹی لئے مستعد اور چاق و چوبند کھڑے ہوتے اور آتے جاتے مال کا محاسبہ کرتے۔ جب آپ پہرے پر ہوتے تو گیٹ سے باہر بغیر گیٹ پاس کے گودام کا مال اہلِ جنات یا ملائک ہی لے جا سکتے کہ نظر نہیں آتے۔ کسی بشر کا ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اصول اور ضابطے کے پکے جتنے تم تھے میں نے اور کوئی نہ دیکھا۔ گیٹ پاس نہ ہوتا تو میرے کہنے پر بھی اکڑ جاتے اور کہتے صاحب، پہلے گیٹ پاس بنا، پھر مال یہاں سے گزرنے دوں گا۔ ایک دو بار میں جھلایا بھی

بہت کہ عجب خبطی آدمی ہے۔ یہ بھی یاد کیجئے گا کہ ایک بار میں نے گودام کی پڑتال میں تیل کے پانچ کنستر درج مقدار سے کم پائے۔ تم سے پوچھا تم بولے کہ تمہاری موجودگی میں تو باہر گئے نہیں۔ میں نے تم سے غصے میں نہ جانے کیا کہا کہ تم روٹھ گئے اور صاحب اپنی نوکری رکھو، میں جاتا ہوں کہہ کر تم سڑک پر چل کھڑے ہوئے۔ مجھ کو اپنی زیادتی پر پشیمانی ہوئی کہ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تمہارے پیچھے بھاگا اور جانتا ہوں کن کن منتوں سے تمہیں منا کر واپس لایا۔ چشتیاں میں ہماری راہ و رسم زیادہ نہ بڑھی۔ وہاں سے تبدیل ہو کر میں خانپور آیا۔ پھر لاہور پہنچا اور آٹھ سال وہاں رہا۔ لاہور سے بدلی حیدرآباد ہوئی۔ دو سال کے قیام کے بعد پھر لاہور۔ جہاں کہیں بھی میرا آب و دانہ مجھے لے گیا، آپ گاہے گاہے اپنا تھیلا اٹھائے میری ملاقات کو آ نکلے۔ چشتیاں سے میرے جانے کے بعد آپ کا جی وہاں نہ لگا۔ بی بی آپ کی ہندوستان ہی میں مر چکی تھی۔ ایک لڑکا تھا، وہ عزیزوں کے پاس لیہ کے اسکول میں داخل تھا کیونکہ چند بیگھے مزروعہ چشتیاں میں رکھتے تھے۔ مگر بھلا وہاں جم کر کیونکر بیٹھتے۔ بعض طبائع میں خداوند تعالےٰ نے جہاں نوردی اور گریز پائی اس طور بھری ہے، کہ ایک جگہ ان کا ٹکنا محال اور سیر و سفر ان کا مقسوم ہے اور "آزاد بزی، آزاد بمردی" ان کا شعار۔ کوئی مکان نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں، مال اسباب نہیں کل متاع چند کپڑے اور ایک بوسیدہ کاپی قبلہ تم نے بھی غور کیا اپنی خوش بختی پر۔ میں گمان کرتا ہوں کہ راہ گزر دنیا میں اصیل انسان ہلکا سامان لے کر سفر کرتے ہیں حقیقت میں بخششِ خداوندی اسی کو کہتے ہیں اور مبدءِ فیاض نے آگہی سے ایسوں ہی کو نوازا ہے۔ کارڈ آپ کے کسی رفیق سے لکھوائے ہوئے اطراف و جوانب سے آتے رہتے۔ جب خود آ نکلتے تو بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ اپنی جہاں گشتیوں کا احوال سناتے۔ اس فقیر کی گزراوقات سنتے۔ اگرچہ مطلق ان پڑھ تھے۔ مگر آپ کی گفتگو دیہاتی چٹکلوں اور ظرافتِ خلقی سے معمور، مزہ دے جاتی۔ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر پھر اپنی سیاحت پر نکل پڑتے۔ دو تین ماہ صورت نظر نہ آتی۔ میں بھول جاتا۔ کبھی خیال آتا کہ بابا غلام محمد خدا جانے کہاں ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اُس روز نہیں تو اگلے

روز تمہاری زیارت ہو جاتی۔ سچ ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

بھاگ دوڑ کر کے لڑکے کو کراچی میں ملازمت دلوائی۔ اس کی کتخدائی میں سرگرم ہوئے۔ جب وہ گھر بار والا ہو گیا تو آپ فرائض دینوی سے گویا سبکدوش ہو گئے۔ کاروبار دنیا کی دیگر ہتھکڑیاں اپنے ہاتھوں سے اتار، بالکل آزاد مردِ دین گئے۔ مجھ سے البتہ آپ کی محبت اس نوع کی تھی جیسے فرزند سے ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جب کبھی میں کچھ زادِ راہ حضرت کو نظر کرتا تو اکثر انکار کر دیتے اور کہتے کہ صاحب میرے پاس ہے، فکر نہ کرو۔

سیر چشمی اور خودداری تم میں بہت تھی۔ گلہ ہے جب تنگی ہوتی تو بلا تکلف مجھ سے پانچ دس روپے لے لیتے اس طرح جیسے کوئی اپنے سے لیتا ہے۔ غیر کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا۔ کیسا ملکہ خداداد آپ کی ذات میں تھا۔ راہ چلتوں سے، اپنی بے تکلف اور بے جھجک باتوں کے ذریعے، شناسائی پیدا کر لیتے۔ وہ آپ کو، اجنبی جگہ میں اصرار کر کے گھر لے جاتے۔ کھانے کو روٹی اور اور سونے کو بستر دیتے۔ خود جو دل کے صاف اور کھرے تھے، اس سرائے حیات میں اجنبی بن کر نہ رہے اور نہ ہی ہم جنسوں کی رفاقت اور ہمدمی سے محروم ہوئے۔

والد مرحوم سے تمہاری پہلی ملاقات مزیدار تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ موٹر میں رحیم یار خان سے گزرتے تھے۔ موٹر انہوں نے ایک جگہ کسی کام کے واسطے رکوایا۔ تم بازار میں ادھر سے جاتے تھے۔ میرے والد کو دیکھ کر، کندھے پر رکھے بقچے سمیت، لاٹھی سمیت، ان کے پاس پہنچے اور جھٹ سلام علیکم کہا۔ وہ حیران ہوئے اور پوچھا "بابا کیا کام ہے؟" آپ نے کہا "مولی صاحب میرا نام بابا غلام محمد ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے کہا "خانپور۔" تم بولے "تو مولی جی مجھ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجھ کو بھی خانپور میں کام ہے۔" میرے والد نے کام پوچھا، تم نے کہا "مجھ کو خالد صاحب کے پاس جانا ہے۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ خالد کو تم کیونکر جانتے ہو؟ اور پھر خوش ہو کر کہ بیٹا باپ سے مختلف نہیں، تم کو ساتھ بٹھا لیا۔ خوب جانتا ہوں کہ راستے بس تم نے اپنی باتوں سے ان کے دل میں کتنا گھر کر لیا ہو گا۔ میرا باپ بھی

سچا اور کھرا آدمی تھا۔ تم موٹر میں سوار، خانپور، میرے مکان کے پاس اترے اور کس انبساط سے یہ سارا واقعہ مجھ کو سنایا میرے باپ کے مرنے کے بعد اس ملاقات کا حال میں اکثر تم سے سنا کرتا۔ ہائے اس میں کتنا مزہ ملتا تھا۔

لاہور میں چھ مہینے بعد یا برس دن بعد تم اپنی شکل دکھاتے۔ آنا تمہارا میرے لئے وہ کرتا جو بارۂ ابر کشتِ خشک کے لئے کرتا ہے۔ میں سمجھتا تھا شوقِ دیدار میں دلوانہ وار پہنچتے ہو، اپنا جان کر آتے ہو گھڑی دو گھڑی میرے پاس بیٹھتے اور تمہاری مہرانگیز اور محبت آمیز باتیں غمِ روزگار بھلا دیتیں حضرت، یا مردہ دلی کی بات تم سے سنی نہیں۔ اگرچہ خواندہ نہیں تھے سخنوری و سخن دانی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر شیریں گفتار ایزدِ توانا سے بخشش ہوئی تھی۔ بے تکان بولتے تھے اور تمہاری گفتگو، اہلِ پنجاب کی دہقانی ذکاوت سے معمور تھی، عجب مزہ دیتی تھی۔ بیسیوں ضرب الامثال، بیت ٹپے ازبر تھے۔ اپنی مہر و وفا کی باتوں سے میری ہمت بندھاتے۔ اس فقیر کی رنجوری پر سخت مشوّش ہو جاتے اور اس کے تدارک کی فکر بطریقِ عمل کرتے۔ ہائے ہائے، کیا میں تمہاری شفقتوں کے قابل تھا!

اکثر مجھ کو خیال آتا تھا کہ میرا دوست کیا کھاتا پیتا ہے۔ کیونکر جیتا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ آپ نے کبھی اپنی بے نوائی، جفاکشی کا رونا میرے روبرو رویا ہو۔ باباجی! آپ اہلِ توکل، اہل اللہ تھے۔ دنیائے دوں پر پشت مارے ہوئے۔ فقیری و سبک بسری میں شاد۔ نہ پاسِ ناموس و عزت، نہ حبِ جاہ و مرتبہ۔ نہ کسی سے لینا نہ دینا۔ دن رات میں دوبار نان ملا، بہت خوش۔ ایک بار ملا، بہر حال خوش۔ خودداری و استغنیٰ کے پیکر تم تھے۔ لاہور میں ایک دفعہ آپ نے مجھ سے فرمایا "صاحب، تیرے پاس کوئی بیگ ہو تو مجھ کو دے دے۔ اپنے دو تین جوڑے کپڑے اس میں رکھ لیا کروں گا۔" میرے پاس گھر پر اس قسم کا ہینڈ بیگ کوئی نہ تھا جیسا کہ آپ کو درکار تھا۔ میں نے دس پندرہ روپے آپ کو اس خاطر دیے۔ دوسرے روز آپ غم خانے پر مجھے ملنے تشریف لائے تو گٹھڑی کی بجائے ہاتھ میں نیا نویلا ہینڈ بیگ لٹکائے تھے اور خوشی

سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اس کی خرید کی حکایتِ دلنواز مجھ کو سنا کر باغ باغ کیا۔ اس ہینڈ بیگ سے عمر بھر وہ رفاقت نبھائی کہ کیا کوئی اپنے یارِ جانی سے نبھائے گا۔

جب میں راندۂ درگاہِ ایزدی تبدیل ہو کر حیدرآباد سندھ میں جا پڑا۔ آپ مجھ کو بھولے نہیں پانچویں چھٹے مہینے رنجِ سفر اٹھاتے کوسوں دور اپنے دوست کو ملنے آ پہنچتے۔ قسم کھاتا ہوں، تمہارا آنا میرے لئے نویدِ ہزار گونہ ہوتا۔ تم سے مل کر تسلیِ خاطر اور تسکینِ دل کا سامان ہو جاتا۔ ایک دو روز رہ کر کوچ فرماتے۔ بے رونق اور تباہ مجھ کو چھوڑ جاتے۔ ایک دفعہ البتہ آپ نے دس بارہ روز توقف کیا اور وہ دن اب یاد آتے ہیں۔ گیراج میں کھاٹ پر پڑے رہتے۔ کچھ کھا لیا، کچھ پی لیا۔ شام کو ہم اکٹھے سیر کرتے۔ کیا اختلاط و انبساط کی صحبتیں ہوتی تھیں۔ ان اوقات میں دنیا کے سب دکھ مٹ جاتے تھے۔ نہ اندوہِ ناکامی، نہ فکرِ عقبیٰ۔ بس یارِ غمگسار سے ہمکلامی کے مزے! وہاں آپ نے ایک بار فرمایا "صاحب! میرا دل تیرے پاس بہت لگتا ہے، اتنا کہیں اور نہیں لگتا۔ چاہتا ہوں تمہارے پاس رہ جاؤں"۔ آپ کو اپنے پاس رکھنا آپ کا میرے ساتھ رہنا، ممکن نہ تھا۔ اور آپ یہ خوب جانتے تھے۔

اس ہماری دس بارہ سال کی دوستی کے عرصے میں وقت نے اپنا کام کیا۔ پینسٹھ، چھیاسٹھ برس کی عمر کو تم پہنچے اور کسی مہربان کے در پر بوریا بچھا کر عافیت کے آرزومند ہوئے۔ آخر کب تلک کوئی سڑک کاٹے کب تلک صعوبتِ سفر جھیلے۔ دماغ میں خرافت آگئی اور کیوں نہ آتی، بوڑھے آخر کو ہو چلے تھے۔ وہ گٹھا ہوا تنو مند بدن اب تحلیل ہو گیا تھا۔ حرارتِ غریزی کو زوال آنے لگا تھا لیکن اب بھی جوانوں سے زیادہ تندرست اور چاق و چوبند تھے۔ بینائی و سامعہ میں فتور نہیں تھا۔ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ لرزہ، نہ گنٹھیا، نہ اسہال، حافظہ قائم و دائم بلکہ اتنا تیز کہ حیرت ہوتی تھی۔ اپنی لاٹھی اور ہینڈ بیگ کے ساتھ دس پندرہ کوس پا پیادہ چلنے کو کچھ نہ سمجھتے۔ چھریرے، چھیل چھبیلے اور زندہ دل اب بھی تھے۔ اس عمر میں راحت اور سکون کی خواہش کرنا البتہ عین تقاضائے فطرت تھا۔

اس فقیر کا آب و دانہ اس کو ملتان شریف میں لایا اور تا حال یہ شہر اس کی جائے مشقت ہے۔ یہاں بھی حضرت بارہا کلیۂ احزان یا دفترِ محکمہ میں مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ چند باتیں اِدھر اُدھر کی ایسی کرتے کہ جن سے محبت ٹپکے اور رنجوریٔ دل رفع ہو اور پھر لاٹھی اور بیگ سنبھال اپنی راہ پکڑتے ہیں نے حضرت سے کبھی نہ پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو اور کدھر کو جاتے ہو۔ آپ کے کچھ عزیز، قرابت دار مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں بستے تھے۔ پانچ روز ایک کے پاس قیام فرماتے تو دس روز دوسرے کے ہاں ٹکتے۔ مگر جہانیاں جہاں گشت شخص کو ایک جگہ قرار کہاں۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت میں موج اٹھتی اور بسبیل ریل ولاری کسی اور آبادی کا قصد کرتے۔ چونکہ آتے جاتے ملتان شریف راہ میں پڑتا تھا اور مجھ سے محبتِ قدیم تھی اس لئے مہینے میں ایک بار یا دو بار اس شہر میں توقف کرتے۔ پل موج دریا کے پاس آپ کے کوئی عزیز رہائش پذیر تھے۔ ان کی حویلی میں اُترتے اور مجھ سے ملنے اور احوال پوچھنے آجاتے۔ ایک دفعہ حضرت میرے ہاں بھی چندروز کے واسطے ٹھہرے اور خدمت گزاری کا موقع فقیر کو دیا۔ مگر یہاں حالات سازگار نہیں تھے۔ میری بی بی کو آپ کی ذاتِ والاصفات سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ اس اللہ کی بندی کو تمہاری صورت دیکھتے ہی غش آجاتا اور اوسان خطا ہو جاتے۔ تم بھاگ دوڑ کر کے بازار سے سودا سلف لاکر اس کے دل میں گھر کرنے کی سعی لا حاصل کرتے۔ وہ تم کو بوڑھا اور خفقانی جان کر کوسنے دیتی اور تمہاری شوریدہ، نصیحت آمیز باتوں سے اس کے ناک میں دم آجاتا۔ دراصل میں سوچتا ہوں، اس فقیر کی طرح حضرت کی بھی عورتوں سے کبھی بنی نہیں۔ ان کے خوش کرنے کے ڈھنگ تم کو آتے نہیں۔ قادرِ مطلق نے دردمندی کے جذبے اور وسیع القلبی کے وصف سے ان کو محروم رکھا ہے۔ نہ استغنیٰ، نہ خدا ترسی، نہ رحمدلی، نہ توکل۔ حسد و رقابت، حرص و آز، جور و ظلم اور اذیت کوشی ان کے خمیرِ خلقت میں گندھے ہوئے ہیں۔ بہرحال ایک اور بیگم بہاولپور میں ایک بڑی حویلی میں رہتی تھی۔ اس کا خاوند ریاستِ بہاولپور میں اعلیٰ افسر تھا۔ تمہارا اس سے یارانہ تھا اور تم اس گھرانے میں ایک قرابتی معتبر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ گھر کے معمولات

روزمرہ میں تم کو دخل کامل تھا۔ صاحب تم کو اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھلاتا اور تمہاری بے تکلفانہ کھری باتوں سے محظوظ ہوتا۔ تم حسبِ معمول ہر معاملے میں اسے اصلاح و مشورہ دینے سے نہ چوکتے۔ اس کی بیگم بھی تم پر مہربان تھی اور تمہاری کافی کا کہنی، دربانی سے خوش۔ روٹی اتنی ہی کھلاتے تھے جس سے کنجشک فرومایہ کا پیٹ بھرے۔ جب تمہارا دوست فالج سے مرگیا تو حالانکہ خاندان کے خادمِ دیرینہ تھے مگر اس گھر میں تمہارا دل نہ لگا۔ بیگم نے منہ پھیر لیا۔ تم خوددار آدمی بھلا وہاں کیونکر ٹکتے۔ بستر بوریا باندھا اور چلے آئے۔ بعد میں کبھی کبھار بیگم کو ملنے بہاولپور جا نکلتے۔ وہ سخت رکھائی سے پیش آتی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ وہ شہر ہی چھوٹ گیا۔ حضرت، میں حیران ہوتا تھا کہ آپ نے ہماری دوستی کے عرصہ پندرہ سال میں دنیا جہان کے قصے بیان کئے لیکن ایک دفعہ بھی اپنی بی بی مرحومہ اور اپنی کتخدائی کا ذکر تمہارے لب پر نہ آیا، جیسے نہ کبھی دولہا بنے، نہ اولاد پیدا کی۔ آپ کے حافظے میں یہ شگاف میرے لئے اچنبھا رہا۔ اور اب سمجھا ہوں کہ بات کیا تھی۔ اُس بی بی سے بھی غالباً بھاگے تھے۔ ایک بار آپ اپنے بیٹے اور پوتوں، پوتیوں کو دیکھنے کراچی گئے۔ تمہارا بیٹا وہاں کسی محکمے میں ملازم تھا۔ کورنگی میں اس کے کوارٹر میں چار پانچ مہینے مستقل بھٹھرے رہے۔ بیٹے نے حتی المقدور جو خدمت واجب تھی اس کے کرنے میں کسر نہ کی۔ پر وہ اپنی بی بی کا غلام بے دام تھا اور اس کی خاطر اس کو بڑی عزیز تھی۔ بی بی کو آپ کی جو کسی ہر بات میں چخ چخ، بزرگانہ نصیحت اگر بری لگی تو اس میں اُس بے چاری کا کوئی قصور نہ تھا۔ آپ ٹوکتے، ہر معمول میں دخل دینے سے کیوں کر خود کو روکتے کہ یہ آپ کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ اور بالخصوص اپنے بیٹے کے گھر میں حکم چلانا آپ اپنا حق سمجھتے تھے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ جب آپ نے اس بی بی کی تنگ مزاجی اور ڈھٹائی اور عدم توجہی سے دق ہو کر کراچی سے مراجعت کی ہوگی تو اُس نے کلمہ شکر ادا کیا ہوگا۔ اڑوس پڑوس میں شکرانے کی ریوڑیاں بانٹی ہوں گی۔ آپ اکثر اپنے بیٹے کی تعریف کیا کرتے اور فرماتے کہ اس کو بی بی اچھی نہیں ملی۔ اس کے سلوک کا سوچ کر اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ دو تین دفعہ اس کے بعد بھی آپ ایک دو ہفتے، بچوں

کے ساتھ رہ کر لوٹے۔ آپ کی بہو، بیٹے کی بی بی، رشتے میں ہمشیرہ نسبتی کی بیٹی، آپ کی جان کی دشمن ہوئی آپ کی بلا سے۔ دنیا آپ کے آشناؤں، دوستوں، قرابتیوں سے بھری پڑی تھی۔ لاری میں، ریل میں، سڑک پر، اپنی بے جوڑ، بے غرض، علیک سلیک سے مسافروں اور راہ چلتوں سے قرب حاصل کر لیتے اور دلی کے مرزا غالب کی طرح، بیسیوں اشخاص تھے کہ جو بلے غلام محمد کی رفاقت کا دم بھرتے۔ اس عالمِ فانی کے میلے میں دلجمعی اور فراغ خاطری سے سیر کرتے چہکتے پھرتے اور کسی قریے یا کسی گاؤں میں اپنے کو اجنبی نہ پاتے۔ دل کے غنی تھے، طبیعت میں استغنیٰ تھا اور خودداری کمال۔ کسی شخص کو مبدگاہ نہ بنایا۔ لہٰذا اپنے یاروں کے سامنے نہ پھیلایا۔ واللہ باللہ! حضرت کی قوتِ مشاہدہ و تجسس اپنے ہم نفسوں کے بارے میں اتنی سرگرم و بیدار تھی کہ حیرت ہوتی۔ پڑھے لکھے ہوتے تو جاسوسِ افرنگ شرلاک ہومز صاحب کے ہم پلہ ہوتے۔ بلکہ وہ غریب آپ کے روبرو پانی بھرتا نظر آتا، تلمذ کرنے کی آرزو کرتا۔ تین چار دفعہ آپ نے محلہ شمس آباد میں غم کدے پر قدم رنجہ فرمایا۔ کبھی دو دن قیام کیا کبھی چار دن۔ اس اپنے قیامِ مختصر میں محلے اور اس کے مکینوں کے معمولات آپ کے پیشِ نظر رہتے۔ اس مکان میں فلاں رہتا ہے، فلاں دفتر سرکار کے فلاں عہدے پر فلاں کے چار بھائی ہیں۔ بی بی ہسپتال میں حالتِ زچگی میں پڑی ہے۔ اس کوٹھی میں صاحب کی جوان بیٹی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مجھ کو یہ احوال دفتر سے لوٹنے پر سناتے اور میں چڑ جاتا۔ میں کہتا "بابا غلام محمد، تم کو یہ کھوج لگانے، کرید کرنے کی عجیب عادت ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔" تم کچھ جھینپ کر کہتے "صاحب، تو سچ کہتا ہے۔ تُو اپنی نبیڑ، تینوں دوجے نال کی" اصل میں آپ کے معمولات، آپ کی کارگاہِ ہستی میں دلچسپی، عوام الناس سے اصلی محبت کی بدولت تھیں۔ ہر کسی سے ملتے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، اور وہ آپ کو مونسِ شفیق و بے ریا پا کر اپنی سرگزشتِ حیات معروض کر دیتا۔ فقیر کی کچھ مزروعہ زمین رحیم یار خاں کے ضلع میں ہے کسی فصل پر چار پیسے آ جاتے۔ کوئی فصل خالی جاتی۔

منشی وہاں مختارِ کل تھا غلط سلط حساب مجھ کو بتا کر آمدنی خورد برد کر جاتا۔ مجھ کو اس بات کا علم تھا سو میں نے آپ کو اُس منشی پر نگاہ رکھنے اور کٹائی کی نگرانی کرنے کے لئے روانہ کیا۔ ایک ماہ بعد آپ لوٹے۔ ذہن میں کاشت کا نقشہ۔ ہر ایک جنس کی بیافت، نرخ اور ممکل بھی کھاتا گویا لئے ہوئے ہر مزارع کے پورے کوائف، اگلا پچھا، کہ کون ذات ہے، کہاں سے آیا، کاہ کردگی کیسی ہے، وضع قطع، چال ڈھال، اولادوں کے نام، عمریں، اشکال، آپ کے دماغ کی تختی پر گویا چھپے ہوئے تھے۔ کل حال وہاں کے جوتنے بونے پانی دینے کا مجھ کو مع اعداد و شمار سنایا۔ میں حیران کہ بابا غلام محمد اولادِ آدم ہے یا اہلِ جنات سے ہے۔ آدمی کا یہ مقدور نہیں کہ اتنی باتوں کا سراغ لگائے اور ان کو حافظے میں تازہ رکھے۔ منشی کے کرتوتوں کا وہ کچا چٹھا کھولا کہ میں نے سوچا ایک داستانِ عظیم اس کے بارے میں لکھ کر اور اسے بہر طور چھپوا کر دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دوں اور اس کی رونمائی کا جلسہ عام برپا کر کے اپنا سکہ ہر سخن شناس سے منواؤں۔ کشورِ داستان طرازی کا تاجِ درخشاں سر پر دھروں۔ پر ہائے، بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

قصے تو اور بھی بہت سے تمہارے، میرے دل نشیں ہیں۔ مگر کہاں تک ان کا اعادہ کروں، کس کس کو خانۂ یادداشت سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر بٹھاؤں۔ مکالمت تمہاری کا لطف و ڈھنگ یاد ہے اور باتیں جو ہمارے تمہارے درمیان پہروں ہوتی تھیں، حافظے پر زور ڈالنے پر بھی میں ان کو تازہ نہیں کر پاتا ہوں۔

سنو حضرت، اب اس سانحۂ عظیم کا آغاز و انجام، جو موجب اس بے ربط و لاحاصل طویل الکلامی کا ہوا ہے۔

سالِ گزشتہ کی بات ہے جلیٹھ اساڑھ کے دن۔ دھوپ آگ سے زیادہ تر تیز، صورتِ قہرِ الٰہی۔ میں دو بجے دوپہر دفتر سے لوٹا۔ موٹر گیراج میں کھڑا کر کے اندر آیا تو آپ برآمدے میں کھاٹ ڈالے بیٹھے تھے۔ ہماری ملاقات کو ایک مدت ہو گئی تھی اور میں آپ کی صحت کے بارے میں مشوش تھا۔ یعنی یہ کہ جیتے ہو یا خاموشی سے چل بسے۔ میں نے مطابق معمول

کے السلام علیکم کہی اور پوچھا، بابا غلام محمد کیا حال ہے کیسے آئے، اتنی مدت کہاں غائب رہے۔ تم نے مطابق معمول کے اپنی جہاں گشتی کی حکایت نہ چھیڑی، نہ چہکے، نہ بولے، بس گم سم صورتِ ملول وافسردہ، منہ کا دہانہ ایک طرف کھنچا ہوا، آشفتہ حال، متوحش لال آنکھوں سے مجھے تکتے تھے۔ میں نے جانا ہائے غلام محمد کو کچھ ہو گیا۔ دوبارہ احوال پوچھا۔ تم نے کھڑے ہو کر لڑکھڑاتی زبان میں کچھ غوں غاں کی، بانہ لہرا لہرا کر ادائے مطلب کی کوشش کی مگر میں کچھ نہ سمجھا۔ اپنے دل میں ڈرا کہ الہیٰ خیر ہو۔ اس گھر میں یہ پیرِ خرف بستر مرگ پر لیٹا تو کون اس کو سنبھالے گا۔ کون اس کی تیمارداری کرے گا۔ میں نے تمہاری دلجوئی کے لئے کہا "بابا غلام محمد کوئی بات نہیں ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ دماغ میں گرمی نفوذ کر گئی ہے۔" دل کہتا تھا کہ عارضہ معمولی نہیں۔ سن سٹروک، یا لقوے کی صورت ہے۔ تم نے بے چارگی اور مایوسی میں میری طرف تاکا اور اپنے سر کو نفی میں ہلایا۔ میں نے تکیہ وچادر لاکر دیا۔ تم نے ہتھیلی کی اوک بنا کر اور اس کو دہانے کے پاس لے جا کر بتایا کہ پیاس لگی ہے۔ میں نے گلاس بھر آبِ سرد پلایا۔ تم ٹھنڈی آہ بھر کر کھاٹ پر دراز ہو گئے۔ ہائے طاقتِ گویائی یوں چھن جانے پر تمہارے دل پر کیا کیفیت گزرتی ہوگی۔ عندلیب خوش الحان، ہزارداستان کی زبان کوئی کھینچ لے اور اس کی نغمہ سرائی گھٹ جائے تو اس کا ایسا حال ہوگا۔ میں نے اندر آکر اپنی بی بی سے ذکر کیا کہ اغلباً بابے کو لقوہ یا فالج ہو گیا ہے بے چارہ بول نہیں سکتا۔ وہ اس بوڑھے کے یوں ٹپک پڑنے پر پہلے ہی جلی بھی بیٹھی تھی۔ خفگی کے لہجے میں بے اعتنائی سے بولی "کچھ نہیں ہوا۔ گرمی لگ گئی ہوگی۔" میں چپ ہو رہا۔ میری بی بی کے لئے تمہارا وجود بلائے جان تھا اور تمہاری موجودگی اس گھر میں لعنت۔ جیسے اہلِ ہنود کے مندر یا پاٹھ شالے کی دہلیز پہ کوئی ملیچھ شودر آجائے۔ چار پانچ بجے میں نے تمہاری خبر لی۔ تم نے غوں غاں اور حرکات سے یہ بات مجھ تک پہنچائی کہ نہانا چاہتے ہو۔ چنانچہ دوسرے صحن میں نلکے کے نیچے کپڑا باندھ کر ٹھنڈا پانی تم نے اپنے سر اور پنڈے پر ڈالا۔ کچھ اس سے طبیعت تمہاری بحال ہونے لگی۔ میری بی بی تمہارے وہاں

نہانے پر بسیج پا ہو گئی۔ مجھ پر بگڑنے لگی کہ نلکے کی حوضی تم نے ناپاک کرائی۔ بچوں کو بیماری لگ جائے گی۔ حوض کو رگڑ رگڑ کر منجھوانا پڑے گا۔ میں اس نیک بخت سے کیا کہتا کہ بابے غلام محمد سے زیادہ بدن کی صفائی رکھنے والا کون آدمی ہوگا۔ تم کو روز غسل کرنے کی عادت تھی۔ نہ کہ اس فقیر کا حال کہ ہفتوں گزر جائیں مگر پانی کی چھینٹ تنِ میل خوردہ پر نہ پڑے۔ واہ تم کتنے صاف ستھرے تھے۔ بابے اِگو کبھی جائے نماز پر بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہوتے میں نے تم کو نہ دیکھا۔ وردِ اسمائے الہیٰ و نبوی میں کبھی محو نہیں ہوئے اور میں تمہاری اس برگشتگی پر تعجب کرتا تھا۔ قیاس لگاتا ہوں کہ کسی واقعے سے یہ گرہ تمہاری طبیعت میں پڑی تھی یا شاید تم اہلِ تصوّف کا شیوہ اختیار کئے ہوئے تھے کہ جو ظواہرِ مذہبی سے بے پروا اور لا تعلق رہتے ہیں۔

رات کو میں تمہاری روٹی لے کر آیا۔ تم نے کچھ کھائی اور لیٹ گئے۔ صبح میں باہر کے صحن میں اخبار اُٹھانے گیا اور ابھی دن نکلا نہیں تھا کہ تم صافہ سر پر رکھے، بیگ ساتھ دھرے تیار بیٹھے تھے۔ قوتِ ناطقہ پر تصرّف لوٹا نہیں تھا، مگر ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ تم بولے۔ مجھ کو گونہ اطمینان ہوا کہ رفعِ مرض کے آثار ہیں۔ تب ہی تم نے کسی طور مجھ کو وقوعہ اس عارضے کا بتایا۔ لاری سے اتر کر بھلے چنگے تندرست غم خانے کو پیدل آتے تھے۔ یہ تین کوس کا فاصلہ ہے آسمان سے آگ برستی تھی۔ عیدگاہ موڑ سے محلہ شمس آباد کو جانے کے لئے مڑے تو وہاں ناگہانی یہ بجلی گری۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا، ٹانگیں لڑکھڑائیں، وہیں بیٹھ گئے اور پھر گرتے پڑتے گھٹتے کسی طور یار کی حویلی پر پہنچے۔ تم جانے لگے تو میں نے نہ روکا۔ تمہارے فرزندِ روحانی ہونے کی وجہ سے مجھ پر واجب تھا کہ تم کو موٹر میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ مجھ نابکار نے تردّد نہ کیا۔ اپنے کوچے کے موڑ تک تمہاری حسبِ دستور رسماً متابعت کی۔ بیس روپے زادِ راہ کے لئے دے۔ میں نے کہا "اچھے ہو جاؤ گے"۔ تم نے مایوسی اور شکستہ دلی سے سر ہلایا اور آنکھیں نم کیں۔ اتنے بھولے تم کب تھے جو یہ نہ سمجھے کہ تم سے پیچھا چھڑاتا ہوں۔ ہائے، ہائے!

محبت پرستی اور دردمندی سے کورا نکلا۔ رسم دوستی نبھانے سے پہلو بچایا۔ جب تم مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنے سفر پر روانہ ہوئے تو تمہارے چہرے پر رنج و ملال تھا۔ آنکھوں میں دفترِ شکوہ و شکایت۔ میں تم کو کچھ دیر جاتے دیکھتا رہا پر تم نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ نہ ہی الوداعی صاحب سلامت کی لاٹھی لہرائی۔

میں نہیں کہتا کہ اپنی اس شقاوتِ قلبی پر میں نے خود کو مجرم نہیں گردانا یا میرے دل نے ملامت نہیں کی۔ مجھ کو غرور تھا اپنے اُنسِ انسانیت کا، اپنے دردِ دوست کا۔ مگر وہ خاک ہوا اور اپنی صورت قبیح نظر آئی۔ بیگانوں، ناآشناؤں سے بھی کب کوئی ایسا سلوک روا رکھے گا۔ جو میں نے آپ سے ایسی حالتِ بے چارگی میں روا رکھا۔ کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں۔ عذر و دلائل بے شمار اپنے اس فعل کو صحیح ثابت کرنے میں تراشتا تھا۔ حضرت بلبے! حق بات یہ ہے کہ بیشتر عوام الناس مکروہاتِ دنیوی میں پھنس کر مطلب پرستی، خود غرضی، نامرادی کی زندگی گزار دیتے ہیں اور اس سے بڑا رونا اور کوئی نہیں۔

پانچ ماہ تمہاری صورت نہ دیکھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا، صبح کاذب کا وقت، سردی کی شدت، میں اپنے کمرے میں لحاف میں بیٹھا ہیٹر کی آگ تاپتا تھا۔ میرا معمول ہے کہ آخرِ شب آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر کچھ دیر کسی سخن ورِ افرنگ کی داستان پڑھتا ہوں، پھر اُٹھ کر چولہے پر چائے بناتا اور ایک پیالہ پیتا ہوں۔ سگریٹ سلگاتا اور سہج سہج اُس کے کش لیتا ہوں۔ ان معمولات میں سے نہ گزروں تو اجابت نہیں ہو پاتی۔ باہر پھاٹک پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ یاالٰہی اتنے منہ اندھیرے کون مہمان کا نزول ہے۔ اپنے معمول میں رخنہ پڑنے پر جھلایا۔ دو بار، تین بار، متواتر کھٹ کھٹ ہوئی۔ کوئی ٹین کے پھاٹک کو لاٹھی سے کوٹتا تھا اور اس آواز کے ساتھ عجیب نوحہ لٹے جوانی شامل تھے۔ جب یہ سلسلہ جاری رہا تو فقیر، چار و ناچار، اپنے گوشۂ راحت سے اُٹھ کر باہر سردی میں گیا۔ پھاٹک کی کھڑکی میں نے کھولی۔ باہر آپ کھڑے تھے اپنے بیگ سمیت بادِ برفانی میں ٹھٹھرتے۔ میں نے پوچھا "بابا غلام محمد کدھر سے آئے ہو؟" اُمید تھی کہ قوتِ ناطقہ یاور

، ہو چکی ہو گی مگر وہی پہلے سی حالت تھی۔ وہی عوں غاں اور اظہارِ مدعا کے لئے بازوؤں کی جنبش بے تابانہ۔ تم اندر آئے۔ میں نے ہیٹر کے پاس بٹھایا۔ چائے کا پیالہ بنا کر دیا۔ میں نے پوچھا "بابا غلام محمد دوسرا پیالہ بناؤں؟" تم نے سر اور ہاتھ کے اشارے سے منع کیا "بس کافی ہے" میرے سگرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سگرٹ سلگا کر دیا اور تم خاموشی سے پیتے رہے۔ ہاتھ تمہارے کپکپاتے تھے۔ پیرانہ سری اور ضعف نے آخر بلے کو بھی آگھیرا تھا اور آرام کرسی میں دبکے ہوئے اکڑوں آپ انتہائی نحیف اور بوڑھے مجھ کو لگے۔ ترس آپ کی کیفیت پر آتا تھا۔ میں نے بھی گفتگو کی۔ تم کچھ اظہار کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ کھڑے ہو کر بازو لہرا لہرا کر کچھ بتلانے لگے "او بائی، او بائی، او بائی" کے خالی خولی الفاظ منہ سے نکلتے تھے۔ میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ میں نے کہا "بابا! مجھ کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔" تم اور شدت سے "او بائی، او بائی" چلانے لگے۔ اور اپنے بازوؤں اور جسم کی حرکاتِ مضطربانہ سے مجھ کو کوئی بات سمجھانے لگے۔ میں نے سر پیٹ لیا اور خدشہ ہوا کہ حواس تمہارے جواب دے گئے اور حالتِ دیوانگی و جنون کا غلبہ ہوا۔ پھر غور کیا اور جو بات تم کہنا چاہتے تھے وہ میرے فہم نے سمجھائی۔ میں نے پوچھا "بابا غلام محمد بیٹے کے پاس کراچی جاؤ گے؟" تم نے مدعا پلنے پر جوش ہوتے "آ، آ" کہا۔ سر کو اثبات میں ہلایا۔ زادِ راہ اور کرایہ کے لئے تم کو رقم چاہیئے تھی۔ انگلی کے اشارے سے تم نے بتایا "ایک سو روپے دو" میرے پاس اتنی رقم کہاں ہوتی۔ مکان بند کر کے موٹر میں بٹھا تم کو دفتر لے گیا۔ پندرہ روپے اپنے پاس سے دیے۔ بائیس روپے دفتر کے ایک اہلِ کار سے ادھار لے کر دیے۔ یہ رقم ناکافی تھی اور تم کو سو کی حاجت تھی۔ میں نے سینتیس پر ٹالا۔ اس رقم سے تم بمشکل ریل سے کراچی پہنچ سکتے تھے۔ تم نے "او بائی، او بائی" کی چیخوں سے بار بار بتایا کہ تمہاری طلب سو روپے کی ہے اور تھوڑی سی کاوش سے تمہاری حاجت روائی میرے لئے کوئی کارِ دشوار نہ تھا۔ کیوں خضرِ بدبخت، تم نے بوڑھے، جنونی کو رقمِ حقیر دے کر اپنے سے دور کیا کہ اپنے بیٹے کے پاس جائے اور تمہاری جان چھوٹے اور تمہارے معمولات میں فرق نہ آوے۔ کیسی جان! کیسے معمولات! بھاڑ میں جائے تمہاری

جان، تمہارے معمولات۔ تف۔ تف۔ حضرت آپ سر لٹکائے ناتواں قدموں سے وہاں سے چلے گئے۔ کراچی آپ کیونکر پہنچے۔ اطاعت گزار بیٹے اور اس کی زن کے گھر میں کیسے نبھی۔ بیٹے نے خدمت کا حق ادا کیا یا یہ سمجھا کہ بلائے بے درماں نے سودائی بوڑھے باپ کی شکل میں نزول کیا۔ احوال ان امور کا مجھے معلوم نہیں۔ جو کچھ ہوا یا نہ ہوا، بہرصورت، بارہ پندرہ دن وہاں رہ کر آپ نے واپس کوچ فرمایا۔ گمان کرتا ہوں کہ وہاں دل حضرت کا نہ لگا اور بیٹے کی بی بی نے مروت نہ برتی۔ کون خفقانی، پاگل، گنگ زبان سے سر کھپائے اور کب تک۔ پڑنے کو وہاں پڑے رہتے۔ مگر خودداری طبع نے رکنے نہ دیا۔ دسمبر کی پچیس چھبیس تاریخ، کڑاکے کی سردی، ہر طرف کہر اجما ہوا کہ پھر تم نے پھاٹک فقیر کا کوٹ کر اس کے امن و چین میں کھنڈت ڈالی۔ میں تمہارے لوٹنے پر خوش نہ ہوا۔ میں نے سوچا بابا پاگل پھر گردن پر سوار ہوا۔ آپ حجرے میں آکر ہیٹر کے پاس بیٹھے میں نے چائے کا پیالہ دیا، گھونٹ گھونٹ پیا، میں نے پوچھا "بابا غلام محمد کراچی سے جلد لوٹ آئے، بیٹے کے پاس کچھ دیر اور رہتے۔" حسرت سے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا "کیا کروں بس آگیا" عرض کیا "بیٹے نے ڈاکٹر کو دکھلایا۔ علاج معالجہ کرایا؟" آپ نے ہاں کہا۔ پوچھا "آرام نہیں آیا؟" تم نے کہا "نہ" میری بی بی بچوں کو لے کر میکے گئی ہوئی تھی۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ تم میرے پاس رہ سکتے تھے اور فرزندِ روحانی ہونے کے موجب تمہاری تواضع کرنا مجھ پر فرض تھا۔ تم مجھ پر دعویٰ رکھتے تھے۔ ایک مونس ہمدرد کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے دیکھ کر آسرا پا لیتے اور خوش ہو لیتے کہ کوئی میرا بھی ہے۔ حضرت ہم جو آدم کی اولاد ہیں، جوان ہیں یا بوڑھے ہیں، بڑے ذلیل اور مردود ہیں۔ دوست کشی اور مونس سوزی ہماری سرشت ہے۔ متضاد اوصاف ہمارے سینوں میں دست بگریبان رہتے ہیں۔ یعنی خیر و شر، بخل و سخاوت، کرم و ستم کے ہم مرکب ہیں۔

الغرض میں نے عذرِ دفتر جانے کا تراشا اور آپ کو لاری کے اڈے کی راہ پر ڈالا۔ زادِ راہ بھی نہ دیا۔ اپنے بیٹے کے پاس سے آئے تھے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے کر ریل پر سوار کرایا ہوگا۔ دل تنگ تھا، نہ ہاتھ تنگ۔

تم ملتان سے لیہ اپنے قرابت داروں کے پاس گئے۔ گونگے پاگل سے وہ بھی تنگ آئے اور تم کو بھی وحشتِ تنہائی نے گھیرا ہوگا۔ چونچال، خوش طبع آدمی، پہروں باتیں اِدھر اُدھر کی کرنے والا، اس کی قوتِ گویائی ساتھ چھوڑ جائے تو اس کے لئے زندگی اجیرن اور ویران نہ ہو تو کیونکر۔ چار دن کے بعد اخوانِ لیہ سے، بیگ میں اپنی متاع لے کر، بھاگے اور پھر منہ اندھیرے اس فقیر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اب کے میں اصل بر ہم ہوگیا۔ یہ نہیں کہ چائے نہیں پلائی۔ سگریٹ سلگا کر نہیں دیا۔ آپ ملول، مایوس کھاٹ پر زانوؤں پر سر رکھ کر بیٹھے تھے۔ میں نے پہلے فہمائش کی "بابا غلام محمد! تم وہاں لیہ میں کیوں نہ رہ پڑے۔ اب تمہاری حالت ایسی نہیں کہ یوں خراب ہوتے پھرو۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔" تم نے سر اٹھا کر میری طرف بے چارگی اور شکایت کی نظر ڈالی اور غوں غاں کی "اوبائی، اوبائی"، بکنے لگے۔ میں بولا "میری بی بی آج آتی ہے وہ تم کو یہاں رہنے نہیں دے گی۔ اب آرام سے جم کر اپنے بیٹے کے پاس بیٹھو اور اللہ اللہ کرو"۔ یہ کہہ کر میں حاجتی کی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ لوٹا تو بابا غلام محمد غائب تھا۔ برآمدے میں دیکھا۔ وہاں تمہاری لاٹھی اور بیگ نہیں تھا۔ ہائے تم کچھ کہے سنے، سلام دعا کئے بغیر، شکوہ شکایت و عتاب دل میں لئے، چلتے بنے۔ تم خفا گئے تو شیشۂ وفا و محبت، جس کی برسوں کے میل ملاپ سے تراش خراش ہوئی تھی، پل میں ٹوٹ گیا۔ میں نے جانا کہ تم اب اس دروازے پر لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ ہائے! حضرت، جب تک جیتا ہوں سدا کو رویا کروں گا۔ مجھ سے زیادہ سفلہ، شقی القلب، مقہور، روئے زمین پر اور کوئی نہ ہوگا۔ ایک انشا پرداز لاہور، اسمِ مبارک منظور الٰہی، نے ایک رسالے "نیرنگِ خیال" میں ایک مضمونِ دل فگار چھاپا ہے اور اس میں میرے حسبِ حال ایک فقرہ درج کیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے:

"میں اپنے بھائی کا غمگسار ہوں، لیکن اس کا گلا بھی گھونٹ دیتا ہوں۔"

اور میر صاحب فرماتے ہیں:

بت خانہ کھود ڈالیے، مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیئے، یہ خدا کا مقام ہے

اپنی آدمیت کا ماتم دار ہوں۔ اپنی تیرہ بختی کی کس سے فریاد کروں۔ ہائے جی میں واقعی لٹ گیا یہ سگِ دنیا، یہ مردود، یہ محروم، یہ مغموم، اب اپنی زیست سے متنفر، اپنے وجود سے متنفر، کاروبارِ دنیا سے متنفر ہے۔ کیوں جیوں؟ اب رہ کیا گیا ہے۔ حضرت، یقین ہے آپ میرے غم خانے سے نکلے تو سڑک پر چلتے چلتے کہیں دور بہت دور نکل گئے ہوں گے، جہاں سے کبھی کوئی آیا نہیں۔ پایانِ عمر، قویٰ مضمحل، ناتوانی کا زور، حواس مختل، تھک ہار کر راہ میں بیٹھ گئے ہوں گے اور چپکے سے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہوں گے۔ دوست کی بے مہری اور شقاوت کے سلوک کے بعد اب کچھ نہ تھا جس کے بل پر جیے جاتے۔ آپ سے میری اُس آخری ملاقات کو اب چھ ماہ کا عرصہ ہو چلا ہے۔ جس دن سے آپ گئے ہیں، میں اکثر اپنے حجرے میں پلنگ پر لیٹا پھاٹک پر لاٹھی کی کھٹ کھٹ اور غوں غاں کی صدا کا منتظر رہتا ہوں۔ کبھی عالمِ خیال میں تصور باندھتا ہوں کہ حضرت میرے مکان پر تشریف لائے ہیں۔ تندرست ہیں اور قوتِ ناطقہ بحال ہو گئی ہے۔ میں نے دستک پر دروازہ کھولا ہے۔ آنکھیں کفِ پائے مبارک سے ملیں ہیں اور حضرت نے مجھ کو فرطِ محبت و مسرت سے گلے سے لگایا ہے اندر آ کر میرے ویران حجرے کو اپنے پرتوِ جمال سے روشن کیا ہے۔ وہی مہر انگیز اور محبت آمیز باتیں چل نکلی ہیں۔ دل شاد ہوا ہے۔ گھڑی دو گھڑی کے بعد آپ نے جانے کا قصد کیا ہے۔ اور میں نے پاؤں پکڑے ہیں "اب آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ میرے پاس رہیں۔"

مگر باور آنا ہے کہ آپ دنیائے فانی سے منہ موڑ کر کوچ کر گئے۔ کون بتائے گا، کس جگہ کی خاکِ پاک میں پیوند ہوئے اور کس نے کندھا دیا۔ حضرت، کندھا دینا تو میرا حق تھا۔ جب اگلے جہان میں ملیں گے تو آپ کو منانے کی کوشش کروں گا۔ مَن جاؤ گے؟

دوست کا قاتل

خضر مجور

عطاء الحق قاسمی کے نام

مولوی ابنِ مولوی! الامان الامان! ایک طریقہ بات کہنے کا جو تمہارے ہاتھ آگیا ہے۔ تمہارے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔ اس طرزِ گفتار پر اتراتے پھرتے ہو اور میں نہیں کہتا کہ تمہارا اترانا بجا نہیں مگر میاں صاحب زادے! ذرا غور کرو۔ یہ اسلوب اور ڈھنگ عبارت لکھنے کا انعام ایزدی ہے۔ تم گھر سے لے کر تھوڑا آئے تھے۔

برخوردار! میں تمہارا مداح ہوں۔ تمہارا بھی اور تمہاری خوش گوئی اور رنگین ادائی کا بھی۔ رشک اس لئے نہیں کرتا کہ اب اس پایان عمر میں کہ عالم بے خودی و مدہوشی کے مزے لوٹتا ہوں اس کا خیال نہیں آتا۔ سوچتا ہوں کہ میدانِ ادب میں جو تیر مجھے مارنا تھے وہ سب مار چکا۔ اب ترکش تیروں سے خالی ہے اور طبیعت کا وہ ولولہ اور جوش نہ رہا۔ جب کبھی بھولے سے دوات قلم لے کر کچھ لکھنے کو بیٹھتا ہوں تو مضامین اس پہلے کی سی تیزی اور روانی سے آپ ہی آپ نہیں اترتے چلے آتے اور اس پیرانہ سری کے عارضوں سے محنت پژدہی و جگر کاوی و کوہ کنی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ ذہن کہتا ہے میاں خضر اس عمر میں کیوں جھک مارتے ہو، کیوں اس کاوشِ بے مقصد سے جی ہلکان کرتے ہو۔ اس لکھنے لکھانے پر خاک ڈالو اور اللہ اللہ کرو کچھ عاقبت کا سامان بہم پہنچاؤ تاکہ آگے چل کر پچھتانا نہ پڑے۔

بھائی ان دنوں ایک صاحب خواجہ محمد اسلام صاحب کا رسالہ "حسن پرستوں کے انجام کا منظر" نظر سے گزرا۔ صاحب تصنیف نے مرنے کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ کھینچا ہے اور حسن پرستوں کی ملائک کے ہاتھوں درگت اور پٹائی کا جو آنکھوں دیکھا حال بالتفصیل رقم کیا ہے اسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل ایسا دہلا ہے کہ حسین صورت کو دیکھتے ہی زہرہ آب ہوتا ہے اور دانت بجنے لگتے ہیں تم یہ کتاب پڑھو اور عبرت پکڑو۔ میرا دعویٰ ہے مولوی عطا طول عمرہ کی سب ترکی تمام ہو جائے گی۔ اس سلطنت کے لاکھوں لوگوں نے اس کتابِ دہشت ناک کا بغور مطالعہ کیا ہے اور کانوں کو ہاتھ لگایا ہے۔ سُنتے ہیں اسے جامعہ کے نصاب میں رکھنے کی سفارش چند اہلِ ایمان نے کی ہے اور حق بات یہ

ہے کہ قوم کے بگڑوں اور بداندیش لوگوں کو سدھارنے اور راہِ راست پر ڈالنے کے لیے اس کتاب سے بہتر انتخاب اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ میرا حال تو تم پر معلوم ہے۔ عالمِ شباب میں بھی اس کوچے کا رُخ نہ کیا ساری عمر میں کسی ستم پیشہ سے واسطہ نہ پڑا، نہ کسی محبوبہ کی بے رخی اور بے مہری کے زخم کھائے اور نہ کبھی کسی غارت گرِ ایمان سے نامہ و پیام کا رشتہ باندھا۔ اس لئے عاقبت میری بخیر ہو گی۔ ہاں ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ بار یارانِ باصفا کی مجلس میں بیٹھ کر چند ایک جرعے انگریزی شراب کے پی لیتا تھا۔ ہم لوگ ہر شام ایک رند دوست کی بیٹھک میں فراہم ہوتے تھے۔ اختلاط و انبساط کی باتیں ہوتی تھیں۔ موسیقی، فلسفہ، نجوم اور ادب کے تذکرے ہوتے تھے اور طبیعت کی گرمی سے سب احباب ان فنون میں آسمان سے تارے توڑتے تھے۔ ان لمحوں میں زندگی کی تب و تاز کا احساس ہوتا تھا لیکن معصوموں کی اس محفل کو کسی کی نظر کھا گئی۔ بارہ ربیع الاول کو حاکمِ اکبر نے اس قلمرو میں نفاذِ اسلام کا اعلان کیا۔ اس سے اگلے روز میں اپنے دوست کی بیٹھک پر گیا۔ احباب جمع تھے مگر افلاک کی سیر کا سامان نہیں تھا اور نہ باتوں اور مباحثوں میں وہ گرمی تھی۔ صاحب خانہ اور دوسروں کی باتیں مجھ کو اناپ شناپ، پھیکی اور بے مزہ سی لگیں وہ اپنے آپ میں نہ تھے۔ میں چند ساعت بیٹھ کر چلا آیا اور پھر نہیں گیا۔ تب سے شراب پینے سے توبہ کی ہے۔ کون اس پاداش میں اسّی کوڑے کھائے؟ کون اگلے جہان میں جہنم کی آگ میں تپنے کا خدشہ مول لے؟ آخر کو اہلِ ایمان کے نزدیک مے نوشی گناہ کبیرہ ہے۔ گو چند صوفیاء اور صاحبانِ معرفت کے نزدیک اصل گناہِ کبیرہ جن پر پکڑ ہو گی تین ہیں۔ اوّل کسی کا دل دکھانا۔ دوم عیاری اور کینہ خصلتی۔ سوم جہالت۔ ان تینوں گناہوں سے متصف انسانوں کا اس ملک میں ہجوم ہے۔ انہوں نے سب کا جینا دوبھر کر رکھا ہے اور ان کی کارفرمائیوں سے ملک تباہی اور بدحالی سے دوچار ہے۔ ان کے منہ کو کوئی نہیں آتا اور وہ اس دور میں خدائی فوجدار بنے پھرتے ہیں۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنو! لوہاری دروازہ کے اندر میرے ایک رشتہ کے بھائی کا مطبع ہے دو ہفتے ہوئے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں نئے نصاب کی درسی کتابوں کا ذکر چلا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ اردو کی دوسری یا تیسری کتاب میں محمد اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم باری تعالیٰ کی حمد

میں تھی۔ اس میں پہلا شعر تھا

"رب کا شکر بجا لا بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی"

یہ شعر نیا نصاب بنانے والوں کو کھٹکا۔ انہوں نے اسے قابل اعتراض اور ملحدانہ گردانا اس واسطے کہ گائے اہلِ ہنود کو متبرک ہے اور وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ میرٹھ کے مولوی صاحب کا یہ سہو ان کی طبعِ متین پر گراں گزرا اور انہوں نے مولوی بے چارے کی ساری کی ساری نظم نصاب سے قلم زد کر دینے کا فیصلہ کیا حالانکہ قصور ایک شعر کا تھا۔ اسی عزیز نے بتایا کہ پہلے بچوں کے لئے لکھے گئے اردو قاعدے سارے کے سارے خلافِ دین ہونے کی بنا پر موقوف ٹھہرے۔ مولوی عطا صاحب تم کو یاد ہوگا ہمارے زمانے میں الف آم۔ ب بلی۔ پ پنکھا۔ ز زرافہ وغیرہ سے قاعدے کی ابتدا ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ان چیزوں جانوروں کی تصویریں بھی ہوتی تھیں جن سے بچے کا تخیل متحرک ہوتا تھا۔ نئے نصاب بنانے والوں نے سوچا کہ یہ سب لغو، پوچ اور بے معنی ہے۔ ابجد سکھلاتے ہوئے بھی لازم ہے کہ ایک بچے کے ننھے سے ذہن میں مذہب اور ملت اور عقائد و شعائر کی باتیں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ سنا ہے اب نئے نصاب کے قاعدے میں الف سے ایمان باللہ ہوگا۔ ب سے بلی یا بکری نہیں ہوگا بلکہ بنی اسرائیل ہوگا۔ پ سے پاکیزگی اور ت سے تبلیغ۔ نہیں گے اس طرح گویا پہلی جماعت سے ہی بچے راسخ العقیدہ مسلمان اور پکے با اخلاق بن کر آگے چلیں گے میاں لڑکے! بچوں کی اصلاح کرنے، ان کو راہ ہدایت پر ڈالنے کے لئے ان نصاب بنانے والوں کا ذوق شوق اپنی جگہ پر مگر بچوں کے قاعدوں اور درسوں میں کچھ لطفِ طبع اور شادمانیٔ دل کا سامان بھی تو لازم ہے جسے پڑھ کر ان کا ننھا دل بہلے۔ متخیلہ کو جلا ملے اور قدرت کی چھوٹی بڑی مخلوقات سے محبت پیدا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں سے جو بچے کی نفسیات نہیں جانتے صحیح کام کی توقع نہیں۔ بھائی یہ لوگ راہِ دین کے غول ہیں۔ اسلام کی روح سے انہیں کیا آشنائی۔ کائنات کے حسن سے کیا سروکار! ہائے ہائے! یہی اصحابِ بے علم، تنگ مایہ، عقل سلیم و طبع لطیف سے بے بہرہ۔ اس قلمرو کے ذرائع ابلاغ عامہ پر مسلط ہیں۔

نتیجہ یہ کہ لوگ اب اہل ہنود کا امرتسر کا ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ بھارت اور انگلستان کے ریڈیو کے پروگرام اور خبریں سنتے ہیں۔ سچ جانو اس شہر میں لاہور کا ٹیلی ویژن کوئی نہیں دیکھتا۔ کوئی دیکھے بھی تو کیا۔ جب پروگراموں میں کیف نہیں، تفریح نہیں۔ تمثیلیں ہیں تو خشک موعظت و پند سے معمور، بچوں کے لئے پروگرام بیشتر لغو اور بے سرور جنہیں بچے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بھائی عوام الناس پہلے ہی سے ایسی جانگدازانہ بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے۔ ان کو دن بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد گھر لوٹنے پر کوئی تفریح چاہیئے جو دل پذیر ہو ان کے آلام اور محرومیوں کو کچھ وقت کے لئے ان کے ذہنوں سے بھلا دے۔ مگر ہمارے ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے ہمہ وقت سوتے جاگتے، ہم بھٹکے ہوؤں کو رشد و ہدایت کی راہ پر ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہمارے اخلاق سدھارنے کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیوں صاحب! کیا ذوق بخشی و نشاط انگیزی ان ارباب ابلاغ کے نزدیک کفر اور خارج از اسلام ہے کیا اس سے انہیں خطرہ ہے کہ ہم راہِ ہدایت سے ہٹ جائیں گے اور عقبیٰ کی پرسش سے غافل ہو جائیں گے۔ مولوی! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا اور امیدوار ہوں کہ آپ میرے دل نشیں کریں گے کہ جب ٹی وی کی ایک تمثیل میں اکٹھی چار پانچ جواں سال بیبیوں کو چہکتے ہنستے دکھانا مردوں کے لئے مخرب اخلاق قرار پایا تو اس میں نامحرم خوش شکل جامہ زیب مردوں کو ہر آنا کیوں گھر کی بیبیوں بیٹیوں کے لئے مخرب اخلاق نہیں ہوگا۔ توبہ توبہ یہ اصحاب جو ہم کو ان خوشیوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں ان کے اذہان تنگی اور پراگندگی سے اٹے ہیں۔ دوپٹے سے بغیر جس جوان عورت کو یہ دیکھتے ہیں ان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ ہندی کی چندی اب اور کیا کروں۔ تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

میں ان دنوں بے حد خوش ہوں۔ بارہ ربیع الاول کو حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی پڑی اور عوام الناس کو مژدہ اسلام کے نفاذ کا سنایا گیا۔ سید الانبیا، ختم المرسلین کا فرمان ہے کہ اپنے پڑوسیوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے کرتے ہو۔ ٹیلی ویژن پر اس قول کی عبارت کو بار بار دکھاتے ہیں اور باور کرتا ہوں کہ جلد ہی اہل اسلام اس قول محمدی پر عمل پیرا ہونے لگیں گے۔ اہل متمول اپنے ساز و سامان ملبوسات، رنگین ٹی وی سیٹ، جاپانی موٹر کاریں، فرج، کیسٹ، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ اپنے مسکین

پڑوسیوں میں بانٹنے میں لگ جائیں گے۔ وہ اپنے چار چار کنال کے حسین و جمیل بنگلوں کے نصف حصوں میں آس پاس کے ان مساکین کو لا آباد کریں گے جن کے پاس رہنے کو گھر نہیں اور ان کو اپنے ساتھ، دسترخوانِ نعمت پر ساتھ بٹھا کر وہی مرغن اور لذیذ خوراک کھلائیں گے کہ جو ان کو خود کو مرغوب ہے۔ مولوی تو کہے گا یہ خضر کیسی کیسی شرارتیں کرتا ہے۔ ہا جی شرارت کیسی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نبی آخرالزماں کے قول کی ہمارے دلوں میں کیا وقعت ہے تو یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ سب خالی خولی باتیں ہیں۔

سنو صاحب! میں ہنسی نہیں کرتا۔ بارہ ربیع الاوّل کے بعد سے میں نے گمان کیا ہے۔ اس ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ چوروں نے چوری سے توبہ کر لی۔ لوگوں نے بہتان طرازی۔ افترا پردازی سے منہ موڑا اور نیک نہاد فرشتہ خصلت بن گئے۔ بیبیاں دوپٹے سے سر ڈھانپ کر اور برقع پہن کر نکلنے لگیں۔ مرد سڑکوں پر آنکھیں نیچی کر کے چلتے ہیں اس لئے کہ کسی مہوش پر نظر پڑ جانے سے خیالِ فاسد دل میں جاگزیں نہ ہو۔ خواجے تاجر کم نہیں تولتے اور ہر چیز کے مقررہ دام لگاتے ہیں۔ میں دو تین ماہ سے صاحبِ فراش، ناتواں اور سست ہوں کہیں آتا جاتا نہیں اس لئے کیونکہ کہوں کہ میرا گمان واقع پر مدار ہوا۔ تم کو جو اپنے سکوٹر پر سب مقامات کی جہاں گردی کرتے ہو گرد و پیش کا حال معلوم ہوتا رہتا ہوگا۔ تم بتاؤ کیا وہی کچھ ہوا جو میرے گمان میں ہے۔

فاضلِ اجل زبدۃ العلماء المتبحرین حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی صدر الصدور قومی اتحاد نے اخباروں میں اعلان کیا ہے کہ بارہ ربیع الاوّل کو نفاذِ شریعت کے بعد مملکت پر اللہ کی رحمتوں کا نزول شروع ہو جائے گا اور جیسا کہ ملک عرب میں ہوا۔ زمین سونا اگلنے لگے گی۔ دولت کی ریل پیل ہو گی اور ہن برسنے لگے گا۔ میرے گمان میں ان کی پیش گوئی صحیح و صائب ثابت ہوئی اور ہن کو برستے ہم سب نے دیکھا جس دن ان کا اعلان آیا اس سے اگلے روز ہی ٹیلی ویژن پر یہ مژدہ جاں فزا سنا کہ سرکار کینیڈا نے حکومت پاکستان کو کئی لاکھ پاؤنڈ کا قرضہ دیا ہے اسلئے کہ کینیڈا سے ریل کے تیس ڈیزل انجن خریدے جا سکیں یہ خبر طرب انگیز سن کر کس کا سر فخر سے اونچا نہ ہوا ہوگا۔ نئے انجن آجانے سے ریل کی حالت سدھرے گی۔ کارپردازانِ ریلوے کی چاندی ہو گی اور کاروبار چمکے گا۔ امید کرنا چاہیئے کہ گاڑیاں اپنے

صحیح وقت پر منزلِ مقصود پر پہنچنے لگیں گی۔ درجہ اوّل اور درجہ دوم کے مسافر ریل کے ڈبوں کی کھڑکیوں میں سے اندر گھسنے کی بجائے دروازوں میں سے داخل ہو سکیں گے۔ ریلوے کے منتظمین ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں میں اپنے لواحقین اور اقربا کو لاہور سے کراچی اور کراچی سے لاہور تک کی مفت سیر نہیں کرائیں گے۔

میرا حال سنو۔ بوڑھا ہونے کو آیا۔ روح سے جان کو جو رشتہ ہے، وہ قائم ہے اور بس۔ آئندہ سال جنوری کی تیئیس تاریخ کو پورے ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ دستورِ ملازمتِ سرکار ہے کہ جب کوئی ملازم ساٹھ سال تک پہنچ جاتا ہے، اسے فارغ خطی دے کر گھر بھیج دیتے ہیں۔ پنشن تین چار سال بعد منظور ہوتا ہے۔ اس کی خاطر مہینوں مہتمم خزانہ اور صاحب انکم ٹیکس افسر بہادر کے دفتروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے وہ پیسے کے بغیر کام نہیں کرتے۔ میرے کئی دوست نیم آشنا جن میں کئی زبان آور اور چالاک ہیں فارغ ہونے کے سالوں بعد پنشن کے باب میں اُلجھے رہے۔ دو تین کو تو میں جانتا ہوں ان کو پنشن نہیں ملا۔ اور وہ فوت ہو گئے۔ میں بھولا آدمی سادہ آدمی اس لئے جانتا ہوں کہ مجھے پنشن نہیں ملے گا۔ پنشن کے روپیہ کے بغیر کیسے کھاؤں پیوں گا اور کیوں کر جیوں گا۔ یہ سوچا ہے کہ ملازمت سے فراغت کے بعد بہاولپور میں اپنی آبائی حویلی میں جو ڈھے رہی ہے۔ منتقل ہو جاؤں گا۔ پنشن مل گیا تو وہاں خوش و ناخوش گزارا ہو جائے گا مگر لاہور کے اخوانِ باصفا سے چھوٹ جانے کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تم کہتے ہو گے یہ خبطی خضر کیا رونا پیٹنا لے بیٹھا!

آپ کا مجھ سے اپنے مجلے "معاصر" کے لئے کہانی کی فرمائش کرنا ذرہ پروری اور درویش نوازی ہے اردو اور انگریزی زبان کے ادبِ عالیہ سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہی میرے جینے کی توجیہہ ٹھہری۔ ایک زمانے میں اپنے دلِ افسردہ و رنجور کے بہلاوے اور وقت گزاری کی خاطر داستان گوئی کا آغاز کیا تھا اسے جاری نہ رکھ سکا اور جو کچھ اس صنف میں جھک ماری اس پر شرمسار ہوں۔ فنِ نظم گوئی میں ایامِ مکتب میں کچھ طبع آزمائی کی اور دیوانِ خضر مرتب ہو گیا۔ وہ دیوان کھو یا گیا۔ اس کی حسرت ہے۔ مجھی محمد کاظم سباق اور صوفی صلاح الدین محمود جیسے دردمند نواز دوست اور میری تحریروں کے جامع اُس وقت میسر نہ تھے جو اسے سنبھال لیتے۔ ہائے کیا چیز تھی!

میرے دستخط خاص سے لکھی گئی یہ عبارت اگر تم سے نہ پڑھی گئی تو کاتبِ "فنون" حافظ عبدالحق اسے اپنے قلم سے کاغذ پر نقل کر دیں گے۔ وہ میرے خط کا نبض شناس اس شہر میں واحد شخص ہے جو مجھ بدنصیب کی تحریر کے رموز سے واقف ہے ورنہ سال گزشتہ کی لکھی ہوئی میری اپنی تحریریں مجھ سے نہیں پڑھی جاتیں۔ حافظ صاحب، صاحبِ اعجاز ہیں۔

یہ خط تم کو بسبیل ڈاک بیرنگ پہنچے گا۔ تم اسے خود لینے آؤ گے تو مجھے گھر پر نہ پاؤ گے میں نے گھر کا دروازہ بند اور کہیں آنا جانا موقوف کر رکھا ہے۔ کوئی ملنے آتا ہے تو اسے کہلوا دیتا ہوں کہ میں گھر پر نہیں۔ لڑکے! بات یہ ہے کہ حواس بجا نہیں حافظہ رہا نہیں بمشکل سے آشنا لوگوں اور قرض خواہوں کو پہچانتا ہوں۔ گھر سے باہر تم مجھے اکثر نہیں پاؤ گے کس واسطے کہ جہاں جاتا ہوں لوگ ازراہِ تعظیم و تکریم باباجی۔ چاچا جی کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ اس سے طبیعت بے حد بے مزہ ہو جاتی ہے اپنے دل میں اس ناتوانی اور خرافت کے باوجود یہ سمجھے بیٹھا ہوں کہ میرے ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ اور سنِ شعور آغاز نہیں ہوا۔

اس یاوہ گوئی کو اب ختم کرتا ہوں۔ میرے مربیانِ خوش اعتقاد امجد اسلام امجد اور گلزار وفا چوہدری اور احمد حسن حامد کو سلام مسنون اور دعائے افزونی زورِ قلم پہنچے۔ تم جیو اور اپنی تحریرِ دلپذیر سے مجھ شکستہ دل کو اس وقت تک شاد مان رکھو جب تک کہ بلاوا نہیں آتا۔

محمد خالد خاں خضر

ڈاکٹر ناموس کے نام

استادِ عالی شان، فاضلِ اجل، فریدونِ زمان حضرت ڈاکٹر شجاع منعمی ناموس صاحب کو شاگردِ دیرینہ فقیر خضر کا سلام!

پرسوں دوشنبہ ۱۶ جولائی ۱۹۷۵ء کی تھی۔ پہر دن چڑھے ایک رفیق کے ہمراہ اس کی مشینی شکرم میں کہ اس کو موٹر کار کہتے ہیں پکی ٹھٹھی محلہ سمن آباد جاتا تھا حضرت کے دولت کدے کے سامنے سے گزر ہوا۔ آپ کا وہاں سکونت پذیر ہونا اور مرکزِ علوم کل سے ضیائے پرنوید چار سو پھیلانا، مجھ پر معلوم

نہ تھا۔ کتبے کہو، لوح کہو، بہت سارے تمہارے مسکن پر آویزاں نظر آئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ نام آپ کا تھا۔ عقل البتہ ورطۂ حیرت میں ہوئی کہ ایک آدمی اکیلے دم اتنے سارے شعبے اور محکمے کیونکر چلاتا ہوگا۔ روحانیات و عملیات کے ساتھ ساتھ حکمت و کارخانہ درآمد و برآمد کیسے پورا ہوتا ہوگا۔ ایک تختہ بزبان انگریزی کاسموس سنٹر یعنی مرکزِ افلاکیات کا تھا۔ نیچے اس کی تعریف و وضاحت تھی۔ تحقیقاتِ درسی میں اولے ترین کُل عالمی محکمہ۔ ایک تختہ کل عالمی اقبال اکادمی کا تھا اور ایک قصرِ روحانیات، عالمی ادارہ برائے تحقیق و ترقی، علوم روحانی، پامسٹری، نجوم، عملیاتِ ہپناٹزم، آدھ درجن تختے۔ کوئی عطاری کا کوئی تاجرِ درآمد و برآمد کا غرض الّم غلّم، مسکن کے سب کمروں پر آویزاں تھے!

اشتیاق دید نے بے قابو کیا۔ ذکاء الملک کے درِ دولت پر دستک دینے یا گھنٹی بجانے کا قصد کیا پھر میں نے سوچا کہ حضرت کے مشاغل عالیہ میں مخل ہونا درست نہیں کیا پتہ، قصرِ روحانیات میں بیٹھے عمل ہمزاد کا کرتے ہو۔ مراقبے میں گئے ہو یا مرکزِ افلاکیات کی چھت پر دوربین سے ہفت افلاک کی سیر میں ہو۔ ہو سکتا ہے کُل عالمی اقبال اکادمی میں اپنی اور اقبال لاہوری کی رنگین عکسی تصویر تیس پینتیس برس قبل کی حضرت کے دستِ مبارک سے کھینچی ہوئی، سامنے دھرے بیٹھے ہو اور دونوں کی صورتوں، وضع قطع کا موازنہ کرتے ہو۔ نہ فقیر حضر! اس عالمی مقام بزرگ کے اوقات کا ہرج نہ کر! پھر ملنا۔ اب لوٹ جا۔ میں دید کی تڑپ دل میں لئے ہوئے آیا۔

اِن دِنوں آپ کی تصنیف کئے رسالہ "گلشنِ مشرق" کی عبارت کو پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں۔ آغاز میں مذکورہ تصویر تمہاری اور علامہ اقبالؒ کی درج ہے۔ ان سے پیامِ مشرق پر بحث کرتے ہو وہ کھڑے کالر پرٹائی باندھے آرام کرسی پر بیٹھے ہیں تم ایک سُرخ مُجلّد کتاب کو کھولے جھکے ہوئے کسی شعر کے غالباً معنی پوچھتے ہو۔ وہ گھور کر حیرت سے تمہارے مُنہ کو تکتے ہیں کہ یہ شخص زبان فارسی سے اس درجہ آشنا ہے۔ دونوں اسطوانِ سخن کے نام مع القاب و خطابات و سندات تصویر کے تحت بزبانِ انگریزی چھاپے ہیں اور ماشاءاللہ چشم بددور، تمہارے خطابات اور اسناد علامہ اقبال کے مقابلے میں بے حد مستزاد ہیں یہ آٹھ سطور میں آئے ہیں اور اقبال کے ہاں قصہ تین سطور میں تمام ہوا ہے۔

گلشن مشرق

جستجو کا جام

جلوۂ گلفام کی آرزو میں محوِ گردشِ ایام

جب صبح و شام کے گلزارِ رنگ و بو کا اہتمام

سبو میں آتشِ سیال

تمثالِ امواجِ جمال میں بے خودی کا روئے اندمال

وغیرہ وغیرہ

واہ حضرت کیا گلفشانی و جوہر نگاری ہے۔ حق یہ ہے کہ الفاظ کا اعجاز اس کو کہتے ہیں۔ خواہ مطلب کچھ نہ ہو اور عوام الناس اس ڈھکوسلے میں راہ نہ پائیں۔ اردو زبان کو متقدمین کے بعد یہ پیرایہ اظہار بخشنا کچھ آپ کے سے ہی دل گردے والے کا کام تھا۔ ایک حکایت ایک عرب بدو اور اس کے اونٹ کی زبان زد خاص و عام ہے۔ سب مدرسے کے لڑکے اس سے آشنا ہیں اور وہ یوں ہے کہ ایک بدو صحرا میں اپنے خیمے کے اندر سوتا تھا۔ اس کا اونٹ باہر خیمے کی میخ سے بندھا تھا۔ اونٹ کو سردی لگی اور اس نے اپنے مالک سے کہا "آقا سردی بہت ہے کہو تو گردن اندر کر لوں"۔ بدو بولا "بھائی کر لو"۔ چنانچہ اونٹ نے گردن اندر کر لی۔ پھر اس ڈھنگ سے رفتہ رفتہ اپنی اگلی ٹانگیں خیمے کے اندر گھسیڑیں بعد ازاں سارے کا سارا اندر گھس آیا اور بے چارہ بدو اس کو جگہ دینے کے لئے سرکتا سرکتا خیمے سے باہر تھا۔ حضرت کے قلم سے یہ حکایت کس لطف سے ادا ہوئی ہے "مذموم عادات" کے عنوان سے مضمون کو یوں باندھا ہے:۔

"ایک تھا صحرا نورد اعرابی۔ ہر ذرے کے دل میں ہرجائی کی بادہ پیمائی سے بازیابی اور گرد باد میں اس کی نگاہِ جہاں گرد سے شادابی۔ اس کا تھا اک رفیق طریق اور یکنار ریگزار کا غمگسارِ شفیق۔ جملِ فرد، پیکرِ بے تابی، پھر چلے دونوں روبصحرا جہاں نہ مسافر نہ بسیرا اور نہ رہبر کے گرد فریں لٹیرا۔ رات آئی۔ تاریکی چھائی، ہوا لہرائی۔ اتفاق

نائیٹ سرکار برطانیہ کے وہ بے شک ہوئے لیکن حضرت بھی ذکاء الملک فریدونِ زمان، الحاج جینے۔ ماشاء اللہ! شرق و غرب کا کون سا جامعہ ہے جس نے آپ کو مختلف علوم میں سند سے نہیں نوازا۔ اُردو، فارسی، عربی، اسلامیات میں ایم اے طبیعیات و کیمیا میں ایم ایس سی، پی ایچ ڈی، مولوی فاضل عربی۔ ایچ پی پشتو۔ ایم او ایل ادیب فاضل، مرتبہ اول تمغہ طلائی، ایم ڈی ہومیو۔ ج۔ ایم ایچ ایس ایس (امریکہ) ایم آر ایس ایل، اے آر پی ایس وعلی ہذا القیاس۔ ج کو بھی آپ نے اسناد میں شمار فرمایا ہے اور یہ امر علت سے خالی نہیں خضر کہتا ہے۔ ج بھی ایک سند ہے۔ جامعۂ ایزدی و بارگاہِ مصطفوی کی اور ہر کسی کو اس کا میسر آنا محال ہے۔ صاحبِ دولت و ثروت ہونا شرط ہے۔ فقیر خضر اور اس جیسوں کے نصیب میں یہ سند کہاں! میں گمان کرتا ہوں کہ جتنی اسنادِ فضیلت آپ نے جا بجا سے فراہم کی ہیں، پاپائے روم کے پاس بھی ان کا عُشرِ عشیر نہیں۔ خدا ان میں اضافہ مزید کی توفیق حضرت کو عطا فرمائے کہ ہنوز کسر باقی ہے۔ میں نے جانا کہ بغیر کشف و معرفت کے ممتحنوں کے اسماء کا کھوج نکالنا اور ان تک رسائی پانا امر محال ہے۔ تم سچ مچ ولی اور عارف ہو۔ مانو نہ مانو میں مانتا ہوں۔

حضرت کی حالیہ شبیہہ جو کتاب میں مندرج ہے اس میں داڑھی رکھی ہے حالانکہ پہلے منڈواتے تھے اور صاحبِ فراش بلا ناغہ ہر صبح اس پر اُسترا پھیرنے آتا تھا۔ حضرت یہ پھندنے دار کلاہ، چکوز جُبۂ علمیت زیب تن کرنے کا کیا موقع تھا۔ اچھے خاصے عجوبۂ روزگار لگتے ہو۔ میں حرف نہیں رکھتا۔ اگلے ورق پر ان مقامات و شہروں کی فہرست ہے جہاں کی تم نے سیاحی کی۔ افغانستان، کابل، شملہ کا پہاڑی علاقہ، دہلی، لدھیانہ، علی گڑھ، موہنجوڈارو، کالا شاہ کاکو، میاں چنوں کا نواح۔ واہ واہ آپ تو جہانیاں جہاں گشت نکلے۔ دور دراز علاقوں کی خاک چھانی ہے اس کے آگے آپ کی تصنیف کے رسائل کی فہرست ہے۔ فوٹو گرافی سے لے کر بو علی سینا تک کل تیئیس تصانیف حضرت کے ذمے ہیں اقبال لاہوری نے نثر و نظم کے صرف چھ رسالے لکھے "درپاسِ وکتورِ ناموس" ایک قصیدہ، ایک شخص کسی ابو ظفر ڈھکن داس نے حضرت کی تہنیت میں نذر کیا ہے۔ کتاب کا سرِ آغاز آپ کی یاد دہانی کی خاطر درجِ ذیل کرتا ہوں۔

کی بات نہ فضا میں ابر کے نشانات نہ ہوا میں رطوبت کی علامات بگر آ گئی برسات۔
اونٹ کی فراست نے خوشامد کو فصاحت کا لباس پہنایا۔ بناوٹ کی لیاقت نے
قصائد کو اجازت کا قرطاس بنایا۔ شہنشاہ کی حرم سرا، علماء اور اولیاء تجھ پر فدا،
ایران اور افغان تجھ پر قربان۔ ذرا سر خیمے کے اندر کر لوں وغیرہ وغیرہ"

نتیجہ اس حکایت سے یہ نکالا ہے:

"کمزور ہمت اور کافر فطرت کے ساتھ دنیا یہی سلوک کرتی ہے۔"

حضرت کی قصہ کہانی کی ذوق بخشی اور نشاط انگیزی کا دل سے قائل ہوں۔ میں نے یہ قصہ
آپ کا لکھا اپنے لڑکے کو پڑھ کر سنایا وہ بے بادہ مست اور محوِ خواب ہوا۔

ساری کتاب ان نظر افروز صنعتوں سے پُر ہے اور تمہاری تلقین آغاز میں دل کو لگی ہے۔

"اس کتاب کو پڑھو۔ پھر پڑھو۔ کئی دفعہ پڑھو۔ حتیٰ کہ اس کے پیچیدہ مسائل آپ کی
ضمیر میں مستقل جگہ بنالیں۔"

خوب حضرت کی یہ جودتِ ذہنی، یہ دانشوری اصلاً آپ کی اساتذہ کے طفیل ہے۔ فقیر عرض
گزار ہے کہ ارادتاً یا سہواً اپنے مفید رسالے میں اسناد کے حصول کا عمل گول کر گئے ہو۔ یہ اس کے
پڑھنے والوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بُرا نہ مانیے گا۔

میرا ایک عم زاد کہ عربی زبان پر عبور رکھتا ہے چند دن ہوئے بے اختیار شوق دیدار میں حضرت
سے مدرسہ دار العلوم میں ملا۔ وہ بھی ایک زمانہ میں تمہارا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ تمہارے
ہاتھ میں عربی کی پہلی کتاب تھی اور تم اس مدرسہ میں نو آموز کی طرح سبق پڑھنے آتے ہو۔ یقین مجھ
کو نہ آیا۔ اور کیسے آتا۔ عربی زبان کے ایم اے تم۔ علامہ اجل تم اور زبان کی ابجد سے نابلد! یہ نہیں
ہو سکتا۔ اس امر کی تصدیق اس معلم سے ہوئی۔ جس سے قاعدے کا درس لینے آتے ہو۔ قیاس کرتا ہوں
کہ جو عربی تیس برس پہلے سیکھی تھی۔ صاف ہوئی اور ذہن سے مٹی۔ اب نئے سرے سے اسے سیکھنے کا
قصد کیا ہے۔ اگر معاملہ اس ڈھنگ پر ہے تو اسناد کی موجودگی میں عربی سیکھنے کی ضرورت کس لئے پیش

آئی ہ تیس سال کا واقعہ ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ عربی کے استاد مولانا شاکر محمد رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے ذکر کیا کہ عربی میں تمہارا تھیسس انہوں نے لکھا تھا۔ اس پر فاضلِ اجل (ڈاکٹر) کی سند نائب ناظم جامعہ پنجاب نے تم کو پیش کی۔ مولانا شاکر محمد جھوٹ کیوں بولنے لگے۔

تمنا ہے جلد حضرت کے دیدار سے فیضیاب ہونے کی، ہاتھ دکھانے کو پیش کروں گا۔ اگرچہ جو کچھ میری قسمت میں لکھا گیا تھا وہ پیش آچکا ہے اور اب منزل کے قریب پہنچا چاہتا ہوں، ایک فہرست چار پانچ اوراق کی تصنیف کرتا ہوں۔ اس میں شرق و غرب کی سب جامعوں، درسگاہوں کی سندات درج ہوں گی۔ وہ ساتھ لیتا آؤں گا۔ آپ اپنے مطلب کی اسناد ان میں سے پسند کر لیجئے گا۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔

خضر

اشفاق احمد

سفر مینا
ایک محبت سو افسانے
توتا کہانی
ایک محبت سو ڈرامے

بانو قدسیہ

راجہ گدھ
توجہ کی طالب
ناقابلِ ذکر
آدھی رات
آدھی بات

مستنصر حسین تارڑ

خانہ بدوش
پیار کا پہلا شہر
پرندے
اندلس میں اجنبی
ہنزہ داستان
نکلے تیری تلاش میں

محمد اختر ممونکا

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر

انتظار حسین

زمین اور فلک اور
بستی
جنم کہانیاں
تذکرہ